مشہور لوگوں کی عظیم مائیں

www.KitaboSunnat.com

مقبول ارشد

بسم اللہ الرحمن الرحیم
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام
محدث لائبریری
کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

Institute of Islamic Studies ... Lbr.
21702

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

DATA ENTERED

21702

MFN
3302

مشہور لوگوں کی
عظیم مائیں

مقبول ارشد

حق پبلی کیشنز
2-A سید پلازہ، چیٹرجی روڈ اُردو بازار، لاہور
فون: 042-7220631

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا اللہ ! تیرا شکر ہے

"رحمتیں، برکتیں، وسعتیں"

ناشر :- عدیل حق، محمد اجمل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مارچ 2002ء
پروڈکشن منیجر : محمد سلیم
مارکیٹنگ : شاہد محمود - ذیشان ذاکر
لیگل ایڈوائزر : عامر وہاب اعوان (ایڈووکیٹ لاہور ہائیکورٹ)
مطبع :
قیمت : 150 روپے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

21702

انتساب

امی جان

کے نام

جن کے وجود سے گھر میں رونق ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

نمبر شمار			صفحہ نمبر
۱-	عرض مصنف ماتیں سب ہی عظیم ہوتی ہیں		۱۱
۲-	پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ		۱۹
۳-	مٹھی بائی	قائداعظم محمد علی جناح	۳۴
۴-	بے جی	علامہ محمد اقبال	۴۵
۵-	اماں بی رقیہ بیگم	مولانا مودودی	۵۵
۶-	میری والدہ	میاں طفیل محمد	۶۵
۷-	ماں کے قدموں تلے جنت ہے	بے نظیر بھٹو	۶۹
۸-	ماں جی	قدرت اللہ شہاب	۷۸
۹-	میری والدہ محترمہ	ڈاکٹر عبدالقدیر خان	۹۱
۱۰-	مادر ہمدرد	حکیم محمد سعید	۹۴
۱۱-	اللہ ھو اللہ ھو	عبدالستار ایدھی	۱۰۰
۱۲-	Lucky Start	عمران خان	۱۱۶
۱۳-	اماں	ممتاز مفتی	۱۲۱
۱۴-	میری امی	میرزا ادیب	۱۳۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱۵۔ اماں سردار بیگم	اشفاق احمد	۱۶۳
۱۶۔ بوٹی کھاساں	ضمیر جعفری	۱۸۹
۱۷۔ میری عظیم ماں	لالہ صحرائی	۲۰۶
۱۸۔ خوشبو خوشبو	بشریٰ رحمٰن	۲۱۴
۱۹۔ چراغ آخر شب	یونس جاوید	۲۳۲
۲۰۔ خوشبو کی ہجرت	شیخ منظور الٰہی	۲۴۳
۲۱۔ ایک فقیر ماں کا بیٹا	اصغر ندیم سید	۲۶۱
۲۲۔ ماں جی	بریگیڈیئر (ر) گلزار احمد	۲۶۷
۲۳۔ میری غریب ماں	سید نظر زیدی	۲۷۳
۲۴۔ اماں جی	حافظ افروغ احسن	۲۸۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرقان عظیم

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اُٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا۔ اور مشقت اٹھا کر ہی اسے جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تین مہینے لگے گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا! "اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں تابع فرمان بندوں میں سے ہوں۔" اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہونگے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔

اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: "اُف تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں۔ (ان میں سے تو کوئی اُٹھ کر نہ آیا) ماں اور باپ اللہ کی دہائی دیکر کہتے ہیں۔ "ارے بدنصیب مان جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔" مگر وہ کہتا ہے۔ "یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔" یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔

(سورۃ الاحقاف: آیات 15 تا 18)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

21702

عرض مصنف

مائیں سب ہی عظیم ہوتی ہیں!

پتہ نہیں یہ سطور لکھتے وقت میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ماں کے حوالے سے کیا لکھوں؟ مائیں تو سب ہی عظیم ہوتی ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے آدمی نے اپنے اپنے انداز میں ماں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ادیبوں نے مضامین لکھے۔ شاعروں نے نظمیں کہیں جبکہ زندگی میں کامیابیاں سمیٹنے والوں نے اپنے اخباری انٹرویوز میں اُن کامیابیوں میں اپنی ماں کو بھی حصہ دار ٹھہرایا لیکن میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا ہے کہ بھلا اپنی ماں کسے اچھی نہیں لگتی؟ اپنی ماں تو ہر نیک انسان کو اللہ کی طرح بے عیب نظر آتی ہے اور پھر ماں کی عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ کافر، دہریے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور کبریائی کا کھلا انکار کرتے ہیں مگر ماں کی عظمت کے تو وہ بھی قائل ہوتے ہیں۔ حالانکہ ماں خالق حقیقی کی صفت تخلیق کا ایک محدود اور ہلکا سا شاہکار ہے۔ کبھی مائیں بیٹوں کی عظمت و کردار کا سبب بنتی ہیں تو کبھی بیٹے ماں کی عظمت کو پھول کلیاں لگاتے ہیں۔

ماں کے سہ حرفی لفظ میں اِس قدر مٹھاس ہے کہ انسان ماں کا لفظ ادا کرتے ہوئے تعظیم، محبت، شفقت، ایثار اور اخلاص کے گہرے تصور میں ڈوب جاتا ہے۔ عورت کے روپ میں ماں دنیا کی سب سے بڑی تخلیق کار ہے۔ بلاشبہ مائیں سب ہی اچھی اور عظیم ہوتی ہیں۔ شاید اسی لئے حضورؐ نے ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت دی۔ جو بدنصیب ماں کو ناراض کر کے اِس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کٹ جاتا ہے۔ وہ دراصل جنت کی خوشیوں سے دور ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے حقیقت جاننے کے باوجود ماں کے رشتے کو جتنی تعظیم دی جانی چاہیے تھی وہ معاشرے نے اُسے نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی مادیت پرستی نے مسلم معاشرے کو بھی متاثر کیا ہے۔ جہاں پہلے ماں کے رشتے کی بہت تعظیم کی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مادیت پرستی اور معیارِ زندگی کی چمک دمک نے ماں اور بچے کے فطری رشتے کو کمزور کر دیا۔ گھروں میں ماؤں کے پیار اور نگہداشت سے محروم بچے پرورش پانے لگے۔ اس کا نتیجہ اَن گنت، اخلاقی برائیوں کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔

ماں کو جو مقام ملنا چاہیے تھے وہ ہم نے اُسے نہیں دیا۔ یہ کتاب معاشرے کو جھنجوڑنے کی ایک کوشش ہے تاکہ ماں کے منصب کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ معاشرے میں قائم کیا جائے۔ یہ اُن ماؤں کی داستان ہے۔ جن کے فیضانِ تربیت سے امتِ مسلمہ کی تقدیر بدل دینے والے مشاہیر اور مستقبل کو تسخیر اور تعمیر کرنے والے اہلِ نظر تیار ہوئے۔ ایسی ماؤں پر بلاشبہ انسانی تہذیب فخر کرسکتی ہے۔

میں جب اپنے بچپن اور پھر لڑکپن سے جوانی تک کے سفر پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے یہ سوچ کر احساسِ ندامت ہونے لگتا ہے کہ میں نے آج تک اُن کے لئے کچھ نہیں کیا۔ چاروں بھائیوں میں سے صرف بڑے بھائی مقصود ارشد نے ہی اُن کی خدمت کی۔ اُنہیں بچپن سے اب تک ہماری طرح تنگ کرنے کی بجائے سکھ، چین اور آرام دیا اور اُس کا پھل اُنہیں اس صورت میں ملا ہوا ہے کہ آج گھر کے آنگن میں اُن کے تین پیارے بچے ایک خدمت شعار بیوی (پیاری بھابی طاہرہ) ماں، باپ اور دو چھوٹی بہنیں اُن کے دل کا سکون اور راحت بن کر چہچہا رہی ہیں۔

ماں نے گزشتہ 35 سالوں میں اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک عظیم ماں ہے۔ جبکہ میں نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کیا کہ میں ایک عظیم ماں کا نالائق بیٹا ہوں۔ آج جب یہ سطور لکھتے وقت میں اپنے بچپن سے جوانی تک کے سفر پر نظر دوڑا رہا ہوں تو یہ احساس میرے دل کو ٹھیس پہنچا رہا ہے کہ میری ماں نے عظمت کی معراج تک پہنچنے کا جو سفر گزشتہ 35 برسوں میں طے کیا وہ کتنا کٹھن تھا۔ ابو جی اور ماں جی نے 35 برس تک زندگی کی گاڑی جس طرح چلائی وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک الگ داستان ہے۔ اگرچہ اب زندگی بڑی سہل ہوگئی ہے۔ لیکن ماضی اب بھی یاد آتا ہے۔

ماں جی اپنے ساتھ جہیز میں جو چیز ساتھ لیکر آئی وہ تھا صبر واستقامت، بے پناہ مصائب و مشکلات سے گزر کر اُس نے اپنے بچوں کی پرورش کی۔ زندگی کے نشیب و فراز میں اُس نے وہ دن بھی دیکھے کہ جب بعض اوقات گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آج پکا لیا تو کل پکانے پھر پکانے کی فکر دامن گیر رہتی۔ پتہ نہیں سارے دکھ ماؤں کے لئے ہی کیوں ہوتے ہیں۔

اِن تمام مشکلات اور تکالیف کے باوجود ماں کی زبان سے کسی دکھ کی آواز نکلی، نہ شکایت .... دکھ کو چکھ کر اس کی جان لیوا کڑواہٹ سے چہرے پر بگاڑ نہ آنے دینا کمال صبر ہے جو یقیناً صرف کسی ماں کے حصے میں ہی آسکتا ہے۔ انتہائی غربت میں آٹھ بہن بھائیوں کو پالتے ہوئے وہ جن مصائب و مشکلات اور تکالیف سے گزری۔ اس میں شاید کتنی ہی بار اُس کی آنکھوں سے آنسو نکلے ہوں۔ لیکن آنسوؤں کی مالا کبھی تلخی بن کر زبان پر نہیں آئی۔ عزیز رشتہ دار بتاتے ہیں کہ 1971ء کی جنگ جب شروع ہوئی تو ابو جی کی ملازمت ملتان میں تھی۔ ماں جی روزانہ تہجد کے وقت اٹھتیں۔ نماز کے بعد ابو جی کو ناشتہ کرواتیں اور پھر شدید سردی میں منہ اندھیرے ٹوٹی ہوئی سائیکل پر بڑے بھائی اُنہیں چھوڑنے سٹیشن پر جاتے۔ چونکہ جنگ کے ایام تھے۔ اس لئے شہر میں مکمل بلیک آؤٹ ہوتا تھا۔ ابو جی رات کو گیارہ، بارہ بجے سردی میں ٹھٹھرتے گھر آتے۔ سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود ماں جاگ رہی ہوتی۔ وہ جھٹ اٹھتیں، کھانا گرم کرتیں اور اُن کے سامنے رکھ دیتیں۔ اُس دور میں ابو جی کی تنخواہ 90 روپے تھی۔ اِس تنخواہ سے بمشکل دس، پندرہ دن ہی گھر کی دال روٹی چلتی۔ ماں جی چونکہ محنتی تو شروع سے ہی تھیں۔ انہوں نے باقی پندرہ دن کی ہانڈی روٹی کے بندوبست کا یہ طریقہ نکالا کہ گھر میں چھوٹے موٹے کام شروع کر دیئے۔ وہ کھجور کے پتے اکٹھے کرتیں اور پھر اُنہیں مختلف مراحل سے گزار کر اُن کے پنکھے تیار کرتیں۔ اسی طرح اُنہوں نے خاکی لفافے بنانے کا کام بھی کیا۔ اس طرح ماں کی کم از کم ہانڈی روٹی کی فکر تو چلی گئی اور وہ اس بات سے بے پرواہ ہوگئیں کہ اب اُس کے بچے بھوکے نہیں رہیں گے۔ لیکن ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھرے پرے کینبے میں ہانڈی روٹی ہی نہیں اور بھی بے تحاشا مسائل ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کی غربت کے مسائل نے میری ماں کے ارمانوں کا خون کیا۔ لیکن ماں نے اپنی مسلسل محنت سے آنے والے کل کو روشن کر لیا۔

میرے سکول جانے تک گھر میں مالی طور پر بہت زیادہ نہیں تو قدرے آسودگی آ چکی تھی۔ میری طبیعت اور مزاج باقی سب بہن بھائیوں سے مختلف تھا۔ غصیلا اور نک چڑھا ہونے کے باوجود میں اپنی ماں کا بڑی منتوں مرادوں سے مانگا ہوا بیٹا تھا۔ آج بھی اپنی منت پوری کرنے کیلئے ماں ہر شب برأت اور کونڈوں پر حلوہ پوری بنا کر تقسیم کرتی ہے۔

ماں جی نے مجھے سکول داخل کروایا تو میرے نخرے بھی بڑھ گئے۔ ماں کوشش کرتی کہ میری ہر خواہش پوری کرے لیکن مالی حالات اکثر آڑے آتے۔ میں نے سکول جانے کے بعد دسویں کلاس تک اپنی ماں کو بہت تنگ کیا۔ روزانہ دوپہر کے کھانے پر برتن توڑنا میرا معمول تھا۔ سوائے چند ایک چیزوں کے میں آج تک کچھ نہیں کھاتا۔ سکول سے آتے ہی جیسے ہی مجھے پتہ چلتا کہ میری پسند کا کھانا نہیں پکا تو میں آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ برتن اِدھر اُدھر پھینکتا، دروازے توڑتا۔ اور الٹی سیدھی بکواس کرتا۔ ماں سب کچھ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہتی۔ بیچاری وہ بھی کیا کرتی۔ میرے لئے اپنے باقی سات بچوں کی خواہش تو قربان کرنے سے رہی۔ لیکن اس کے باوجود وہ میرے لئے اچھے سے اچھا کھانا پکاتی۔ تاہم اُس کے لئے بھی یہ مشکل تھی کہ آخر وہ روز کیا پکائے۔ سبزیوں میں، میں سوائے آلو، مٹر اور گوبھی کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ دال اور گوشت وغیرہ بھی پسند نہیں تھا۔ یوں اُس کا آدھا دن تو یہ سوچنے میں گزر جاتا کہ آج کیا پکایا جائے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر دوپہر اور پھر رات کا کھانا پکاتے پکاتے اور گھر کا سارا کام کرکے اُس کی ہمت جواب دے جاتی۔ اس زمانے میں گیس نہیں ہوتا تھا، اُپلے جلا کر کھانا پکایا جاتا تھا۔ اپلے جلانے کے لئے اتنی پھونکیں مارنی پڑتیں کہ آنکھوں سے پانی نکلنے لگتا۔ لیکن مجھے ان چیزوں کی پرواہ کب تھی کہ ماں کس حال میں ہے؟ میرا تو یہ معمول تھا کہ اگر مرضی کا کھانا نہیں پکا۔ تو گھر میں ہنگامہ کھڑا کر کے بھوک ہڑتال کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی۔ چنانچہ ماں کو آئے روز میری بھوک ہڑتالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ کچھ دیر تو میری بھوک ہڑتال برداشت کرتی لیکن ماں آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی اُس کی ممتا جواب دے جاتی۔ وہ میری بھوک ہڑتال ختم کرواتی۔

ماں جی کو سب بہن بھائیوں میں میری سب سے زیادہ فکر ہوتی تھی کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا؟ اس کی وجہ یہ تھا کہ تعلیمی لحاظ سے میری کارکردگی کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ نویں کلاس تک تو میں درمیانے درجے کے نمبر لیکر پاس ہوتا رہا۔ میٹرک کا امتحان دیا تو ریاضی اور بیالوجی میں کمپاٹ آ گئی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا اور طبیعت آوارہ گردی کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ دوبارہ امتحان دیا تو پھر کمپاٹ آ گئی۔ سارا سال ٹیوشن پڑھنے کے بعد پھر کمپاٹ آئی تو ماں کو جلال آ گیا۔ میں گھر کے ایک کونے میں پڑا روتا رہا۔ کئی روز تک گھر کی فضا کشیدہ رہی۔ بالآخر ماں نے پھر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یوں میں نے آخری چانس میں رو رو کر میٹرک کلیئر کیا۔

اِس عرصے کے دوران میں یہ محسوس کرتا رہا کہ مجھے کچھ حاصل کرنے کیلئے اور بڑا آدمی بننے کے لئے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اس وقت ہمت، لگن، جوش اور جذبے جوان تھے لیکن میری مایوسی میں اُس وقت اضافہ ہو گیا جب ایک پامسٹ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تم زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکتے۔ یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ کیونکہ جس فیلڈ میں، میں جانا چاہتا تھا اُس کے لئے تو بہت زیادہ پڑھنے کی ضرورت تھی۔ بعد میں کچھ اور لوگوں نے اِسی طرح کی باتیں بتائیں اور ساتھ یہ دلیلیں دیکر مجھے مایوس کیا کہ بھلا ہاتھ کی لکیروں کو کون بدل سکتا ہے۔ اُس دن کے بعد میں نے پہلی بار تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یوں اِسی سوچ کے سہارے اعلیٰ نمبروں سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ ساتھ کچھ اور سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔

1996ء میں، میں لاہور سیر کرنے کے لئے آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ لاہور نے میرا بہت خون چوسا۔ بھوک سے لیکر سر پر چھت نہ ہونے تک کے وہ تمام مراحل میں نے بھی طے کئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جن کا مقابلہ کرتے ہوئے بعض اوقات انسان اللہ سے بھی یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یا اللہ! ساری مصیبتیں اور مشکلات میرے حصے میں کیوں.......... خیر یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

میرے لاہور آنے سے ماں کی پریشانیاں اور اُداسیاں کچھ اور بڑھ گئیں، اُسے ہر وقت میری سلامتی کی فکر دامن گیر رہتی۔ ایک بار جب اُسے پتہ چلا کہ میں نے جاب چھوڑ دی ہے تو اتنی پریشان ہوئیں کہ بے ہوش ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے ہوش میں لانے پر میرے بارے میں اُنہیں تسلیاں دی گئیں تب کہیں انکی حالات سنبھلی۔

لاہور آتے ہوئے اور خصوصاً جرنلزم کا شعبہ جوائن کرتے ہوئے میں نے اپنی ذات سے ایک وعدہ کیا تھا کہ سچ لکھوں گا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اِس وعدے کا پاس کیا۔ کبھی کسی کے سامنے نہ جھکا نہ بکا۔ اپنی ملازمت کو اپنے اصولوں پر قربان کر دیا۔

1997ء میں جب میری پہلی کتاب منظر عام پر آئی تو میں نے اس کا انتساب ماں جی، ابو جی اور بڑے بھائی کے نام کیا۔ جب ماں جی کو پتہ چلا تو اُن کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگایا۔ ماتھا چوما اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ بعدازاں "چوتھا مارشل لاء" اور "خفیہ رپورٹیں" آئیں تو وہ اور بھی خوش ہوئیں۔ وہ میری پیشہ ورمشکلات سے آگاہ تھیں۔ تب ہی مجھے مختلف نصیحتیں بھی کرتی رہتیں۔

ماں جی کی ذات میں اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ ایک یہ خوبی بھی ہے کہ کفایت شعاری اُن کی گھٹی میں رچی بسی ہے۔ گھر کے پیسے میں سے ایک ایک پیسہ جوڑ کر انہوں نے دو بیٹیوں کا جہیز بنایا۔ پھر اُن کی شادیاں کیں۔ ماں کی طرح اُن کی دونوں بیٹیاں بھی وفا کی پتلیاں ہیں۔ زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن اُنہوں نے بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہی نرم طبعی اور منکسر المزاجی جو ماں جی کے رویے اور طبیعت کا خاصہ ہے اُن میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُن دونوں کے چلے جانے کے بعد گھر سونا ہوا تو کئی سال بعد ماں جی نے اِس کا حل یہ نکالا کہ بڑے بھائی کی شادی کر دی۔ بھابھی نے گھر کی رونق میں اضافہ کیا۔ بعد میں رمشا، زبیر اور نیہا کے آنے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رونق اور بڑھ گئی۔

ماں جی نے زندگی میں جتنی قربانیاں دیں۔ میں اُن کے بارے میں سوچتا ہوں تو اُن کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ابو جی نے جتنی سادہ اور شریفانہ زندگی گزاری وہ ایک علیحدہ داستان ہے جس کا تذکرہ پھر سہی۔ تاہم ماں جی اور ابو جی نے جتنا صبر کیا یہ اُس کا انعام ہے کہ زندگی بہت آسودہ اور سہل گزر رہی ہے۔ نہ کوئی پریشانی............نہ کوئی فکر............ماں جی نے خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ جو قربانیاں دیں جتنا صبر کیا۔ اس نے ہم سب بہن بھائیوں کے نزدیک اُنہیں عظمت کی معراج پر پہنچا دیا۔

ماں نے شروع سے ہی نرم خوئی، نرم طبعی اور منکسر المزاجی کو اپنا شعار بنایا۔ کھانا پکانا اور گھر کے دوسرے کام آج بھی خود کرتی ہیں۔ سب کو دستر خوان پر بٹھا کر کھلاتی ہیں اور خود اپنے بچوں کا بچا کھچا کھا لیتی ہیں۔ سارے گھر کے کپڑے خود دھوتی ہیں۔ رات کو تھکاوٹ سے چور ہونے کے بعد بستر پر لیٹتی ہیں تو ایسے میں کوئی اُن کے پاؤں دبا دیتا ہے تو خوش ورنہ کبھی کسی کو کہا نہیں۔

ماں جی کو ساری عمر کوئی بڑی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن اِس عمر میں گھٹنوں کے درد نے اُنہیں بے حال کر رکھا ہے۔ بہت علاج کروا چکے لیکن آرام نہیں آیا۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اُن سے وعدہ کیا تھا کہ لاہور چیک کروا دوں گا۔ میری نالائقی اور لاپرواہی دیکھئے آج تک یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ ماں نے بھی سوائے ایک دفعہ کے کبھی دوبارہ نہیں کہا۔ میرے مالی حالات خراب ہوں تو وہ میرا چہرہ پڑھ لیتی ہے۔ پھر خود ہی کچھ نہ کچھ رقم میری جیب میں ڈال دیتی ہے۔ جبکہ میں کوشش کے باوجود اُن کا ''کماؤ پوت'' نہیں بن سکا۔

ہم چاروں بھائی تقریباً ایک ماہ بعد ہی گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ منصور بھی لاہور آ گیا ہے جبکہ سب سے چھوٹا اور لاڈلا بھائی کاشف بھی پڑھائی کے سلسلے میں مظفر گڑھ میں ہے۔ ہمارے اکٹھے ہونے پر اُن کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ نئے نئے کھانے بناتی ہیں۔ ابو، ماں جی، بڑے بھائی، بھابھی، بہنیں اور دوسرے بچوں کی بارات میں ہم تینوں بھائیوں کی حیثیت دولہا کی سی ہوتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

میری پیشہ ورانہ زندگی میں جتنی مشکلات ہیں اور جنہیں میں FACE کر رہا ہوں، میں اس کے نتائج کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں اتنا محفوظ کیسے ہوں؟ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ ہمیشہ مخالفتیں اور دشمنیاں مول لیں۔ دوست بالکل نہیں بنائے جبکہ دشمنیاں بے حساب بنائیں۔ سچ لکھنے کے لئے دشمنیاں اور مخالفتیں مول لینی پڑتی ہیں۔ میں نے کسی کو نہیں بخشا اور نہ تعلقات بنانے کے، فوائد اٹھانے کے اور پیسہ کمانے کے بے شمار مواقع آئے۔ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کر کے جو دیکھا وہی لکھا۔ انٹیلی جینس ایجنسیوں سے لیکر کرمنل لوگوں تک کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ کسی کی بات نہیں مانی۔ کسی سے ڈکٹیشن نہیں لی۔ زندگی میں بے پناہ خطرات، مشکلات، دباؤ اور پریشانیوں کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ ماں کی دعائیں میرے سر پر چھتری بن کر مجھے ہر آفت سے بچا رہی ہیں۔ مجھ جیسا نالائق، آوارہ، جھگڑالو اور بے نمازی آدمی آج اگر بے پناہ خطرات، مصائب و مشکلات اور ہر قسم کی آفتوں سے بچا ہوا ہے تو اسکی وجہ ماں کی دعائیں ہیں جو میری حفاظت کر رہی ہیں۔ اسی لئے میں بے پرواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے ہاتھ میں ان کی دعاؤں کا پلو ہے۔ اس لئے مجھے کچھ نہیں ہوگا اور میں اِن دعاؤں کے سہارے بہت آگے تک جاؤں گا۔ کبھی کبھار نماز پڑھتے ہوئے جب میں اُن کے بارے میں سوچتے ہوئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اُن کے ہاتھوں کا پالا ہوا اور اُن کی دعاؤں کا سنبھالا ہوا بھلا اُن کے لئے کیا دُعا کر سکتا ہے؟ پھر پتہ نہیں میری دُعا قبولیت کی منزل کو بھی پہنچتی ہے یا نہیں۔ لیکن پھر اتنی دُعا ضرور کرتا ہوں کہ یا اللہ! اگر میں نے زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہو اور وہ تجھے پسند آ گیا ہو تو اُسکا ثواب میری ماں کے حصے میں لکھ دینا۔

مقبول ارشد ، لاہور

فون:0320-4801206

E-mail: maqboolarshad154@hotmail.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضور ﷺ کی والدہ محترمہ

سرورِ کونین حضرت محمد ﷺ نے حضرت آمنہؓ کے بطن مطہر سے جنم لیا اور چھ سال تک اُن کی آغوش میں پلے بڑھے۔ اس لحاظ سے بی بی آمنہؓ تمام خواتین عالم میں امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ حضور ﷺ کوئی عام شخصیت نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں جو مقام بخشا اسکی بدولت رہتی دُنیا تک اُن کا نام مسلمانوں کیلئے ایک مقدم حیثیت اختیار کر گیا۔ حضور ﷺ نے اپنی والدہ کے حوالے سے جو کچھ فرمایا اس سے اُنکی اپنی والدہ محترمہ سے محبت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ حضور ﷺ نے عام لوگوں کو بھی اپنی والدہ سے محبت سے پیش آنے کا درس دیا۔ اس کتاب میں عام لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کے اپنی والدہ محترمہ کے حوالے سے فرمائے ارشادات پیش کرنے کا مقصد قاری کو حضور ﷺ کی انکی والدہ محترمہ حضرت آمنہؓ سے محبت و عقیدت کو دکھانا ہے۔ یہ مضمون عبدالرحمان عبد کی تصنیف "آنحضور ﷺ کے نقش قدم" پر سے ماخوذ ہے۔

••••••••••••••••••••••••

"حضور رسالت مآبؐ نے ہمیشہ صبر و تحمل، شجاعت اور مردانگی کا سبق دیا ہے۔ خود ساری زندگی اس پر عمل کیا ہے۔ آپؐ نے آہ و بکا کرنے اور آنسو بہانے سے منع فرمایا ہے، لیکن ایک دفعہ آپؐ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ بھلا آپ کو یاد ہے کہ یہ کون سا موقع تھا؟" الفت رزمی نے اچانک پوچھا تھا۔

منصور علی زئی نے غزوہ احد کا حوالہ دیا کہ حضور رسالت مآبؐ سید الشہدا حضرت حمزہؓ کے گھر تشریف لے گئے، ان کے بچوں کو پیار کیا اور حضرت حمزہؓ کی شہادت کی خبر ان کی رفیقہ حیات کو دی تو حضورؐ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ مجھے کوئی واقعہ یاد نہیں تھا، اس لئے معذرت کر لی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلیمان دمشقی نے حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے حضورؐ کے ڈیڑھ سال کے ننھے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کی رحلت کا حوالہ دیا، لیکن رزمی صاحب کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔

وہ کہنے لگے...... بدر سے بھی پہلے حضور رسالت مآبؐ صحابہ کرامؓ کی معیت میں غزوہ ابواء کے لئے گئے تو غزوہ سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ اپنی والدہ کی قبر مبارک پر حاضر ہوئے جو اسی نواح میں تھی۔ والدہ کے قدموں میں حضورؐ جذباتی ہو گئے۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے تعجب سے پوچھا: ''یا رسولؐ اللہ! آپؐ کی آنکھوں میں آنسو؟ یعنی آپؐ تو فرمایا کرتے ہیں کہ مرنے والوں پر رونا نہیں چاہتے اور اب ہم کیا دیکھ رہے ہیں کہ آپؐ جیسے مضبوط اعصاب کے مالک، بہادر اور جری انسان کی آنکھیں بھی نمناک ہیں۔''

اس پر حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ محبت کے آنسو ہیں، یعنی یہ ایک بیٹے کی طرف سے اپنی والدہ محترمہ کی جناب میں نذرانہ عقیدت واحترام ہے۔ ان آنسوؤں کو کم حوصلگی یا تھڑ دلی سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو بے اختیار آنسو ہیں جو اس ''حرم محترم'' میں حاضری کا خراج عقیدت ہے۔ یہ ماں کے ان قدموں میں، جن کے نیچے جنت ہوتی ہے، گلہائے عقیدت کے طور پر آنسوؤں کا گلدستہ ہے۔

سلیمان دمشقی نے ماں کی عظمت اور مامتا کے بارے میں عرب شعراء کے حوالے دیے اور کافی اشعار سنائے۔ الفت رزمی نے کہا: ''ایک پنجابی شاعر نے کہا ہے کہ میں نے ماں سے بڑھ کر گھنی چھاؤں والا پودا نہیں دیکھا۔ سچ جانیں تو خالق کائنات نے اسی پودے کی خنک، گھنی اور معطر چھاؤں سے اپنی جنت بسائی ہے۔ یہ پودا عام پودوں سے کس قدر مختلف ہے۔ عام پودوں اور درختوں کی جڑ سوکھ جائے تو وہ ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ماں ایک ایسا بوٹا ہے جس کے پھول مرجھا جائیں یعنی اس کے بچوں کو کوئی گزند پہنچ جائے تو یہ بوٹا سوکھ جاتا ہے۔ باقی کل دنیا دے بوٹے جڑ سکیاں مرجھاندے...... ایہہ پھلاں دے مرجھایاں ایہہ بوٹا سک جاوے۔''

پھر انہوں نے کہا: ''ماؤں ہی سے دنیا کی تمام رونق، آبادی اور ہنگامہ ہائے شوق ہیں۔ انہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے طفیل اسرار حیات کھلتے ہیں۔ زندگی کے سمندر میں موجیں اور حباب، لہروں کے پیچ و تاب اور متحیر کن گرداب، سب انہی کے دم قدم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے کن فکان کے ارشاد الٰہی کے آخری مقصود، یعنی رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ یہ میری باتیں نہیں ہیں یہ حکیم الامت کے ارشادات ہیں۔"

ان کے ہاتھ میں "رموز بے خودی" تھی۔ اس میں سے انہوں نے "امومت" (ماممتا) کے موضوع سے خاصے اشعار سنائے جن میں سے مجھے بس یہی یاد رہ گئے ہیں۔

گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے امہات، آمد جناں
از امومت گرم رفتار حیات
از امومت کشف اسرار حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما

رزی نے سلیمان دمشقی کے لئے ان اشعار کا عربی میں ترجمہ کیا۔ دمشقی نے حکیم الامت کی اور ان کے خیالات کی تعریف کی اور کہا: "آپ کے علامہ اقبالؒ ہمارے بھی بطل (لیڈر اور ہیرو) ہیں۔ ان کے افکار حکمت سے لبریز ہیں، تاہم غور کریں کہ حضورؐ نے ماممتا کے اتنے بڑے موضوع کو مختصر ترین، مگر دلنشین الفاظ میں یہ کہہ کر کہ، الجنته تحت اقدام اللهات، اپنے افصح العرب والعجم ہونے کی شاندار دلیل فراہم کی ہے۔"

الابواء کی جانب

دل میں آئی کیوں نہ ہم بھی اس مقام نبی کی زیارت کے لئے چلیں جہاں حضورؐ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں؟ کیوں نہ ہم بھی مرقد ام رسولؐ دیکھنے کے لئے چلیں؟

سلیمان دمشقی نے کہا: "ابواء جانا تھا تو آپ نے پہلے کہا ہوتا۔ جب ہم بدر گئے تھے، وہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ابواء قریب ہے۔"

منصور علی زئی نے کہا: "ابواء تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔شنید سے اندازہ ہے کہ مستورہ کے ساحلی مقام سے مشرق کی جانب صحرا کا سفر ہے۔وہاں پگڈنڈی تک نہیں۔بے سنگ ومیل اور بے آب وگیاہ ریگستان میں پچیس کلومیٹر چلنے کے بعد ابواء کا مقام آتا ہے،لیکن وہاں ہادی (گائیڈ) کے بغیر جانا ممکن نہیں۔"

جہاں چاہ وہاں راہ...... جب ہم نے ابواء جانے کا ارادہ کرلیا تو مختلف لوگوں سے معلومات لینے کی کوشش کی،رہنمائی کے طالب ہوئے۔اندازہ ہوا کہ وہاں جانا کٹھن تو ہے،لیکن غیر ممکن نہیں۔مدینہ یونیورسٹی میں سیرت رسولؐ کے استاد مساعد (اسسٹنٹ پروفیسر) ابراہیم بقائی خوشی خوشی ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے،مگر عین وقت پر ذاتی مجبوری کی بنا پر ہمارے ساتھ آنے سے رہ گئے۔مدینہ میں مقیم ایک پاکستانی دوست سے حافظ لدھیانوی صاحب کی "منزل سعادت" مل گئی۔یہ عمدہ اور پرخلوص سفرنامہ ہمارے لئے دلیل راہ بن گیا۔

کچھ لوگوں نے ہمارا حوصلہ پست کرنے کی پوری کوشش کی۔ایک صاحب ابواء کا نام سن کر یوں چپ ہو گئے گویا زبان خامشی سے کہہ رہے ہوں کہ بھئی "جنہیں ہو ڈوبنا وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔" ایک صاحب نے صحرا میں بھٹک جانے اور پیاس سے بلک بلک کر مر جانے سے ڈرایا۔

منصور علی زئی نے اسے جواب دیا: "زیستن اندر خطر ہا زندگیست۔یہی مشکلات تو ہمارے لئے تازیانہ ہیں۔کیا آپ نہیں جانتے کہ "ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں؟" آپ کی باتیں تو ہمارے عزم کو مزید مستحکم کرنے کا باعث بن رہی ہیں اس لئے کہ "ہم موت ڈھونڈتے ہیں زمین حجاز میں۔"

ایک اور صاحب نے کہا: "وہاں جا کر آپ کو کیا ملے گا؟ وسعت لامحدود،ایک لق ودق صحرا، ویرانہ عظیم اور اس میں ایک بے نام ونشان،خستہ حال سادہ سی ایک قبر،اور بس۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دمشقی نے کہا: ''مکان سے بڑھ کر قدر و قیمت مکین کی ہوتی ہے۔ مقام کی نہیں اصل اہمیت اس کے تعلق کی ہوتی ہے۔ ہم ابواء کی زیارت کے لئے صرف اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ اس کا تعلق حضور رسالت مآبؐ سے ہے۔ وہاں حضورؐ کی والدہ ماجدہ مدفون ہیں۔ ہم اس لحد مبارک کو اس لئے دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس مقام پر تشریف لانے سے حضورؐ کے جذبات میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ آپؐ کی بچپن کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں اور آپؐ کو دلگداز احساسات کا تجربہ ہوا تھا۔''

بعد کے چند روز میں ہم نے حضورؐ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں پھر سے مطالعہ کیا۔ الفت رزمی کا مطالعہ اور تیاری سب سے موثر رہی۔ سلیمان دمشقی نے طبری، ابن ہشام اور واقدری کو پڑھا۔ منصور علی زئی نے یاقوت الحموی کی معجم البلدان سے یہ مختصر نوٹ لا کر دیا:

''ابواء...... مدینہ کے قریب سواد فرع میں ایک گاؤں یا آرہ کے پاس ایک پہاڑ...... جہاں حضرت آمنہ مدفون ہیں۔''

میں نے شارٹ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج ا، ص۔ 169) سے ابواء کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت نوٹ کی: ''الابواء! مکہ سے مدینہ کی شاہراہ پر ایک مقام ہے جو الجحفہ سے 23 میل پر واقع ہے۔ یہ کنانہ کے قبیلہ بنو خمرہ کے علاقے میں ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ابواء ایک پہاڑ کا نام ہے۔ روایت مشہور ہے کہ حضورؐ کی والدہ حضرت آمنہ مدینہ سے لوٹ رہی تھیں تو یہاں فوت ہو کر دفن ہوئیں (طبری) حضورؐ نے مدینہ سے سب سے پہلے جس غزوے میں خود حصہ لیا وہ الابواء اور اس کے قریب ودان میں تھا۔ مارچ 625ء میں جب کفار مکہ کا لشکر مدینہ کے خلاف جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تو کسی کافر نے کہا کہ حضرت آمنہ کی لاش کو کھود ڈالیں، مگر باقی لوگوں کی مخالفت سے وہ اس برے ارادے سے باز رہے۔''

☆☆☆

مدینہ منورہ میں ناشتہ کر کے ہم موقف پہنچے تو ہمیں مکہ معظمہ جانے والی تیار بس میں جگہ مل گئی۔ یہ کشادہ اور آرام دہ بس روانہ ہوئی تو ہم باہر کے نظاروں سے محظوظ ہونے لگے۔ آپس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گفتگو کرتے ہوئے اور خشک میووں سے شغل کرتے ہوئے سفر مزے سے کٹ رہا تھا۔ بئر علی سے آگے بڑھے تو تھوڑی دیر بعد صحرا شروع ہو گیا جس کے درمیان حد نظر تک جاتی ہوئی، چوڑی اور ہموار، طریق سلطانی بھلی لگ رہی تھی جس کی دونوں جانب ٹیلے تھے۔

ہماری بس نیف کے بعد اب المجید سے گزر رہی تھی۔ دمشقی کہہ رہے تھے: ''انسان نے بھی زبردست کارنامے انجام دیے ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر وہ نائب خدا ہے، تاہم قدرت کے کرشموں کا جلال و جمال کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ سمندر کی زبردست لہریں ہوں کہ نانگا پربت کی رفعت، بحر منجمد کی ٹھنڈک ہو کہ صحرائے اعظم کی حدت، ابلتے چشموں کی چاندی ہو کہ وادیوں میں ہریالی کے سبز قالین، قوس قزح کے جنت نگاہ رنگ ہوں یا پرندوں کی فردوس گوش آوازیں، یہ سب وہ ساز ہیں جن میں قدرت کی کمال صناعی کے گیت معمور و مستور ہیں۔''

المفرق آیا...... یہاں شاہراہ سے بدر، شام اور مکہ کے لئے تین راستے پھوٹتے ہیں۔ راہیں جدا کرنے کی بنا پر اسے مفرق (تفریق ڈالنے والا مقام) کہا جاتا ہے۔ ہم مکہ کی راہ ہو لئے۔ دمشقی نے کہا: ''اسی راستے اور اسی شاہراہ کا حضرت سعدؓ بن معاذ نے حوالہ دیا تھا جو غزوہ ابواء کا سبب بنا۔ بات یوں ہوئی کہ یثرب کے رئیس حضرت سعدؓ 2ھ میں عمرہ ادا کرنے مکہ معظمہ گئے تو عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے انہیں ٹوک دیا اور کہا کہ تم ہمارے مرتدین کو (ابوجہل کا اشارہ حضورؐ اور مہاجرین مکہ کی طرف تھا) پناہ دو اور ہم تمہیں یہاں اطمینان سے طواف کرنے دیں؟ اگر تم امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ نہ جا سکتے۔ حضرت سعدؓ نے ہاتھ کے ہاتھ جواب دیا کہ اگر تم نے ہمیں طواف کعبہ سے روکا تو ہم مدینہ کے قریب، یہ تمہارا شام کی طرف جانے والا تجارتی راستہ (دمشقی نے نیچے سڑک کی طرف انگلی سے اشارہ کیا) روک دیں گے۔ ان کے الفاظ یہ تھے ''بخدا، اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے۔''

ہماری پہلی منزل یعنی مستورہ آ گیا۔ یہاں سے ہم نے صحرا کا سفر کرنا تھا، اس لئے بس سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نیچے اترے۔

غزوہ ابواء

ہم بس سے اتر کر اس ننھی سی مسافر نواز بستی کے ایک پاکستانی ہوٹل میں چلے گئے۔ چائے سے تازہ دم ہوئے۔ میں نے دوستوں کو مستورہ میں اپنے گزشتہ تجربے کی بات بتائی جب مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے بس نے یہاں وقفہ کیا اور میں نے یہاں سمندر میں سورج کے ڈوبنے اور صحرا کی جانب سے بدر کامل کے طلوع ہونے کا ناقابل فراموش منظر دیکھا تھا۔ ہوٹل کے منیجر محمد اشرف کو جب ہمارے سفر کی غایت معلوم ہوئی تو اس نے مدد کی اور مستورہ کے رہنے والے عوف غنمی ٹیکسی ڈرائیور کو بلایا جو ابواء کے راستے سے واقف تھا۔ اس نے ایک طاقتور انجن والی ویگن کا انتظام کیا۔ ظہر اور ظہرانے سے فارغ ہو کر ہم بعد دوپہر اڑھائی بجے اپنے سفر پر ابواء روانہ ہوئے۔

پھر ایک دفعہ صحرا ہمارے سامنے تھا، لیکن اس بار ہمارے نیچے پختہ سڑک نہیں تھی، کوئی باقاعدہ راستہ تک نہیں تھا۔ دائیں بائیں ریت کے ٹیلوں میں سے راستہ بناتے جا رہے تھے۔ غنمی کا رخ مشرق کی جانب تھا۔ ہماری ویگن کا چھوٹا سا سایہ آگے پڑ رہا تھا اور غنمی اعتماد سے ویگن چلا رہا تھا۔

حافظ لدھیانوی صاحب کے قافلے نے جب یہاں سے ابواء کا سفر شروع کیا تھا تو ان کی خوش قسمتی سے بادل کا ایک ٹکڑا ان کے ساتھ ساتھ سر پر رہا تھا، ہماری ایسی قسمت کہاں تھی۔ اب آسمان صاف اور نیلا تھا۔ کسی چھوٹے سے لکہ ابر تک کا ڈھونڈے سے نشان نہیں ملتا تھا۔ پون گھنٹے تک ہم ریت کے ان بے شمار ٹیلوں میں بڑھتے رہے اور اپنے سامنے ان سرابوں کے بننے، مٹنے اور پھر بننے کا مسلسل تماشا دیکھتے رہے جو تشنہ لبوں کو بے وفا محبوب کی طرح جھوٹی آس دلا کر اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ حرماں نصیب تیز قدموں سے چل کر ان کے قریب پہنچتے ہیں تو انہیں مایوسیوں کے تالاب میں ڈبو دیتے ہیں۔ دور ہمارے سامنے آب آسا سرابوں کی سفید چادریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بچھی ہوئی ہیں۔ ان کے فریب نظر کا کمال دیکھیں کہ قریب کی جھاڑیاں تک سراب کی سطح ''آب'' پر واقع منعکس دکھائی دیتی ہیں۔ جونہیں ہماری ویگن ان کے قریب پہنچتی ہے تو سراب کے یہ تالاب جیسے ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں، لیکن دور آگے پھر اور سراب بن جاتے ہیں جیسے ہمارے ذہن کے صحرا میں شیطانی وساوس کے سراب بننے، مٹنے، بنتے رہتے ہیں کہ ایک بیکار خیال سے دامن جھٹکتے ہیں تو دوسرا در آتا ہے۔

الف رزمی نے حضور رسالت مآبؐ کے اس علاقے میں سفر ابواء کا حال سنایا اور کہنے لگے:

''کفر کی زبردست ہزیمت اور اسلام کی فیصلہ کن فتح کے لحاظ سے معرکہ بدر کو حضورؐ کا پہلا غزوہ کہا جاتا ہے، تاہم ابن ہشام کی روایت کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی حمایت و مدافعت کے لئے حضورؐ نے سب سے پہلے مدینہ سے باہر قدم نکالا، وہ اس سفر میں دو ہفتے مدینہ سے باہر رہے اور یہاں ودان اور ابواء تک تشریف لائے۔ آپؐ کے ہمراہ ساٹھ مجاہدین کی جماعت سینہ سپر تھی۔ اسی کو غزوہ ابواء کہا جاتا ہے۔ اس میں اور حضورؐ کے آخری غزوہ تبوک میں کئی نکات کی مماثلت ہے۔ دونوں میں دشمن سے مدافعت میں اقدام کیا گیا۔ دونوں میں حریفوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا، کوئی مقابلہ اور مقاتلہ نہیں ہوا۔ دونوں میں ان علاقوں کے قبیلوں سے عہد و پیان استوار کر کے مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن کو مستحکم کیا گیا اور معرکہ نہ ہونے کے باوجود پورے سفارتی اور حربی فوائد حاصل کئے گئے۔''

پھر انہوں نے غزوہ ابواء کا پس منظر بیان کیا..... ''مکی مسلمان، قریش مکہ کے مظالم سے بچنے کے لئے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ پھر بھی ابوجہل اینڈ کمپنی اپنی اسلام دشمنی سے باز نہ آئے۔ انہوں نے یثرب میں سردار منافقین عبداللہ بن ابی کو لکھا کہ تم محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں سے لڑ اور انہیں یثرب سے نکال دو۔ حضور ﷺ نے اپنی فراست اور حکمت و تدبر سے اس معاملے کو سلجھا لیا۔ پھر بھی چار سو کلومیٹر دور بیٹھے قریش مسلمانوں کو پریشان کرنے سے باز نہ آئے اور مدینہ کے نواح میں آ کر چھیڑ چھاڑ کی۔ اس وقت سورہ الحج کے ذریعے مظلوم مسلمانوں کو پہلی دفعہ ان ک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی۔

ابو جہل اور ابولہب نے اپنے طرز عمل اور مسلمانوں پر غارت گر دستوں کے اکا دکا حملوں سے مہاجرین مکہ اور حضور ﷺ کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کر رکھا تھا۔ حضور ﷺ کو قریش مکہ کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا اور آپ مسلمانوں کی چھوٹی سے جماعت کی سلامتی کے لئے ہمہ وقت چوکس اور مستعد رہتے تھے۔ کفار مکہ کے ایک غارت گر دستے نے کرز بن جابر الفہیری کی سرکردگی میں عین مدینہ کے قریب ڈاکا مارا اور اہل مدینہ کے مویشی لوٹ لئے تو خود آپؐ نے جاگ کر کئی دفعہ پہرہ دیا کہ کہیں کفار رات کی تاریکی میں مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ بخاری کی روایت میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے، چنانچہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے رات بھر پہرہ دیا۔ یہ حالات تھے جب وحی الٰہی نے مقابلے کی اجازت دی''۔

پھر اس اجازت کی تفصیل میں بتایا: ''سورہ الحج کی آیات 39-40 میں فرمایا کہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا۔ ان کا قصور یہی ہے نا کہ وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کے ذریعے دوسری قوم کو نہ مٹاتا تو ظالم لوگوں کے ظلم سے عبادت خانے اور گرجے وغیرہ منہدم ہو جاتے اور وہ مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ختم ہو جائیں۔ اس لئے جن لوگوں پر ظلم ہوا ہے انہیں مدافعت و مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے۔...... اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا''

اس اجازت پر حضور ﷺ صفر 2ھ (اگست 623ء) میں مدینہ منورہ سے نکلے تو آپؐ نے مدینہ میں رئیس خزرج، حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ حضور ﷺ کی عمر اس وقت 55 برس تھی۔ آپؐ نے اس معرکے میں انصار مدینہ کو آنے کی زحمت نہیں دی کہ ان سے یہ معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ کی مدافعت میں ساتھ دیں گے۔ آپؐ کے ہمراہ ساٹھ مجاہدین تھے جو سارے مہاجرین مکہ تھے۔ حضورؐ نے لشکر اسلام کا سفید علم اپنے چچا حضرت حمزہؓ کو عطا کیا۔ حضور ﷺ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اونٹ پر سوار تھے۔ یہ مجاہدین قریباً وہی راستے طے کرتے ہوئے کہ جس پر ہم آئے ہیں، ودان کے مقام تک آئے جو ابواء سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔

حضورؐ کے اس اقدام اور عسکری تاخت کا مقصد قریش مکہ کو یہ باور کرانا تھا کہ اب مسلمان اس قدر کمزور نہیں ہیں کہ وہ مدینہ ہی میں محصور ہو کر رہ جائیں بلکہ ان کی عسکری قوت اتنی ہے کہ وہ جب اور جہاں چاہیں چھاپہ مار سکتے ہیں اور قریش یہ جان لیں کہ مکہ و شام کی تجارتی شاہراہ اب ان کے قافلوں کے لئے محفوظ نہیں۔ ابواء میں بنو ضمرہ کے سرکردہ افراد نے جب لشکر اسلام کو یوں غیر متوقع طور پر اپنے درمیان پایا تو ان پر مسلمانوں کی ہیبت طاری ہو گئی۔ انہیں احساس ہوا کہ مسلمانوں کو اپنی عسکری طاقت پر بھر پور اعتماد تھا، چنانچہ انہوں نے حضور ﷺ سے غیر جانبداری کا معاہدہ کر لیا کہ وہ قریش کی مدد کریں گے نہ مسلمانوں کی۔ اس طرح مسلمانوں کو بنو ضمرہ کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا یوں حضور ﷺ کا یہ سفر مبارک مسلمانوں کے سیاسی سفر کا پہلا قدم ثابت ہوا۔

''سرور عالم کے سفر مبارک'' کے مصنف محمد کلیم لکھتے ہیں: ''غزوہ ابواء سے فارغ ہو کر سرور عالمؐ نے اللہ پاک سے اپنی والدہ سیدہ آمنہؓ کی قبر کی زیارت کا اذن پایا تو ابواء کے اس مقام پر تشریف لائے جہاں آپؐ کی والدہ ماجدہ مدفون تھیں۔ قبر کی زیارت کے موقع پر آپؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ مبارک آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا جسے دیکھ کر بے اختیار مجاہدین بھی رو دیے۔''

ام رسول ﷺ کا مرقد

ہوا میں خنکی آ گئی تھی اور اب شام بھی ڈھل چکی تھی۔ منصور علی زئی کہہ رہے تھے: ''سیدہ آمنہ اپنے لالؐ کو لے کر یثرب تشریف لائیں۔ اپنے بیٹے کو اپنے شوہر کی قبر پر لے گئیں۔ پھر ایک ماہ تک دار النابغہ میں رہیں۔ یثرب میں ایک ماہ کے اس قیام کی یادیں حضورؐ کے دل پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئیں۔ بنو نجار کی لڑکی انیسہ جو حضورؐ کی ہم عمر تھی اور ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ بنو نجار کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باؤلی جس میں حضورؐ نے تیرنا سیکھنا۔ یثرب کا وہ آطام یعنی دو منزلہ قلعہ نما پختہ مکان جس پر کبوتر آکر بیٹھا کرتا تھا۔ حضور ﷺ نے اپنے بچپن کی ان موہنی یادوں کو بعد ازاں اپنے صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا۔ ایک ماہ بعد حضرت آمنہؓ مکہ کے لئے روانہ ہونے لگیں تو ان کے ساتھ ان کی لونڈی برکہ ام ایمن بھی تھی۔"

محمد کلیم ارائیں، حضورؐ کے اس سفر مبارک کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ مختصر سا قافلہ سردار مکہ اور متولی کعبہ سردار عبدالمطلب کا خاندان تھا، ان لئے اس پر کسی کو ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ ہوسکتی تھی کیونکہ جس خوف سے عرب کی سرزمین میں کوئی محفوظ نہیں تھا، اس سے یہ قریشی محفوظ تھے۔ اگر اکیلا قریشی بھی کہیں سے گزر رہا ہو اور کوئی اس سے اعراض کرے تو صرف لفظ "حرمی" یا "انا من حرم اللہ" کہہ دینا کافی تھا، یہ سنتے ہی ان پر اٹھے ہوئے ہاتھ رک جاتے تھے۔

"سیدہ آمنہؓ کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ واپس مکہ مکرمہ چلی آئیں اور سردار عبداللہ سے دور ہو جائیں، لیکن بہر حال گھر کو تو واپس آنا ہی پڑتا ہے۔ آپ اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں گھل گھل کر بیمار رہنے لگی تھیں، مگر اس بیماری اور غم کا اظہار نہیں کرتی تھیں بلکہ نہایت خاموشی اور صبر سے یہ صدمے سہتی تھیں۔ آخر کار اس بیماری نے اپنا اثر دکھایا اور جب یہ قافلہ ابواء پہنچا تو آپ پر نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ "دیکھتے ہی دیکھتے سیدہ آمنہؓ کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ برکہ کی چیخیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رلاتی ہیں اور آپ میری امی میری امی کہہ کر سیدہ آمنہؓ کے جسد بے روح سے لپٹ جاتے ہیں۔ ننھی سی جان رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ باپ کو دیکھا نہ تھا، ماں کا سہارا بھی جاتا رہا...... برکہ، آمنہ کے لال کو سینے سے لگائے ہچکیاں لے رہی ہے۔ کبھی ان کی پیشانی چومتی ہے کبھی روتی اور چلاتی ہے۔ اسی کرب و اذیت کے عالم میں بستی والوں کی مدد سے جناب آمنہ کو دفن کر دیا جاتا ہے"۔

اس غم ناک واقعے کے چودہ سو سال بعد آج یہاں پہنچ رہے تھے۔

عوف غنمی نے ویگن کی رفتار دھیمی کر دی۔ ہم ایک چٹانی سطح مرتفع، جسے آپ پہاڑی بھی کہہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتے ہیں، کے دامن میں پہنچ گئے۔ غنمی نے ویگن روک لی اور بتایا کہ وہ سامنے بی بی آمنہ کا مرقد ہے۔

ہمارے دلوں میں محبت، عقیدت اور احترام کے جذبات موجزن ہو گئے۔ ہم گویا اپنی والدہ کے قدموں میں حاضر ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ یہاں کوئی درخت تھا نہ پودا۔ کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ اور سایہ تھا نہ پانی۔ چاروں طرف اجاڑ اور ویرانہ تھا۔ میں اپنے لئے جس پردیس اور گمنامی کی موت کی تمنا کرتا ہوں یہ غربت اور عزلت ہو بہو اس کی تصویر تھی۔ ہم کبھی ریت اور کبھی سخت زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے بلندی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ آخر کار ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

سامنے اونچائی پر سادہ سی قبر بنی ہوئی تھی جس کے اوپر مٹی کا ابھار بھی تھا۔ بے در و دیوار اس قبر پر کوئی نشانی یا نام، کوئی کتبہ یا لوح مزار کچھ بھی نہیں تھا جس سے پتہ چلتا کہ یہ حضور رسالت مآبؐ کی والدہ محترمہ حضرت بی بی آمنہ کی لحد مطہر ہے۔ بے اختیار دل میں آتا ہے کہ

برمزار ما غریباں نے چراغ نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اسی لئے منصور علی زئی نے اس مرقد کو "تربت غربت" کہا۔ ارد گرد کچھ بے ترتیب سے چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ہم سب حضورؐ آپ رحمت کی والدہ کے قدموں میں کھڑے ہو گئے۔ دمشقی اور علی زئی نے سر پر رومال ڈال لئے اور ہم سب ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو کر خاموشی سے فاتحہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

لحد مبارکہ پر ہالہ گل

تھوڑی دیر بعد ہم رومال بچھا کر بی بی آمنہؓ کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ ایک وقت تھا کہ یہ ننھی سی آمنہ تھیں۔ ان کے والد وہب بن عبد مناف، اپنے قبیلہ بنو زہرہ کے رئیس تھے۔ یہ بڑی ہوئیں تو ان کی شادی سردار مکہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ سے ہو گئی جو خوش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلق، خوش اندام اور خوش اطوار تھے۔ وہ بی بی آمنہؓ کو آپ رحمت کی نشانی دے کر یثرب میں فوت ہو گئے۔ حضورﷺ چھ سال کے ہوئے تو بی بی آمنہؓ آپؐ کو لے کر یثرب آئیں، آپؐ کے والد کی قبر پر لے گئیں۔ مکہ واپسی سفر میں وہ یہاں بیمار ہو کر فوت ہوئیں اور یہیں دفن ہوئیں۔ یہ ہمارے سامنے انہی کی آخری آرام گاہ ہے۔

الفت رزمی نے جیب سے حکیم الامت کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' نکالی۔ اس جگہ اور موقع کی مناسبت سے ان کے انتخاب سے خوشی ہوئی۔ ایک دفعہ میں مقامات اقبال کی زیارت کے لئے سیالکوٹ گیا تو سڑک کی دائیں جانب اونچی جگہ پر ایک قبر کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی تھی کیونکہ مرحومہ کے نابغہ روزگار بیٹے نے اپنی نظم کے ذریعے انہیں غیر فانی کر دیا تھا۔ اس نظم میں انہوں نے ماں متا اور ممات، الم و عدم اور حیات کے مسائل دلنشین اسلوب میں بیان کیے ہیں۔ ہم بی بی آمنہؓ کے قدموں میں مودب ہو کر بیٹھے تھے۔ دل میں یہ خیال تھا کہ بالکل یہاں حضورؐ رسالت مآبؐ بھی مودب کھڑے تھے، آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آپؐ کے ہونٹوں پر کچھ ایسے تاثرات تھے۔

سیرت فرزندہا از امہات
جوہر صدق و صفا از امہات
می تراشد مہر تو اطوار ما
فکر ما، گفتار ما، کردار ما

رزمی پڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی بی بی آمنہ کی لحد مبارک کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتے تھے۔

بعد میں انہوں نے بتایا کہ دوسرے شعر میں ''تصویر کے اعجاز'' کو ''یادوں کے اس اعجاز'' میں بدل کر اسے حسب حال کر لیا تھا۔ کہنے لگے کہ خاک مرقد پر تری، ہم ایک متاع دیدہ تر لے کے آئے ہیں۔

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات ۔۔۔ تھی سراپا دین و دنیا کا سبق، تیری حیات
قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رزمی اس نظم کو ترنم سے نہیں پڑھ رہے تھے لیکن اس مقام کا اثر تھا، حضور ﷺ کے یہاں قیام کا تصور تھا کہ ان کے تحت اللفظ میں لحن اور لرزش تھی، جذباتی کیفیت اور سوز تھا، آواز میں ارتعاش تھا۔ جب انہوں نے ''قاصد گریہ پیہم'' والا مصرع پڑھا تو ہمیں خود پر اختیار رکھنا مشکل ہو گیا۔

واپس ہونے لگے تو غنمی نے کہا: ''میں نے جو سن رکھا تھا کہ لوگ قبروں میں شرک کرتے ہیں، آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی، لیکن یہ جو اشعار وغیرہ پڑھ رہے تھے اور حد درجہ جذباتی ہوئے جا رہے تھے، ایسی بات کبھی دیکھی نہ سنی۔ برا نہ مانیں آپ لوگ تو جیسے اکٹھے مل کر سبق پڑھ رہے تھے''۔

میرے دل میں آئی کہ اگر پہلے سے خیال ہوتا اور ممکن ہوتا تو ہم پھولوں کی چادر ساتھ لاتے۔ اس مقدس مرقد پر عقیدت و احترام کے اظہار کے لئے چڑھاتے تاکہ اس پاک ہستی کی لحد ہمیشہ مہکتی رہے جن کے بیٹے کی خوشبو سے پورا عالم مہک رہا ہے۔

منصور علی زئی نے تصحیح کی: ''آپ نے پھولوں کی چادر کہا۔ ہمارے ہاں یہی ترکیب مروج ہے کہ فلاں غیر ملکی مقتدر نے حکیم الامت کی لحد پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ اس ترکیب پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ چادر سے ذہن میں ایک مستطیل شے کا تصور آتا ہے جبکہ پھولوں کا یہ نذرانہ عام پر مستدیر ہوتا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ پھولوں کے اس دائرے کو ہالہ گل کہنا زیادہ مناسب ہو گا''۔

مرقد فروزاں ہو ترا

واپس ویگن میں بیٹھنے کے لئے آ رہے تھے لیکن کا مرقد آمنہؓ کے اس مقدس ماحول سے نکلنے کو الفت رزمی صاحب کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ پھر ابواء کے موضوع پر آ گئے اور مستقبل میں جھانک کر ہمیں بتانے لگے: ''طریق سلطانی پر مستورہ کے قریب سے دو رویہ کشادہ سڑک ابواء تک جائے گی جس کی درمیان اتنے سدابہار پودے اور سبزہ و گل ہوں گے کہ مسافروں کو گزرتے ہوئے صحرا کے بجائے گلستان کا احساس ہو گا۔ مسلسل روشنیاں ہوں گی کہ شب کو یہاں دن کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سماں کا گماں ہوگا۔ مدفن آمنہ پر ایک جنت نگاہ مقبرہ ہوگا جس کے ارد گرد پھلوں اور پھولوں کا ایک وسیع و عریض باغ ہوگا۔ عین ممکن ہے جب یہ روشن مستقبل، حال بن جائے تو ہوائی سفر اتنا عام ہو چکا ہو کہ ابواء میں ہوائی اڈہ ہو اور مستورہ سے ابواء تک سڑک بن کر متروک ہو چکی ہو''۔

سورج غروب ہونے والا تھا کہ غنمی نے ویگن کا انجن اسٹارٹ کیا۔ روانہ ہونے لگے تو رزمی نے کہا: ''اجازت دیں تو میں نظم کے آخری تین اشعار ایک مرتبہ دہرا دوں؟'' صرف تین پڑھنے پر کسے اعتراض ہوسکتا تھا لیکن رزمی نے انہیں پڑھ کر ہمارے دلوں میں تیر نیم کش بنا دیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مٹھی بائی

دنیا بھر کی تمام عظیم شخصیات کی طرح قائداعظم محمد علی جناح کی عظمتوں کی کہانی بھی اُن کی والدہ محترمہ کی آغوش محبت سے شروع ہوتی ہے۔ یہی وہ ہستی تھی جس نے بظاہر کند ذہن 'گولیاں' گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنے والے ایک نوعمر بچے کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی کہ اُسے کارزار ہستی میں کارہائے نمایاں انجام دینے ہیں، اُسے بڑا آدمی بننا ہے۔ اپنا اور اپنے آباؤ اجداد کا نام روشن کرنا ہے۔ یہ خیال ذہن میں بٹھانے کے بعد قائداعظم کی والدہ کو یقین تھا کہ اسکا بچہ عام بچوں جیسا نہیں بلکہ یہ بڑا ہو کر ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنے گا۔ قائداعظم نے اپنی والدہ محترمہ کے خواب کو تعبیر بخشی اور مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ وطن کے تصور کو عملی جامہ پہنا کر کارہائے نمایاں سرانجام دیا۔ قائداعظم کی والدہ محترمہ کے حالات زندگی ڈاکٹر ظفر علی راجا نے بیان کئے ہیں۔

•••••••••••••••••••••••••

قائداعظم محمد علی جناح کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی شیریں بی بی تھا۔ شیریں بی بی اسماعیلی خوجہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے جد امجد ایرانی امراء میں سے تھے اور آغا خان اول کے ہمراہ ہجرت کر کے ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے۔ ان کے گھرانے کو علاقے میں دور دور تک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قائداعظم کے دادا پونجا بھائی بھی اسماعیلی برادری کے ایک معزز اور صاحب ثروت بزرگ تھے۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں کے نام والجی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھائی، نتھو بھائی اور جناح بھائی تھے جبکہ بیٹی کا نام مان بائی تھا۔ جب جناح بھائی کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوئی تو پونجا بھائی نے ان کی نسبت شریں بی بی سے ٹھہرادی، لہٰذا اسماعیلی رسم ورواج کے مطابق 1874ء کے لگ بھگ جناح بھائی اور شیریں بی بی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ یہ شادی کاٹھیاواڑ کے علاقے جنود کے ایک نزدیکی گاؤں دھافہ میں سرانجام پائی۔ شیریں بی بی کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔

شریں بی بی دراز قد، گوری چٹی اور خوبصورت خاتون تھیں، جب جناح پونجا انہیں بیاہ کر لائے تو سسرام والوں نے ان کی خوبصورتی، خوش مزاجی اور خوش سلیقی کو دیکھ کر انہیں پیار سے ''میٹھی بائی'' کا لقب دیا۔ یہ لوگ نکھرے، خوبصورت اور خوش مزاج لڑکیوں اور دلہنوں کو ''میٹھی'' کہا کرتے تھے۔ اتفاق سے یہ فارسی لفظ ''شیریں'' کا ہم معنی بھی تھا، چنانچہ سارے گھرانے میں ان کی یہی عرفیت مشہور ہوگئی۔ پھر ''میٹھی'' کثرت استعمال سے ''مٹھی'' بن گیا اور یہی ان کا مستقل نام ٹھہرا۔

1875ء میں شادی کے چند ہی ماہ بعد اپنا الگ کاروبار منظم کرنے کی غرض سے جناح بھائی اپنی اہلیہ مٹھی بائی کے ہمراہ کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے۔ کراچی پہنچ کر میاں بیوی نے کھارادر کی نیونہام روڈ پر دو کمروں پر مشتمل ایک متوسط درجے کا مکان کرائے پر حاصل کیا۔ یہ علاقہ اس وقت کاروباری مرکز کے طور پر مستعمل تھا۔ قائد کے والد نے اس علاقے میں ''جناح پونجا اینڈ کمپنی'' کے نام سے کاروبار شروع کیا جو چند ابتدائی مشکلات اور رکاوٹوں کے بعد چل نکلا۔

کراچی کے اسی تاریخی مقام پر 25 دسمبر 1876ء کو پیر کے روز مٹھی بھائی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ پہلوٹھی کے اس بچے کا نام خاندانی روایات کے مطابق بچے کے ماموں قاسم موسیٰ نے محمد علی رکھا۔ جناح پونجا کے گھرانے میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب کسی بچے کا خالص اسلامی نام تجویز ہوا۔ بچہ نہایت کمزور تھا، ہاتھ بڑے لمبے لمبے تھے اور وزن تشویش ناک حد تک کم تھا۔ لاغر صحت نے مٹھی بائی کو پریشان کر دیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے تفصیلی معاینے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد یہ رائے ظاہر کی بچہ محض اتفاق سے کمزور ہے، اسے کوئی بیماری یا تکلیف نہیں، لہذا فکر مند ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

رسم عقیقہ

بچے کی صحت کے بارے میں جب مٹھی بائی کی تشویش کچھ کم ہوئی تو اس نے اس کی رسم عقیقہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ بچے کی پیدائش پر اظہار مسرت کے لئے عام طور پر مختلف تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں منائی جانے والی ان تقریبات میں ہندوانہ رسوم کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ رواج جناح پونجا کے گھرانے میں بھی تھا، لیکن ان رسومات سے قبل بچے کے کان میں اذان کہنا لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ بچہ پیدا ہونے کے چھٹے دن ہی ایک تقریب سرانجام دی جاتی تھی جسے عام طور پر ''چھٹی'' کہتے تھے۔ ہندوؤں میں یہ چھٹی ہوتی تھی اور مسلمانوں میں بھی۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس دن ''چھٹی ماتا'' نام کی کوئی دیوی آتی ہے اور بچے کی تقدیر قلم بند کر جاتی ہے۔ ان کے نزدیک وہی گویا کاتب تقدیر ہے، لہذا اس عقیدے کی بنا پر چھٹے دن بڑا اہتمام ہوتا تھا اور بچے کے قریب ایک خوبصورت اور رنگین قلم کے ساتھ زعفران کی بنی ہوئی روشنائی اور ایک ''چوپڑی'' یعنی بہی رکھ دی جاتی تھی کہ بچے کی تقدیر بہت اچھی اور خوش رنگ لکھی جائے، لیکن اس نوزائیدہ بچے محمد علی کے والدین نے جہاں خالص اسلامی نام رکھنے کی ابتدا کی، وہیں اس ہندوانہ رسم کو بھی ختم کیا اور خالص اسلامی احکام کے مطابق اپنے بچے کا عقیقہ کیا۔ مٹھی بائی کا خیال تھا کہ رسم عقیقہ اپنے آبائی علاقے جنود میں واقع حسن پیر کی درگاہ پر ادا کی جائے۔ جناح بھائی نے شروع شروع میں اس خیال کی مخالفت کی، لیکن آخرکار مٹھی بائی کے اصرار پر تسلیم خم کر دیا۔ اسماعیلی جماعت کے افراد حسن پیر سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ بزرگ، امام شاہ عبدالحسن علی کے زمانہ اقتدار 1730ء-1780ء بمطابق 1143ھ-1194ھ میں حیات تھے۔ ایک تاریخی اسماعیلی روایت کے مطابق گجرات پر مرہٹوں کی زبردست یلغار کا بے جگری سے سامنا کرنے کے بعد اسماعیلیوں نے حسن پیر ہی کی زیر قیادت گجرات سے ہجرت کی تھی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر کاٹھیاواڑ میں آ بسے تھے۔

سمندر میں طوفانی سفر

رسم عقیقہ کی ادائیگی کے لئے ننھے محمد علی جناح نے اپنی زندگی کا پہلا سفر اپنی والدہ کی آغوش میں کیا۔ اس وقت قائداعظم ؒ کی عمر صرف چند ماہ تھی۔ اس سفر کا ایک حصہ کراچی سے ویروال تک ایک دیسی کشتی میں طے کیا گیا۔ راستے میں طوفان نے آلیا۔ کشتی لہروں کے رحم و کرم پر ہچکولے کھاتی رہی، ماں کے دل سے بچے کی سلامتی کے لئے دعائیں نکلتی رہیں۔ آخر کار خاصی دیر کے بعد پانی کی بے رحم موجوں کا دل موم ہوا اور کشتی طوفان سے نکل کر پانی کی ہموار سطح پر تیرنے لگی۔ اس طرح ننھے جناح نے عمر کے انتہائی ابتدائی مہینوں ہی میں اپنی زندگی کے اولین بحران کا سامنا کیا۔ آگے چل کر ان کی حیات لازوال پے در پے، بحرانوں سے گزری۔ قائد نے ان سب بحرانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔

ویروال سے جنود تک سفر کا دوسرا حصہ ایک بیل گاڑی میں طے کیا گیا۔ اس طرح مٹھی بائی اپنے شیر خوار بچے سمیت درگاہ حسن پیر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

حسن پیر کی درگاہ سے قائد کے دادا کا گاؤں پانیلی صرف دس میل دوری پر واقع ہے۔ جب رسم عقیقہ سے فراغت ہوئی تو قائداعظم کے والدین اپنے اس بچے کو جس کا سر تازہ تازہ منڈا ہوا تھا، ساتھ لے کر اپنے آبائی گاؤں چلے آئے۔ چند ہفتے گاؤں میں قیام کے بعد دوبارہ کراچی کا رخ کیا گیا۔ کراچی آمد کے بعد جناح بھائی تو کاروباری مصروفیات میں الجھ کر رہ گئے، لیکن مٹھی بائی نے اپنی تمام تر توجہ محمد علی جناح کی نگہداشت اور پرورش پر مرکوز کر دی۔

پیش گوئی

مٹھی بائی کے ہاں بعد میں سات اور بچوں نے جنم لیا۔ ان میں تین بیٹے احمد علی، بندے علی اور بچو تھے جبکہ بیٹیوں کے نام مریم، رحمت، فاطمہ اور شیریں بائی رکھے گئے۔ مٹھی بائی ان سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بچوں میں محمد علی جناح کو زیادہ عزیز رکھتیں اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر بہت نام پیدا کرے گا اور کوئی نہ کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عام مائیں اپنے بچوں کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتی رہتی ہیں تو بیجا نہ ہوگا، مگر مٹھی بائی کے یقین کا سبب کچھ اور بھی تھا۔ قائد ابھی چھوٹے ہی تھے کہ کسی ماہر نجوم یا دست شناس نے ان کی والدہ کو بتایا کہ ان کی گود میں پرورش پانے والا بچہ عام بچوں جیسا نہیں بلکہ یہ بڑا ہو کر ایک عظیم شخصیت بنے گا اور ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلائے گا۔ یہ پیش گوئی مٹھی بائی اور جناح بھائی کے دلوں پر نقش ہوگئی اور وہ اکثر گھر میں بھی اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔

اس واقعے کا ثبوت قائد کے چھوٹے بھائی احمد علی جناح کے ایک خط سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے 1947ء میں اپنے بڑے بھائی کو اس وقت تحریر کیا جب پاکستان کی تشکیل میں صرف ایک ماہ باقی رہ گیا تھا اور قائداعظم کے نام کا ڈنکا پوری دنیا میں بج رہا تھا۔ احمد علی جناح نے خط میں جو الفاظ رقم کیے ان کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

''بچپن میں والدین کا یہ کہنا آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ ایک ستارہ شناس کی پیش گوئی کے مطابق آپ ایک نہ ایک روز ہندوستان کے بے تاج بادشاہ بنیں گے۔''

تعلیم اور والدہ

محمد علی جناح کے ہوش سنبھالتے ہی مذکورہ بالا پیش گوئی کی چمک دھندلانے لگی۔ اس صورت حال نے مٹھی بائی کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ محمد علی جناح کی عمر چھ برس ہو چکی تھی، لیکن وہ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں پڑھائی کے سلسلے میں بالکل پھسڈی تھا، پڑھائی لکھائی کے برعکس کھیل کود میں زیادہ دھیان دیتا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت محلے کے بچوں کے ساتھ گھر سے باہر گولیاں، کرکٹ اور گلی ڈنڈا کھیلنے میں گزر جاتا تھا۔ چھ برس کی عمر ہی میں ایک استاد کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ محمد علی جناح کو گجراتی زبان کی تعلیم دے، لیکن محمد علی جناح نے پڑھائی کی طرف بہت ہی کم توجہ دی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نو سال کی عمر میں والدہ کے کہنے پر جناح بھائی نے اپنے بیٹے کو پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا، لیکن بیٹے کو اسکول اور کتابوں میں کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ اس کے باوجود مٹھی بائی نے ہمت نہیں ہاری، وہ اکثر محمد علی کی حوصلہ افزائی کے لئے کہا کرتی تھیں:

''میرا محمد علی ایک روز بہت بڑا آدمی بنے گا۔ وہ دوسرے لڑکوں کی نسبت بہت زیادہ ذہین اور تیز ہوگا''۔

مٹھی بائی اکثر اپنے بیٹے کو نصیحت کیا کرتی تھیں کہ وہ حصول تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دے اور باقاعدگی سے اسکول جایا کرے کیونکہ یہی وہ ایک راستہ ہے جس پر چل کر زندگی میں عظمتیں اور کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں اور صرف تعلیم ہی انسان کو ایک بڑا آدمی بنا سکتی ہے، لیکن محمد علی نے ان پند و نصائح کا بظاہر کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔ آخر کار تنگ آ کر اس کے والد نے ایک روز اس سے دوٹوک بات کی اور ان کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

محمد علی: ''ابا جان! میں اسکول جانا قطعاً پسند نہیں کرتا۔''

جناح بھائی: ''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

محمد علی: ''میں آپ کے ساتھ دفتر میں بیٹھنا پسند کرتا ہوں۔ میں کاروبار کے گر سیکھنا چاہتا ہوں''

جناح بھائی: ''لیکن محمد علی ابھی تم بہت چھوٹے ہو''

محمد علی: ''جناب میں آپ کے دفتر میں اسکول سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہوں۔''

جناح بھائی: ''محمد علی! میرے دفتر میں سخت نظم وضبط کے تحت کام ہوتا ہے۔ تمہیں صبح سویرے آٹھ بجے میرے ہمراہ دفتر جانا ہوگا۔ پھر دو سے چار بجے تک کھانے کے لئے گھر، پھر رات کے نو بجے تک دفتر میں کام کرنا پڑے گا۔''

محمد علی: ''میں یہ سب کرنے کو تیار ہوں۔''

جناح بھائی: ''دیکھ لو! تمہیں کھیلنے کے لئے بھی کوئی وقت نہیں ملے گا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد علی: ''پروانہیں''

اس کے بعد محمد علی جناح اپنے والد کے ساتھ کام پر جانے لگے۔ مٹھی بائی اس دوران بھی اپنے بیٹے کے سنہری مستقبل کے خواب دیکھتی رہیں اور اسے راہ راست پر لانے کی لگاتار کوشش کرتی رہیں۔ آخر دو ماہ کی ریاضت کے بعد محمد علی کا دل کام سے بھر گیا اور ایک بار پھر والد کے ساتھ مکالمے کا آغاز ہوا:

محمد علی: ''ابا جان! مجھے دفتر میں کام کرنا پسند نہیں۔''

جناح بھائی: ''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو محمد علی؟''

محمد علی: میں دوبارہ سکول جانا چاہتا ہوں۔

جناح بھائی: دیکھ بیٹے! زندگی میں کچھ سیکھنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

محمد علی: ''وہ دو طریقے کون کون سے ہیں ابا جان؟''

جناح بھائی: ''ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اپنے بڑوں کی عقل، علم اور تجربے پر بھروسہ کرو اور ان کی نصیحت کو دل سے قبول کر کے اس پر حرف بہ حرف عمل کرو۔''

محمد علی: ''اور دوسرا راستہ کون سا ہے؟''

جناح بھائی: ''دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود قدم قدم پر غلطیاں کرو، زندگی کی ٹھوکریں کھاؤ اور پھر ان سے سبق حاصل کرو۔''

محمد علی جناح نے اپنے والد کی بات بڑے غور سے سنی اور اسکول میں داخلہ لے لیا، مگر داخلے کے کچھ عرصہ بعد جب والد کو محمد علی کی کارکردگی کے بارے میں پتہ چلا تو انہیں اپنے بچے کا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا اور وہ اس کی تعلیم کی جانب سے مایوس ہو گئے۔ محمد علی کے استاد نے بتایا کہ وہ بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن جیومیٹری سے تو وہ مایوس کن حد تک نابلد ہیں۔

اس موقع پر مٹھی بائی نے ایک بار پھر اپنے بیٹے پر یقین کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا:

''تم ذرا انتظار کرو، میرا بیٹا توقعات پر پورا اترے گا اور بے شمار لوگ اس سے رشک وحسد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے لگیں گے۔"

اعلیٰ تعلیم کے لئے والدہ کی شرط

دس برس کی عمر میں جناح بھائی نے محمد علی کو سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کرا دیا۔ اسکول کی یہ تبدیلی بھی محمد علی کے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ اسی دوران قائد کی پھوپھی مان بائی اتفاق سے کراچی آ گئیں۔ مٹھی بائی نے اسے بتایا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ محمد علی کو پھوپھی کے ہمراہ بمبئی بھیج دیا جائے شاید اس تبدیلی سے وہ تعلیم کی طرف راغب ہو سکیں۔ اس طرح پھوپھی قائد کو اپنے ساتھ بمبئی لے گئیں اور وہاں انجمن اسلام سکول میں داخل کرا دیا۔ یہ ترکیب کارگر رہی۔ یہاں قائد نے تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی اور فورتھ گجراتی کا امتحان پاس کر لیا اور انہیں فرسٹ سٹینڈرڈ انگلش کلاس میں داخل مل گیا۔

ادھر ان کی والدہ مٹھی بائی کا بیٹے کی جدائی میں برا حال تھا۔ جب بیٹے کی فرقت نا قابل برداشت ہو گئی تو انہوں نے محمد علی جناح کو واپس بلا بھیجا۔ کراچی واپسی پر محمد علی کو دوبارہ 23 دسمبر 1887ء کو سندھ مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا۔ کراچی میں کئی مرتبہ اسکول تبدیل کرنے کے بعد ایک اسکول ریکارڈ کے مطابق 9 فروری 1891ء کو وہ فورتھ انگلش کے طالبعلم کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس وقت محمد علی جناح کی عمر پندرہ برس ہو چکی تھی۔ اس موقع پر گراہم ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل منیجر نے، جس کے ساتھ جناح بھائی کے تجارتی مراسم تھے مشورہ دیا کہ محمد علی جناح کو لندن میں گراہم ٹریڈنگ کمپنی کے صدر دفتر میں بھیج دیا جائے تاکہ یہ وہاں جا کر بزنس ایڈمنسٹریشن سیکھ سکے۔ مٹھی بائی نے اس فیصلے کو بیٹے کے بہتر مستقبل کے لئے بادل نخواستہ قبول کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگائی کہ لندن جانے سے قبل محمد علی کی شادی کر دی جائے۔ محمد علی نے والدہ کی اس خواہش کا احترام کیا اور اس طرح ان کی شادی خوجہ اسماعیلی خاندان کی ایک لڑکی ایمی بائی سے کر دی گئی۔ جب شادی ہوئی اس وقت محمد علی کی عمر پندرہ برس تھی اور وہ سندھ مدرسہ میں ففتھ انگلش کے طالبعلم تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ولایت کا سفر

سولہ برس کی عمر میں محمد علی جناح نے لندن کے سفر کا آغاز کیا۔ روانگی سے قبل مٹھی بائی نے اپنے لاڈلے بیٹے سے کہا:

''میرے بیٹے! میں تیری جدائی برداشت نہیں کرسکتی، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سفر تمہیں بڑا آدمی بننے میں مدد کرے گا۔ میں اپنی ساری زندگی میں ایک ہی خواب دیکھتی رہی ہوں۔''

''محمد علی! الوداع، خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ انشاء اللہ میری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ تم یقیناً ایک بڑے آدمی بنو گے اور میں تم پر فخر کروں گی''۔

یہ مٹھی بائی کے آخری الفاظ تھے جو انہوں نے محمد علی جناح سے الوداعی ملاقات میں کہے۔

لندن میں چند روز تک کاروباری تربیت کے بعد قائداعظمؒ نے اپنی والدہ کی خواہش کے مطابق عمل کرنے کی طرف دھیان دیا اور بیرسٹر بننے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے داخلے کا امتحان پاس کرنا ضروری تھا۔ دو سال کی سخت محنت کے بعد انہوں نے اس امتحان میں کامیابی حاصل کرلی اور انہیں بار میں داخلے کے لئے بلا لیا گیا۔ اس داخلے کے ساتھ ہی محمد علی جناح نے ہندوستان کے سب سے کم عمر طالبعلم کا اعزاز حاصل کرلیا جسے بار میں داخلہ دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ یہیں سے محمد علی جناح کی عظمت کے اس سفر کا آغاز ہوا جس نے بعد میں انہیں کروڑوں مسلمانوں کا قائداعظم بنا دیا۔

ممتا کا داغ مفارقت

حسن اتفاق کہ ماں کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ قائد کی لندن سے واپسی کا نظارہ ماں کی قسمت میں نہ تھا۔ 1895ء میں محمد علی جناح نے بار ایٹ لاء کا امتحان پاس کرلیا اور اسی سال ان کی عظیم والدہ مٹھی بائی کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ اس طرح مٹھی بائی نے دو سال قبل اپنے بیٹے کو جو الوداع کہی تھی وہ آخری ثابت ہوئی۔ محمد علی جناح کو لندن میں جب والدہ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتقال کی خبر ملی تو ان پر فرطِ غم سے رقت طاری ہو گئی اور وہ ایک کمرے میں گھنٹوں روتے رہے۔

صحبت کا اثر

قائداعظم ؒ کی شخصیت کا تجزیہ کرنے والوں نے برسوں کی عرق ریزی کے بعد جہاں یہ دریافت کیا ہے کہ قائداعظم کی سیاسی عظمت کی تعمیر میں رحمت للعالمین حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے سنہری اصولوں کی روشنی شامل تھی، وہاں اس بات کا سراغ بھی لگایا گیا ہے کہ دورانِ تعلیم سر جان مورلے، ولیم شیکسپیئر، دادا بھائی نوروجی اور گھوپال کرشنا گھوکھلے نے ان کی شخصیت پر دور رس اثرات مرتب کیے، لیکن ان کی شخصیت کے سب ہی تجزیہ کار اس حقیقت پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ محمد علی جناح کی عظیم اور لازوال شخصیت کی بنیاد ایک خاتون نے رکھی اور ان کا نام تھا مٹھی بائی۔

محترمہ مٹھی بائی کی زندگی کے اسی اجمالی سے خاکے سے ان کے کردار کی جو تین نمایاں خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ مذہب سے بھرپور عقیدت

۲۔ خود اعتمادی

۳۔ یقین محکم

قائداعظم کی حیاتِ جاوید پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ان کے مزاج اور کردار میں مندرجہ بالا خصوصیات کی جھلکیاں بڑے واضح انداز میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اور مذہب سے محبت، اپنے آپ پر اعتماد اور اپنے ارادوں اور عزائم کی کامیابی کا اس قدر ریختہ یقین انہیں والدہ کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے لمبے لمبے ہاتھوں والے، نحیف و نزار اور کتابوں سے نفرت کرنے والے بچے کو برصغیر کا نجات دہندہ بنا دیا۔

قائداعظم کی نظر میں ماں کا رشتہ کس قدر محترم تھا، ان کی زندگی میں اس کی بہت سی مثالیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملتی ہیں۔ ایک سولہ سالہ طالب علم سلیم الدین خان نے 17 نومبر 1944ء کو قائداعظم کے نام ایک خط تحریر کیا اور لکھا:

''میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں''۔

سلیم الدین خان نے آگے چل کر لکھا کہ:

''میں جناح، نہرو اور گاندھی کی طرح بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لئے بغرض تعلیم امریکہ جانے کا قصد رکھتا ہوں، لیکن والدہ اس بات کی اجازت نہیں دے رہیں۔''

اس نے خدشہ ظاہر کیا: ''اگر وہ ہندوستان جیسے غلام ملک میں رہا تو بہت جلد احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا''

اس نے یہ تحریر کیا کہ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ کہ اس کے پردادا نے جنگ آزادی کے دوران انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس وفاداری کے صلے میں جاگیر پائی۔

سلیم الدین خان نے لکھا کہ ''وہ اپنے خاندان کے ماتھے سے یہ داغ بھی دھونا چاہتا ہے۔''

آخر میں اس نے قائداعظم سے التجا کی کہ وہ اس کی والدہ کو اس کا موقف مان لینے پر آمادہ کریں۔

قائداعظمؒ نے 13 دسمبر 1944ء کو اس خط کا جواب ارسال کیا اور تحریر فرمایا:

''میں تمہیں اس بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ تم سترہ سال کے ایک نوعمر لڑکے ہو اور یہ تمہاری والدہ اور بزرگوں کا کام ہے کہ وہ تمہارے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کریں اور سوچیں کہ تمہیں ملک سے باہر جانا ہے یا نہیں۔''

تم نے لکھا ہے کہ تمہاری والدہ نہایت عقل مند اور باصلاحیت خاتون ہیں اور جاگیر کا انتظام بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ تمہیں اپنی والدہ پر بھرپور اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے جی علامہ اقبال کی والدہ محترمہ

علامہ اقبالؒ کی والدہ محترمہ دنیا کی وہ عظیم ترین عورت تھی جس نے ایک ایسے مردِ آگاہ کو جنم دیا۔ جس کی تلاطم خیز شاعری نے زوالِ امت کی ہمہ گیر تیرگی میں امید کی روشنی پیدا کی، جوانوں کو عشق وجنون کی لذت سے آشنا کیا۔ محکوم اقوام کو آزادی کے جذبے، نغمے اور ولولے عطاء کیے اور آرزوؤں کا ایک جہانِ تازہ آباد کر دیا۔ اس دانائے روزگار کے علم و فضل اور مشاہدات وتجربات نے مغربی تہذیب وفلسفے کی بنیادیں ہلا دیں اور اسلامی تہذیب کی بنیاد پر پاکستان کا تصور پیش کیا۔ علامہ اقبال کی والدہ محترمہ کے حالات ان کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں مختلف مقامات پر بیان کیے ہیں جنہیں یکجا کر کے اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

••••••••••••••••••••••••

علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کی شادی موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی اور والدہ اقبال کا نام امام بی تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد شیخ نور محمد کے سسرال والے سیالکوٹ ہی میں آ کر آباد ہو گئے۔ امام بی کو سب ''بے جی'' کہتے تھے۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں۔ انہیں صرف نماز ازبر تھی جو باقاعدہ پڑھا کرتی تھیں۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود وہ بڑی سمجھدار، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ برادری کے خاندانی جھگڑوں میں نہایت خوش اسلوبی سے تصفیہ کراتی تھیں اور اپنے حسن سلوک کے باعث محلے کی عورتوں میں بڑی مقبول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھیں۔ گھر داری کا سب انتظام خود کرتیں۔ اکثر مستورات اپنے زیور یا نقدی ان کے پاس امانت رکھواتیں جنہیں وہ علیحدہ علیحدہ سرخ کپڑے کی پوٹلیوں میں باندھ کر سنبھالتی تھیں۔

بے جی کی سب سے نمایاں خصوصیت غرباء کی امداد کرنا تھی۔ کئی حاجت مند خواتین کو خفیہ طور پر نقدی دیتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد مذاق میں ایسی امداد کو ''گپت دان'' کہا کرتے تھے۔ اور جب رخصت پر گھر آتے تو انہیں ''گپت دان'' کے لئے علیحدہ رقم دیا کرتے تھے۔ امداد کرنے کا ایک اور طریقہ ان کا یہ تھا کہ محلے کے غریب گھرانوں کی دس بارہ سال کی تین چار بچیاں اپنے ہاں لے آتیں اور ان کی کفیل ہو جاتیں۔ بچیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں اور بے جی کی بہو بیٹیوں سے قرآن مجید، نماز، معمولی دینی تعلیم، اردو لکھنا پڑھنا، کھانا پکانا اور سینا پرونا سیکھتیں، کچھ مدت بعد مناسب رشتہ تلاش کر کے ان کا بیاہ کر دیتیں۔ جتنا عرصہ وہ ان کی تحویل میں رہتیں، ان کی دیکھ بھال ایسے ہی کرتیں جیسے اپنی بیٹیوں کی۔ اور شادی کے وقت بھی انہیں بیٹیوں کی طرح رخصت کرتیں۔ شادی کے بعد وہ لڑکیاں ان کے ہاں اسی طرح آتیں، جس طرح بیٹیاں میکے آتی ہیں۔

ان کے جذبہ ایثار کا ایک واقعہ شیخ اعجاز احمد کے بقول یہ ہے کہ میاں جی (شیخ نور محمد) کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد کے ہاں لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ ان کی بیوی کو بیٹے کی خواہش تھی۔ دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بار دونوں کی بیویاں امید سے ہوئیں۔ اس مرتبہ بے جی کو اللہ نے لڑکا دیا اور دیور کی بیوی کے ہاں پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ ان کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے بے جی نے ان سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دیدو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہو گیا۔ بے جی نے لڑکی پالنا شروع کر دیا اور ان کی دیورانی نے لڑکے کو۔ چند ماہ بعد ایک دن صبح کے وقت دونوں گھر کے کام کاج میں مصروف تھیں، بے جی نے لڑکے کے متعلق پوچھا تو ان کی دیورانی نے کہا کہ دودھ پی کر سو گیا ہے۔ جب خاصی دیر ہو گی اور بچہ بیدار نہ ہوا تو جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ مر چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر دودھ لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد بے جی نے لڑکی دیورانی کو لوٹا دی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیخ نور محمد کی اولاد کل سات تھی۔ سب سے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد 1859ء میں پیدا ہوئے تھے جب میاں جی کی عمر تیئس برس تھی۔ ان کے بعد دو بیٹیاں فاطمہ بی اور طالع بی پیدا ہوئیں۔ اس دوران ایک لڑکا بھی ہوا جو چند ماہ بعد فوت ہو گیا۔ اقبال کی پیدائش کے وقت میاں جی کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔ ان کے بعد دو بیٹیاں کریم بی اور زینب بی پیدا ہوئیں۔ جوں جوں اولاد بڑھتی گئی، میاں جی ضرورت کے مطابق جدی مکان کو کشادہ کرتے چلے گئے۔

نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

شیخ عطا محمد کی دوسری شادی کے وقت اقبال پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی بھاوج بیان کرتی ہیں کہ اقبال کو شعروں سے بڑی مناسبت تھی۔ ان کی آواز بھی نہایت شیریں تھی۔ وہ بازار سے منظوم قصے خرید لاتے اور گھر کی عورتوں کو خوش الحانی سے پڑھ کر سناتے۔ اسی طرح ان کا بیان ہے کہ اقبال چھوٹی عمر ہی سے بے حد ذہین تھے، پڑھائی کا بڑا شوق تھا اور سخت محنت کرتے تھے، یہاں تک کہ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب بے جی کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ اقبال لیمپ کے پاس بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ بے جی نے انہیں دو تین مرتبہ پکارا، لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ پھر انہوں نے اٹھ کر بیٹے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ سو جاؤ۔ اقبال نے اونگھتے ہوئے جواب دیا: ''بے جی! سویا ہوا ہی تو ہوں۔'' وہ پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔

اقبال کے لڑکپن کے زمانے میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے باہر تعینات تھے۔ گو ان کی اہلیہ سیالکوٹ ہی میں رہتی تھیں۔ شیخ نور محمد کے خاندان میں دو بچیوں یعنی کریم بی اور زینب بی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ گھر میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ ظاہر ہے اقبال زندگی کے اس دور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اپنے والدین کی توجہ کا مرکز تھے۔ وہ ماں سے بے حد محبت کرتے تھے اور باپ سے انہیں جس قسم کی تربیت ملی، اس کے متعلق دو واقعات کی تفصیل تو اقبال کے اپنے الفاظ میں ہم تک پہنچی ہے۔ پہلے واقعے کا ذکر عبدالمجید سالک اور عطیہ فیضی کی کتب میں موجود ہے، جبکہ دوسرا واقعہ اقبال نے رموز بے خودی میں نظم کیا ہے۔ ''ذکر اقبال'' میں سالک لکھتے ہیں کہ انہیں اقبال نے خود بتایا:

''جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا، جو آدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا، لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد صاحب کے پاس پہنچا تا کہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔''

والدہ صاحبہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد صاحب انہیں اپنا ایک رویا سنا رہے تھے جو رات انہوں نے بحالت بیداری دیکھا تھا۔ والد صاحب نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے، لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لئے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگہ منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ چند گھنٹوں میں تانگہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور بااثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے تھے۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب سامنے آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔''

''سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے، تاہم وہ مرعوبیت کے عالم میں انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد صاحب مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ اس کی حالت بہت خراب ہے اور اس کے بعض اعضا اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد صاحب نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضا پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسے شفا حاصل ہوگی۔ اس وقت نہ مجھے یقین آیا اور نہ مریض کے لواحقین نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی، لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ یہ صحت یاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد صاحب کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جسے والد صاحب نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔"

☆☆☆

27 جولائی 1908ء کو یورپ میں تین سالہ قیام کے بعد اقبال لاہور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر احباب نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہاں سے بھاٹی دروازے کے باہر بلدیہ کے باغ میں آئے جہاں شیخ گلاب دین نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ اس تقریب میں کوئی ڈیڑھ سو کے قریب احباب شریک ہوئے۔ سر محمد شفیع نے ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تقریر کی۔ مولانا حامد حسن قادری، اللہ یار جوگی، منشی غلام علی خان غلامی، منشی نذر محمد اور بدرالدین قیصری نے ان کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں۔

اس تقریب سے فراغت کے بعد اسی دن شام کی گاڑی سے اقبال سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ وہاں بھی ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اقبال کے والد، بھائی اور دیگر عزیز و اقارب موجود تھے۔ ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے کہ اقبال کا چہرہ پھولوں میں چھپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن سے نکل کر گھر پہنچے اور اپنی ماں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ جو گزشتہ تین سال سے ان کے لئے چشم براہ تھیں، لپٹ گئے۔

اقبال کی والدہ کا انتقال 9 نومبر 1914ء کو ہوا اور انہیں امام صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ تب اقبال اگرچہ پورے سینتیس برس کی عمر کے تھے (اتفاق سے 9 نومبر ان کا یوم ولادت بھی تھا) مگر انہوں نے ماں کی موت کو اس بچے کی طرح محسوس کیا جو ابھی ابھی سن تمیز کو پہنچا ہو یا جس میں ماں کی محبت کا شعور ابھی ابھی پیدا ہوا ہو۔ اقبال اپنی ماں کے پرستار تھے۔ دراصل ماں ہی کی کشش انہیں تعطیلات میں سیالکوٹ لے جاتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں سیالکوٹ والے گھر کے زنانے میں دوپہر کے کھانے سے پہلے یا بعد روزانہ محفل جمتی تھی جس میں بے جی، اقبال کی بہنیں اور بھاوج شریک ہوتیں، اقبال ان سب کے ساتھ تختوں کے فرش پر بیٹھ جاتے اور محلے بھر کے قصے یا برادری کے جھگڑے بڑے شوق سے سنتے۔ مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلتی رہتی اور بعض اوقات ماں سے پوچھتے کہ بے جی فلاں ساس بہو کی لڑائی میں آپ نے کیسے صلح کرائی۔ رات کے کھانے کے بعد البتہ میاں جی کے پاس بیٹھتے اور گفتگو کا رنگ علمی ہوتا۔ دراصل ماں کے ساتھ ان کے بچپن کی ساری یادیں وابستہ تھیں۔ اس لئے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ کئی دن تک دل گرفتہ رہے۔

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ جب وہ تعزیت کے لئے گئے تو دیر تک والدہ محترمہ کی خوبیاں بیان کر کے آبدیدہ ہوتے رہے۔ کہتے تھے کہ جب میں سیالکوٹ جاتا تھا اور والدہ صاحبہ شگفتہ ہو کر فرماتیں: ''میرا بالی آگیا'' تو میں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک ننھا سا بچہ سمجھنے لگتا۔

اقبالؒ نے اپنی والدہ کی وفات کے حوالے سے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:

''آہ انسان اپنی کمزوری کو چھپانے میں کس قدر تاک ہے، بے بسی کا نام صبر رکھتا ہے اور پھر اس صبر کو اپنی ہمت و استقلال کی طرف منسوب کرتا ہے، مگر اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لئے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔ دنیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں، کسی طرح میں ان تک پہنچ جاؤں۔"

اکبر الہ آبادی نے تعزیت کرتے ہوئے فرمایا۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوق معرفت
یہ طریق دوستی ، خود داری با تمکنت!
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے ، اہل دل تھے ، صاحب اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہیں کا ہے یہ فیض تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت
مادر مرحومہ اقبال جنت کو گئیں!
چشم تر ہے آنسوؤں سے، قلب ہے اندوہ گیں
رکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے
سال رحلت کا یہاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومہ ملت تھیں وہ نیکو صفات
رحلت مخدومہ سے پیدا ہے تاریخ وفات

1333ھ

اور مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات لکھا جو آج بھی والدہ اقبال کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادر مرحومہ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر با دل پر درد و غم
رحلت مخدومہ تاریخ وفات

1333ھ

راقم نے شیخ نور محمد کو بہت ضعیف عمر میں دیکھا ہے جب ان کی بصارت جواب دے چکی تھی اور وہ کمرے کی تنہائی میں اپنے پلنگ پر گم صم بیٹھے رہتے تھے۔ دراصل تنہائی کا احساس تو انہیں پندرہ سولہ برس پیشتر والدہ اقبال کی وفات پر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بے جی کی وفات کا صدمہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ وہ شاعر تو نہ تھے مگر اس صدمے کے زیر اثر انہوں نے ایک دن اعجاز احمد سے کاغذ اور قلم دوات لانے کے لئے کہا۔ اعجاز احمد سمجھے کہ شاید اقبال کو خط لکھوائیں گے، فرمایا کہ جو کچھ بولتا ہوں لکھتے جاؤ اور پھر اس کاغذ کو اپنے چچا کے پاس بھیج دو۔ میاں جی سوچ سوچ کر شعر لکھواتے جاتے تھے اور دو تین نشستوں میں دس بارہ شعر قلمبند کرائے۔ ان اشعار میں سے ایک شعر شیخ اعجاز احمد نے نقل کرایا ہے۔

یہ تنہا زندگی پیری میں نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا، نہ کوئی رازداں اپنا

اشعار اقبال کو بھیج دیے گئے جنہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کاتب سے خوش خط لکھوا کر میاں جی کو ارسال کر دی۔ ویسے بھی اقبال کی جو تصانیف میاں جی کی زندگی میں شائع ہوئیں، وہ ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

☆☆☆

اقبال کی والدہ نے ان کی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ ایک نہایت اچھی منتظم تھیں اور اقبال ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ گھر میں ان کی موجودگی اقبال کے سیالکوٹ آنے کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باعث کشش تھی۔ جب یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو پہروں ان کے خط کے انتظار میں بیٹھا کرتیں۔ ان کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ کہا، اس میں تحریر ہے۔

خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

اپنے بڑے بھائی سے، جن کی اعانت سے اقبال نے اپنی تعلیم کے مراحل طے کیے، انہیں بے حد محبت تھی۔ شیخ عطا محمد قد آور، مضبوط جسم اور بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت کے سخت تھے، مگر دل کے صاف۔ انہیں جتنی جلدی غصہ چڑھتا اتنی جلدی اتر بھی جاتا۔ فوجی ملازمت ان کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ وہ ہمیشہ مغربی لباس زیب تن کرتے، لیکن سر پر موتیایا سیاہ رنگ کی لنگی باندھتے، ہاتھ میں ہنٹر رکھتے، بہت خوش پوش تھے اور گھر میں ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ اقبال ''التجائے مسافر'' میں ان کا متعلق ارشاد کرتے ہیں۔

وہ میرا یوسف ثانی، وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جان جاں مجھ کو

اور اپنی والدہ کی وفات پر کہے گئے مذکورہ مرثیہ میں وہ اپنے برادر اکبر کو ''صورت سرو بلند''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ہم پہلو مرا'' اور ''محبت میں تری تصویر'' کہتے ہیں۔ اور پھر بڑے درد سے والدہ کے حضور میں جذبہ دل کا اظہار کرتے ہیں۔

تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

اور اس طویل نظم کے آخری شعر میں اقبال نے جو ''شبنم افشانی'' کی ہے وہ تو زبان زد خاص و عام ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گل کی نگہبانی کرے

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماں بی رقیہ بیگم

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بیسویں صدی میں الحاد، اشتراکیت اور مغربی تہذیب کے خلاف اسلام کا سب سے مضبوط حصار تعمیر کیا اور نوجوانوں میں اسلام کی روح اور ایسے جذبے پیدا ئے کہ اسلامی شعور اور اخلاق وسیرت کی بنیاد پر مسلمانوں میں ایک زبردست تحریک اٹھی۔ اس تحریک کے نتیجے میں جماعت اسلامی جیسی بڑی اور مضبوط فعال مذہبی وسیاسی جماعت وجود میں آئی۔ مولانا مودودی کی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے والے ان کے پیروکار دنیا بھر میں موجود ہیں۔ اس عظیم رہنما نے جس خاتون کی آغوش میں تربیت پائی۔ بلاشبہ وہ دنیا کی عظیم ترین خاتون تھی جس نے مولانا مودودی کو جنم دیا۔ اور پھر اُنہیں ایسی تربیت دی جو مسلمانوں کیلئے ایک روشن مثال بن گئی۔ اس عظیم خاتون کے حالات طالب ہاشمی نے بڑے موثر پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ جس سے مولانا مودودی کی والدہ محترمہ کی تصویر سامنے آتی ہے۔

••••••••••••••••••••••••••

مرزا غالب کے ہم عصر نامور شاعر اور صاحب قلم مرزا قربان علی بیگ سالک کی دختر نیک اختر رقیہ بیگم، سید احمد حسن مودودیؒ کی اہلیہ اور ادیب شہیر سید ابوالخیر مودودیؒ اور صاحب تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ نہایت سادہ مزاج مخیر، فیاض، نیک دل، اور دیندار خاتون تھیں۔ 1872ء میں پیدا ہوئیں۔ سید احمد حسن مودودیؒ سے ان کی شادی انیسویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں ہوئی۔ اس وقت وہ نوجوان تھیں جبکہ سید احمد حسنؒ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چند سال پہلے ان کی اہلیہ امتہ الحبیب وفات پا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین بچے چھوڑے تھے...... عصمت خاتون، ابو محمد اور ابوالقاسم۔ بی بی رقیہ بیگم، سید احمد حسنؒ کی دوسری بیوی تھیں مگر انہوں نے سوتیلے بچوں کو حقیقی ماں کا پیار دیا اور ان سے ایسا مثالی برتاؤ کیا کہ کوئی ناواقف یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ ان بچوں کی سوتیلی ماں ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا بیان ہے:

''ہم دونوں بھائیوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں ہم سوتیلے رشتے کے تصور سے نا آشنا تھے۔ بڑے بھائیوں اور بہن کے ساتھ ہمارے تعلقات کو دیکھ کر کسی کو بھی یہ گمان نہ ہوسکتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی سوتیلا رشتہ ہے۔''

بی بی رقیہ بیگم کے اجداد مغل سلطنت کے اعلیٰ فوجی مناصب پر فائز رہے تھے۔ ان کے والدین بھی رئیسانہ شان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو علم وادب اور دین سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت بہت عمدگی سے کی اور ان کی دینی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ یہی سبب تھا کہ بی بی رقیہ بیگم میں گہرا دینی شعور پیدا ہوگیا اور وہ بچپن ہی سے صوم وصلواۃ کی پابند ہوگئیں۔ ان کے والدین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) سے بیعت تھے۔ بی بی رقیہ بیگم بھی نو سال کی عمر میں ان کے دامن ارادت سے وابستہ ہوگئیں۔

شادی کے بعد بی بی رقیہ بیگم کو بڑی مشکل صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ یوں کہ شوہر سید احمد حسنؒ کی طبیعت میں بلا کا غصہ تھا۔ کھانا کھانے بیٹھتے تو ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتے۔ نمک مرچ میں کمی بیشی ہوجاتی تو ان کا غصہ بھڑک اٹھتا۔ بی بی رقیہ بیگم شوہر کے مزاج کو سمجھ گئیں۔ وہ نہایت احتیاط سے خود کھانا تیار کرتیں اور اس بات کا خاص خیال رکھتیں کہ کوئی چیز شوہر کی طبیعت کے خلاف نہ ہو، گویا آہن کو موم کرنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ یہی لیل ونہار تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلا فرزند عطا کیا جس کا نام ''ابوالخیر'' رکھا گیا۔ اماں بی انہیں پیار سے ''خیرو'' کہا کرتی تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

25 ستمبر 1903ء (3 رجب 1321ھ) کو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے فرزند سے نوازا...... یہ تھے ''ابوالاعلیٰ''...... اماں بی ان کو پیار سے ساری عمر ''منا'' ہی کہتی رہیں۔ اس زمانے میں سید احمد حسنؒ کا قیام اورنگ آباد (دکن) میں تھا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش کے کوئی ایک سال بعد انہوں نے وکالت ترک کر دی، گھر کا تمام اثاثہ اللہ کی راہ میں دے دیا اور اورنگ آباد چھوڑ کر دلی جا بسے۔ چند سال پہلے وہ اپنے رشتے کے چچا مولوی محی الدین خاںؒ کی بیعت کر چکے تھے۔ مولوی صاحب تھے تو میر عدل، مگر بڑے عبادت گزار اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کی فیض صحبت سے سید احمد حسنؒ بھی ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کی طرف راغب ہو گئے تھے، لیکن ساتھ ساتھ وکالت بھی جاری تھی، اب دلی پہنچ کر انہوں نے علائق دنیا سے قطع تعلق کر لیا اور دلی سے کچھ فاصلے پر عرب سرائے میں ڈیرہ جما لیا۔ پھر وہاں تین ساڑھے تین سال اس حال میں گزرے کہ زندگی کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے خشک روٹی، ابلے ہوئے ساگ کے ساتھ کھا لیتے تھے۔ باقی دنیا کی کسی چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ دن رات عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ مرشد گرامی کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انہوں نے اورنگ آباد بلا کر نصیحت کی کہ اپنے رب سے لو لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کی ذمہ داریوں سے یکسر منہ موڑ لیا جائے، چنانچہ انہوں نے واپس آ کر پھر وکالت شروع کر دی، مگر اس طرح کہ کبھی کسی جھوٹے مقدمے کی پیروی نہ کرتے۔ صرف وہی مقدمہ ہاتھ میں لیتے جس کے بارے میں پورا اطمینان ہوتا کہ اس میں جھوٹ کی ذرہ برابر بھی آمیزش نہیں۔ اس مومنانہ اور محتاط طرز عمل کا اثر ان کی آمدنی پر پڑا، لیکن انہوں نے سادگی اور قناعت کی جو روش برضا و رغبت اختیار کی، مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔

زندگی کے ان سارے مراحل میں اماں بی نے اپنے شوہر کا پورا پورا ساتھ دیا اور ہر حالت پر قانع رہیں۔ وہ فطرتاً بڑی سادہ مزاج تھیں۔ ان کو زیور کا شوق تھا نہ رنگ برنگ قیمتی کپڑے پہننے کا۔ سفید لٹھے کا پاجامہ، سفید ململ کا کرتا اور سفید ململ کا دوپٹہ، یہی ساری عمر ان کا پہناوا رہا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بتایا کرتے تھے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ہم نے کبھی ان کو زیور یا رنگین لباس پہنے نہیں دیکھا اور والد مرحوم کی زندگی میں بھی ان کی یہی روش تھی۔''

اماں بی کا معمول تھا کہ جب ان کو گھر کے خرچ کے لئے کوئی رقم دی جاتی تو وہ فوراً پھل، مٹھائی یا کوئی دوسری چیز منگواتیں اور محلے کے غریب اور حاجت مند گھروں کو بھجواتیں۔ اس کے بعد باقی رقم اپنے کام میں لاتیں۔ گھر میں خوشحالی کا دور دورہ بھی رہا اور عسرت کے دن بھی آئے، مگر ملازمین کے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ نہایت مشفقانہ رہا۔ کھانا پہلے ان کو دیتیں، پھر خود کھاتیں۔ بعض اوقات سالن ختم ہو جاتا، لیکن وہ پتیلی پونچھ کر ہی گزارہ کر لیتیں۔ روٹی وغیرہ تو خادمہ پکا لیتی، مگر سالن وہ ہمیشہ خود پکاتی تھیں۔ اس میں میاں کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتیں۔

سلیقہ شعاری میں وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک رات چند مہمان آگئے۔ گرم گرم کھانا ان کے سامنے رکھا گیا اور پھر جب تک وہ کھاتے رہے، گرم گرم روٹیاں برابر اندر سے آتی رہیں۔ اس وقت گھر میں خادمہ بھی موجود نہیں تھی۔ سید ابوالاعلیٰ'' کو حیرت ہوئی کہ اتنی ڈھیر ساری گرم روٹیاں کیسے آرہی ہیں۔ اندر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اماں بی نے ایک بڑے گھڑے کو توڑ کر اس کا پیندا چولھے پر رکھا ہوا ہے اور اسے توا بنا کر بیک وقت تین چار روٹیاں اس پر ڈال کر پکاتی جا رہی ہیں۔

ایک اور موقع پر اچانک رات کو مہمان آگئے اور آتے ہی انہوں نے چائے کی فرمائش کی۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں چائے کی پتی موجود نہ تھی۔ سید ابوالاعلیٰ نے والدہ سے چائے کے لئے کہا تو معلوم ہوا کہ پتی بالکل ختم ہے، تاہم والدہ نے ان سے کہا کہ تم فکر نہ کرو، چائے مہمانوں کو مل جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے نہایت عمدہ چائے تیار کر کے بھیج دی۔ مہمان چائے پی کر خوش ہو گئے۔ بعد میں تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ صحن میں موجود سرکنڈوں کے جس چھپر کے نیچے کھانا پکایا جاتا تھا، اماں بی نے اس کی دھواں دھار چھال اتار کر ململ کے کپڑے کی پوٹلی بنائی اور دار چینی ملا کر دودھ اور پانی کے آمیزے میں ڈال دی۔ اس طرح بسکٹی رنگ کی لذیذ چائے تیار ہو گی۔

اماں بی کی زندگی کا ایک تابناک پہلو ان کا ذوق عبادت تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر پہلے نماز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھتیں اور پھر کم از کم ایک پارے کی تلاوت بلند آواز سے کرتیں۔ چلّے کاٹنے کی بھی عادت تھی۔ بعض دفعہ کسی بزرگ کے مزار پر جا کر دیر تک قرآن خوانی کرتی رہتیں۔ اولیاء اللہ سے ان کو بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ نماز روزے کی اخیر دم تک سخت پابند رہیں اور اوراد و وظائف بھی کبھی ترک نہ ہونے دیے۔ راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر عبادت کیا کرتی تھیں۔

سید احمد حسن ؒ 1920ء میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے بیوگی کے 37 سال نہایت صبر و استقامت اور مومنانہ ضبط و وقار کے ساتھ اپنے بیٹوں کے پاس گزارے۔ فیاضی یا دریا دلی، خدمت خلق، سادگی، قناعت، درس و تدریس، تبلیغ دین، صبر، حوصلہ اور شگفتہ مزاجی ان کی کتاب سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک بار یہ واقعہ بیان کیا کہ جب ہم حیدر آباد میں تھے، ایک دفعہ ہمارے مکان کے سامنے سے چھ سات گدھے گزرے جن پر خربوزے لدے ہوئے تھے۔ والدہ صاحبہ نے گدھوں کے مالک سے معاملہ طے کر کے تمام خربوزے خرید لئے اور گھر میں ڈھیر لگوا کر محلے میں بانٹنے شروع کر دیے یہاں تک کہ محلے کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں اس دن خربوزے نہ پہنچ گئے ہوں۔ اسی طرح ان کے ہاں کوئی خاص چیز پکتی تو جب تک اڑوس پڑوس کے گھروں کو اس میں سے بھیج نہ لیتیں، خود نہ کھاتیں۔

ایک مرتبہ اپنے کسی ملنے والے کے بارے میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ مقروض ہیں، مگر تنگدستی کی وجہ سے قرض واپس نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف قرض خواہ قرض کی واپسی کا شدید تقاضا کر رہا ہے۔ اماں بی فوراً ان کے پاس گئیں اور چپکے سے ان کو اتنی رقم دے دی جس سے وہ قرض ادا کر سکتے تھے۔

وہ غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد پر ہر وقت کمر بستہ رہتی تھیں۔ ان لوگوں کی خدمت کر کے ان کو دلی مسرت ہوتی۔ اگر کبھی وہ خالی ہاتھ ہوتیں اور کوئی حاجت مند ان کے پاس پہنچ جاتا تو کسی سے قرض لے کر بھی اس کی ضرورت پوری کر دیتیں۔ سید احمد حسن ؒ کی زندگی میں ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے پاس محلے اور دور و نزدیک کی حاجت مند خواتین کا میلہ لگا رہتا تھا۔ وہ ہر ایک کی حاجت پوری کرتیں اور کسی کو خالی ہاتھ واپس نہ بھیجتیں۔

سادگی کا یہ عالم تھا کہ فاخرہ لباس سے ہمیشہ نفور رہیں۔ زندگی کے آخری دس پندرہ برسوں میں تو وہ نئے کپڑوں سے بالکل اجتناب کرنے لگی تھیں۔ فرماتی تھیں مجھے نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے، میں تو چند دن کی مہمان ہوں، آج گئی کہ کل گئی۔

طبیعت پر قناعت کا اس قدر غلبہ تھا کہ تھوڑی سے تھوڑی اور معمولی سے معمولی چیز سے مطمئن اور راضی ہو جاتی تھیں۔ کبھی کسی عمدہ یا زیادہ چیز کی خواہش نہ کرتیں۔ اگر کبھی ان کے لئے بطور خاص کوئی اچھی چیز مہیا کی جاتی تو خوش ہونے کے بجائے آزردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ جب سب لوگ کھانا کھا چکتے تو وہ ہنڈیا سے بچا کھچا سالن لے کر روٹی کھا لیتیں۔ پر تکلف غذاؤں سے مطلق کوئی رغبت نہ تھی۔

1944ء میں اماں بی مستقل طور پر مولانا سید ابوالاعلیٰؒ کے پاس دارالاسلام (پٹھان کوٹ، ضلع گورداس پور) میں آ گئیں تو ان کی خواہش پر ایک الگ مکان مولانا کے مکان کے سامنے ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ انہوں نے ایک تو اس میں گھر باڑی کا اچھا خاصا انتظام کر لیا، دوسرے اسے قرآن حکیم کی تعلیم کا مکتب بنا دیا۔ اس مکتب میں دارالاسلام کی بچیوں کے علاوہ سرنا، جمالپور اور دوسری نواحی بستیوں کی بچیاں بھی پڑھنے کے لئے آتی تھیں۔ اماں بی ان بستیوں میں وقتاً فوقتاً خود بھی نکل جاتیں اور لوگوں کے گھروں پر جا کر خواتین کو دین کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلاتیں اور بچیوں کو پیار اور محبت سے جمع کر کے اپنے مکتب کی شاگرد بناتیں۔ قرآن کریم کی تعلیم دینے کا شوق انہیں عمر بھر رہا۔ حیدر آباد، دارالاسلام، پٹھان کوٹ، لاہور جہاں بھی رہیں، ہمسایوں کی بچیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتی رہیں اور ساتھ ہی ان کی تربیت و تادیب کا خیال بھی رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ اہل خاندان کے ساتھ لاہور آ گئیں، یہاں وہ اکثر و بیشتر بڑے بیٹے سید ابوالخیر کے مکان میں رہیں۔ اس مکان کے آس پاس کے مکانات کی خواتین اور بچیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لئے اماں بی کی ذات نعمت عظیم ثابت ہوئی کیونکہ ان کی بدولت وہ قرآن پاک کی نعمت سے مالا مال ہوگئیں۔ کبھی کبھی وہ حیدر آباد کا خاص پکوان ''کڑیا پاتھ'' پکواتیں اور اس میں سے پڑوسیوں کو التزام کے ساتھ حصہ بھجواتیں۔ ہر سال ایک مرتبہ ''شب دیگ'' پکوانے کا بھی معمول تھا۔ اس میں بھی جب تک پڑوسیوں اور بیٹوں کے احباب اور رفقاء کو شریک نہ کرلیتیں، انہیں کھانے میں مزہ نہ آتا۔

1953ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ ؒ کو'' قادیانی مسئلہ '' کے سلسلے میں فوجی عدالت نے موت کی سزا سنائی تو اماں بی نے کمال صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔ جناب اخلاق احمد دہلوی راوی ہیں کہ..... '' اس زمانے میں اماں بی، سید ابوالخیر اور ان کے ایک خالہ زاد بھائی ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ اماں بی کے یہ بھانجے اپنی خالہ اماں سے بہت جلے کٹے رہتے تھے۔ انہوں نے باہر سے آ کر یہ خبر بڑی بے دردی سے اماں بی کو ان الفاظ میں سنائی: '' خالہ! منے کو سزائے موت سنا دی گئی۔''

اماں بی اس وقت دستر خوان پر بیٹھی میری بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ یہ کہہ کر برابر کھانے میں مشغول رہیں کہ اللہ کا مال ہے جس طرح چاہے لے لے...... جب وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے تو میں نے کہا:

'' آپ اس خبر دہشت اثر کے بعد کھانا کیسے کھاتی رہیں!'' انہوں نے فرمایا: '' یہی تو وہ بدبخت چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ جائے۔''

اماں بی کو ان کے پوتوں پوتیوں بلکہ ان کے دوسرے اہل خاندان نے بھی ان کی کبر سنی کی وجہ سے دادی اماں کے خطاب سے معروف کر رکھا تھا۔ جب کسی کے منہ سے دادی اماں کا لفظ نکلتا تو سننے والوں کے ذہن میں انہیں کی شخصیت جھلک جاتی تھی۔ اڑوس پڑوس کی خواتین بھی انہیں دادی اماں کے لقب سے یاد کرتی تھیں۔

اماں بی کی زندگی کا ایک خاص پہلو ان کی شگفتہ مزاجی تھی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک قریبی رفیق مولانا خلیل حامدی بیان کرتے ہیں:

"دادی اماں بہت ملنسار اور خوش مزاج تھیں ان کا دائرہ تعلقات بہت وسیع تھا اور جو بھی ان سے ملتا تھا وہ بہت جلد ان سے مانوس ہو جاتا۔ ان کے منہ بولے بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں، بھانجیوں، کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ خود بھی وہ ان کا شمار نہ بتا سکتی تھیں۔ بچے ہمیشہ ان کے ساتھ لگے رہتے اور وہ طرح طرح کی دلچسپ باتوں سے ان کا دل بھی خوش کرتیں اور اپنا بھی۔ آخری زمانے میں ضعیفی اور بیماری کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑا پن پیدا نہ ہوا۔ غفلت میں پڑے پڑے جب ذرا ہوش آ جاتا تو کوئی نہ کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات کر دیتی تھیں۔ رنجیدہ ہونا اور رنجیدہ کرنا ان کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والا اپنے اندر ایک عجیب انبساط محسوس کرتا تھا۔ جو عورتیں دیر کے بعد ان سے ملتیں، ان سے وہ شاکی رہتی تھیں۔"

(روزنامہ "تسنیم" 7 دسمبر 1757ء)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بیٹے محمد فاروق مودودی اپنی دادی جان کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ بہت ہی درویش صفت خاتون تھیں۔ ایک ایسی خاتون جن کی دنیا کی کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی ہم نے نہ دیکھی۔ وظیفوں اور نماز میں مصروف رہتیں۔ بڑی شاکر اور خوش خلق تھیں۔ ایک چیز جو ہم نے ہمیشہ محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا۔ دوسری بات ان کی یہ تھی کہ انہیں خود پر حد درجہ اعتماد تھا۔ ان کی ایک وضع یہ تھی کہ اگر آپ ان سے خود بات کریں تو بہت اچھی طرح جواب دیتی تھیں، البتہ باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ عام خواتین کی مانند وہ باتونی نہ تھیں، لیکن اگر کوئی بات کرتا تو ان کے جواب میں ایک خاص قسم کا وزن ہوتا۔ ان کی گفتگو کے طریقے اور باوزن گفتگو کے باعث چاہے وہ کسی بھی مجلس میں ہوتیں، میر مجلس وہی ہوا کرتی تھیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ بڑی رحم دل اور بہت ہی مخیر خدا ترس خاتون تھیں۔ ہر شخص کی اپنی استعداد سے بڑھ کر مدد کیا کرتیں۔ جب بھی کوئی آتا، دادی اماں کے پاس جاتا اس کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری ہوتا اور وہ اس سے مل کر بڑی خوش ہوتیں۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھی ہوتیں تو ان کی شخصیت کا وزن ہر جگہ محسوس ہوتا تھا۔ ہم نے اپنی والدہ کو بھی ان کا انتہائی احترام اور انتہائی عزت اور ان سے انتہائی محبت کرتے دیکھا۔ خود ابا جان کو ان کے معاملے میں بے حد تعظیم اور بے حد عزت و محبت کا سلوک کرتے دیکھا۔ جب وہ کہیں دورے سے واپس آتے تو سب سے پہلے دادی اماں کے پاس جاتے، جیل سے آتے تو بھی سب سے پہلے دادی اماں کے پاس جاتے۔"

("قومی ڈائجسٹ"......جنوری 1980ء)

مولانا خلیل حامدی لکھتے ہیں:

"مولانا (سید ابوالاعلیٰ مودودی) کے گھر میں ساس بہو کی کشمکش کبھی نہیں پائی گئی۔ سوتیلی اور سگی سب بہوؤں سے دادی اماں کا برتاؤ اپنی بیٹیوں کا سا رہا۔ مولانا کے والد مرحوم کے بعد دادی اماں نے اپنے آپ کو گھر کے انتظام سے بالکل بے تعلق کر لیا تھا۔ ان کی بہوئیں ان کے بیٹوں کے گھر کی مختار رہیں۔ اس وجہ سے کبھی ساس اور بہوؤں کے درمیان کشمکش پیدا نہیں ہوئی۔"

(روزنامہ تسنیم لاہور۔ 7 دسمبر 1957ء)

اماں بی کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ چھوٹے موٹے عوارض کو بڑھاپے کے زمانے میں بھی خاطر میں نہ لاتیں۔ اور معمول کے مطابق چلتی پھرتی رہتیں۔ پرہیزی غذاؤں سے انہیں زندگی بھر نفور رہا۔

نومبر 1957ء میں اماں بی کو اسہال کی شکایت ہوگئی۔ اس تکلیف نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ صاحب فراش ہوگئیں۔ علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی، مگر چنداں آفاقہ نہ ہوا۔ شدت علالت میں ایک دن مولانا ابوالاعلیٰ حکیم محمد شریف صاحب کو لے کر آئے اور انہیں بتایا کہ حکیم شریف صاحب آئے ہیں۔ برجستہ جواب دیا: "نہ بیٹا نہ، اب نہ کسی شریف کی ضرورت ہے نہ کسی بدمعاش کی، اب تو دم رخصت ہے۔ 5 دسمبر کی صبح سے بی اماں کی تکلیف بہت بڑھ گئی اور نظام ہضم نے بالکل جواب دے دیا۔ 5 اور 6 دسمبر 1957ء کی درمیانی شب کو دو بجے اس عظیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاتون نے 58 برس کی عمر میں پیک اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

وفات کے وقت وہ اپنے بڑے فرزند مولانا ابوالخیر مودودی" کے مکان پر تھیں۔ مولانا خلیل حامدی کا بیان ہے کہ زندگی کی آخری گھڑیوں میں دادی اماں کے حلق سے کراہنے کی جو آوازیں نکلتی رہیں، ان میں سے ہر آواز اللہ اللہ کا نغمہ الاپتی رہی اور جب زندگی کا آخری سانس نکلا تو اللہ کے ذکر سے معمور ہو کر نکلا...... رہے نام اللہ کا!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری والدہ

میاں طفیل محمد جماعت اسلامی کے امیر رہے۔ انہوں نے کئی سیاسی اور دینی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے کوششیں کیں۔ ملک بھر کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان دنوں وہ سیاست سے ریٹائر ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی کی پالیسیوں کو جس ڈگر پر ڈالا اسی کے نتیجے میں آج جماعت اسلامی ایک مضبوط اور منظم سیاسی و مذہبی جماعت کے طور پر کوئی موثر رول ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ میاں طفیل محمد نے اس مضمون میں اپنی والدہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے اندر جو تھوڑی بہت نیکی اور بھلائی کے آثار ہیں۔ وہ میری والدہ کی نیک سیرت کا عکس اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔

••••••••••••••••••••••••••••••

میری والدہ زینب بنت منشی عبدالکریم میرے دادا کے چچازاد بھائی مبارک علی کی بھانجی تھیں اور انہوں نے قرآن مجید اور دوسری دینی تعلیم اپنے پھوپھا مولانا عبدالقادر سے پائی۔ میں نے باجہ گاؤں کے مولانا عبدالقادر سے بڑھ کر خدا پرست، متوکل علی اللہ اور فنافی الدین شخص کوئی نہیں دیکھا۔ وہ خود ہل چلا کر اپنی مختصری زمین سے روزی کماتے اور پھر دس بجے کے قریب میری والدہ کے آبائی گاؤں صفدر پور چلے جاتے جو باجے سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بڑا گاؤں تھا۔ وہ پیدل اپنے چند طالب علموں کے ساتھ صفدر پور کی مسجد میں آ کر ڈیرا ڈال دیتے اور اس مسجد میں مقیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاگردوں کے ہمراہ جو باجے سے ان کے ساتھ آتے، واپس چلے جاتے اور گھر کے کام کاج کرتے۔ یہ ان کا مستقل اور روزمرہ کا معمول تھا جسے انہوں نے عمر بھر پابندی سے نبھایا۔ سر پر سبز پگڑی اور عربوں جیسا ٹخنوں تک کھدر کا کرتہ ان کا مستقل لباس تھا۔ کھانا گھر سے کھا کر آتے اور رات کو گھر جا کر کھاتے۔ مدرسہ یا اہل دیہہ پر ان کا ہرگز کوئی بار نہ تھا۔ صفدر پور کے کچھ متعین گھر درویشوں (مقیم طالب علموں) کی تعداد کے لحاظ سے صبح شام ایک ایک روٹی مہیا کرتے تھے اور بس۔ کچھ جن بھی انسانوں کی صورت میں ان سے پڑھتے تھے۔

والدہ صاحبہ تین بہنیں، زینب، فاطمہ اور برکت بی بی تھیں۔ زینب اور فاطمہ دونوں مولوی عبدالقادر کی شاگرد تھیں۔ وہ رشتے میں ان کی بھتیجی اور مولانا عبدالقادر ان کے بچپن میں بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

میری والدہ مرحومہ فنافی القرآن تھیں۔ تلاوت قرآن اور نوافل کا نہیں بے حد شوق تھا۔ جب بھی اور جتنی فرصت ہوتی، قرآن مجید یا پھر پنجابی کی کتاب "احوال" لے کر بیٹھ جاتیں۔ اپنی آخری عمر میں جب وہ بال بچوں سے فارغ ہوگئیں، پھر تو ہر وقت قرآن مجید یا نوافل پڑھتی رہتی تھیں۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کی غیبت یا چغلی نہیں سنی۔ ہر کام بسم اللہ سے شروع کرتیں۔ ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے مجھے نماز سکھادی، چنانچہ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے جانتے بوجھتے کبھی کوئی نماز چھوڑی ہو۔ نہانے کی عادت انہوں نے مجھے ایسی ڈالی کہ سوائے بیماری یا گھر سے باہر جہاں غسل کرنے کا انتظام نہ ہو، میں روزانہ غسل کے بغیر اپنے آپ کو غیر مکمل محسوس کرتا ہوں۔ بچپن میں جب سے روزے شروع کیے ہیں، روزہ بھی کبھی نہیں چھوڑا۔

والدہ صاحبہ کو میں نے کانوں میں چاندی کی ڈنڈیوں اور بانہوں میں ایک آدھ چوڑی کے سوا کوئی زیور پہنے نہیں دیکھا۔ لباس ان کا ہمیشہ سادہ، قمیض شلوار اور دوپٹہ رہا اور کھانا بھی عام دال روٹی، سبزی اور کبھی کبھار گوشت جب مہیا ہوا، کھالیا۔

غریبانہ گزر بسر ہونے کے باوجود ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ گھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی کم سے کم ضروریات کو چھوڑ کر جو ہاتھ میں ہو وہ کسی ضرورت مند کو دے دیا جائے۔ ان کی یہ بات مجھے کبھی نہیں بھولتی کہ اپنے کھانے کا کیا ہے، وہ تو سوکھا ٹکڑا کھالیں یا حلوہ پلاؤ کھالیں، سب اگلی صبح گندگی بن کر خارج ہو جائے گا، اپنا تو وہی ہے جو کسی دوسرے کے پیٹ میں چلا جائے۔ حتی الامکان وہ کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتی تھیں۔ کھانے پکانے سے لے کر دھلائی صفائی تک گھر کے سارے کام عمر بھر وہ خود ہی کرتی رہیں۔

میں نے اپنی زندگی صرف آٹھویں جماعت تک والدہ کے ساتھ گزاری۔ باقی ساری عمر تو باہر ہی گزری۔ بس وقتاً فوقتاً چند روز کے لئے آتا جاتا رہا۔ ہائی اسکول بھی چودہ پندرہ میل دور ریاست کے صدر مقام کپورتھلہ میں تھا اور انٹر کالج بھی وہیں تھا۔ اس کے بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور اور یونیورسٹی لا کالج لاہور میں آ گیا اور پھر جسٹس محمد شریف کے ساتھ، جو اس وقت جالندھر میں وکالت کرتے اور ڈسٹرکٹ مسلم لیگ جالندھر کے صدر تھے، ایک سال اپرینٹس شپ کی اور پھر کپورتھلہ میں وکالت شروع کر دی۔ اور وہیں سے جنوری 1942ء میں وکالت ترک کر کے لاہور آیا اور پھر مستقلاً 1944ء سے جماعت اسلامی کے مرکز دارالاسلام پٹھان کوٹ رہا۔ وہاں سے 30 اگست 1947ء کو ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ والدہ صاحبہ اس دوران اپنے پورے کنبے کے ساتھ ہمارے گاؤں رائے پور ارائیاں میں رہیں اور وہاں سے یہ سب قیام پاکستان کے وقت ستمبر 1947ء میں پھرالہ چک نمبر 258 گ ب متصل ڈجکوٹ ضلع فیصل آباد آ گئے اور یہیں 1979ء میں 80 سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہوا۔

میں ان کی زندگی میں گاہے گاہے دو چار روز کے لئے ان سے ملنے دارالاسلام سے رائے پور اور ان کے پاکستان آ جانے پر پھرالہ جاتا رہا، لیکن دل بھر کر کبھی ان کی خدمت میں رہنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ میری جماعتی ذمہ داری اور احساس فرض اس راہ میں ہمیشہ حائل رہے۔ ان کے نزدیک اپنے استاد مولانا عبدالقادر کی دینی مصروفیت کی روشنی میں جماعت اسلامی میں میرے کام کی نوعیت بھی وعظ و نصیحت ہی تھی، اس لئے وہ اکثر فرماتیں کہ وعظ کا کیا ہے، یہاں گاؤں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی بہت لوگ ہیں، ان کو وعظ کہتے رہا کرو۔

جماعت کا مرکز اچھرہ سے منصورہ منتقل ہو جانے کے بعد وہ دو مرتبہ تقریباً ایک ایک ماہ کے لئے میرے پاس آ کر ٹھہریں اسلئے کہ منصورہ آنے سے قبل مجھے اتنی گنجائش کا مکان ہی نہ ملا تھا کہ گاؤں سے کوئی میرے پاس آ کر ٹھہر سکے۔ والدہ کے انتقال کے بعد والدہ صاحب میرے پاس آ کر ٹھہرتے رہے، لیکن وہ دونوں دیہاتی زندگی اور ماحول میں اتنے رچے بسے ہوئے تھے کہ یہاں آ کر گھبرا جاتے کہ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور ان میں سے کسی کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں ہے کہ اس کے پاس انسان بیٹھ کر کوئی بات کرے۔ پھرالہ میں میرے والد کے اپنے سات بھائیوں اور میری والدہ کے تین بھائیوں کے دس گھر اپنے تھے، اس لئے وہاں انہیں ہر وقت حسب دل خواہ محفل میسر رہتی تھی۔ اور خدا کے فضل سے سب میں مثالی اتفاق، تعاون اور دکھ سکھ کا ساتھ تھا۔ اس لئے وہاں ان کا دل خوب لگتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی اولاد تین بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے میں سب سے بڑا ہوں۔ میرے دو بھائی محمد صدیق اور محمد رشید ڈھائی تین تین برس کی عمر ہی میں رائے پور ارائیاں میں فوت ہو گئے۔ اسی طرح دو بہنیں بشیرہ اور منیرہ میں سے بشیرہ پانچ چھ سال اور منیرہ آٹھ نو سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ زہرہ، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں یہاں پاکستان آ کر پھرالہ میں فوت ہوئی۔ میں اور تین بہنیں موجود ہیں۔ والدہ صاحبہ کو میں نے کسی بچے کے فوت ہونے پر ذرہ برابر بھی جزع فزع کرتے نہیں دیکھا۔ بس خاموشی سے آنسو ٹپکے اور مکمل صبر و تحمل کے ساتھ میت کو دفن کے لئے روانہ کر دیا۔ ہر موقع پر والدہ صبر و شکر کا پیکر بنی رہیں اور جو زندہ تھے ان کی خیر مناتی رہیں کہ اللہ کا مال اور عطیہ ہے، وہ جس کو چاہے لے جائے اور جسے چاہے ہمارے پاس رہنے دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو بھی تھوڑی بہت نیکی اور بھلائی کے آثار ہیں وہ والدہ کی تربیت اور ان کی نیک سیرت کا عکس اور اللہ رب العالمین کا عطیہ ہیں، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنت ماں کے قدموں تلے ہے

سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے والی پاکستان کی پہلی خاتون اور پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن ہیں۔ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وفات کے بعد انہوں نے مارشل لاء کے طویل دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ دو مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے کے علاوہ انہوں نے اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے قومی سیاست میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ اپنی والدہ کے حوالے سے لکھے گئے اُن کے یہ چند صفحات دراصل بھٹو خاندان میں اُن کے مقام و مرتبے کو واضح کرتے ہیں۔

••••••••••••••••••••••••••

ہماری خاندانی تاریخ میں المرتضیٰ کا حوالہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر چہ المرتضیٰ کی جدید کاری نے پرانے گھر کی ہیئت کو تبدیل کر دیا ہے تاہم المرتضیٰ ہی بھٹو خاندان کا قدیم اور اصلی گھر محسوس ہوتا ہے۔ سامنے کا دروازہ نیلی اور سفید ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے جو 2500 سال ق۔م سے آغاز کردہ موہنجوداڑو کی نہایت ترقی یافتہ سندھی تہذیب کے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے طرز زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ بچپن میں میرا خیال تھا کہ اس قدیم شہر کو ''موہنج جوڈیرو'' اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس لفظ کا مطلب ہی سندھی زبان میں ''میری جگہ'' ہوتا ہے۔ میرے بھائیوں، بہن اور مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہا کہ ہم موہنجوداڑو کے سائے میں پلے بڑھے ہیں۔ ہم دریائے سندھ کے کنارے پر رہائش پذیر ہیں جو اوائل زمانہ سے ہماری زمینوں کو سیراب کرتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ کسی دوسری جگہ ماضی سے تسلسل کا ایسا رشتہ ہم نے محسوس نہیں کیا، کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق 712ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے ساتھ براہ راست بنتا ہے۔ ہمارے اجداد میں سے ایک فرد کی ڈائری میں خاندان کے بارے میں پوری تفصیلات درج تھیں جو میرے پردادا کے زمانہ میں ایک بہت بڑے سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ لیکن بچپن ہی سے ہمیں بتایا گیا کہ یا تو ہم ہندوستان کی جنگجو نسل راجپوت سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے حملہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے اور یا ان فاتح عربوں کی اولاد میں سے ہیں جو ہمارے آبائی صوبہ سندھ میں سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اسی لئے سندھ کو "باب الاسلام" کا نام دیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں لاکھوں افراد بھٹو قبیلے میں شامل ہیں۔ سندھ کا یہ سب سے بڑا قبیلہ ہے جس میں چھوٹے کسان بھی ہیں اور بڑے بڑے زمیندار بھی۔ ہمارا خاندان بھٹو قبیلے کے مشہور مورث اعلیٰ سردار ڈوڈو خان کی براہ راست اولاد میں سے ہے۔ اپر سندھ یعنی بالائی سندھ کے متعدد دیہات، میر پور بھٹو جہاں چچا ممتاز کا خاندان آباد ہے اور گڑھی خدا بخش بھٹو جہاں ہمارے خاندان کا قبرستان واقع ہے، ہمارے اجداد کے ناموں سے معروف ہیں جن کی زیادہ تر صوبے میں ارضی ملکیت تھی اور جو سیاسیات میں سینکڑوں برسوں سے حاوی چلے آرہے تھے۔ میرے بڑوں نے نوڈیرو میں گڑھی خدا بخش بھٹو کے نزدیک ایک گھر اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا جہاں عید کے دنوں میں میرے والد اور بھائی پکے ہوئے میٹھے چاول اور عرق گلاب سے معطر پانی روایتی تحفہ کے طور پر مہمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ لیکن میرے دادا کے وقتوں سے خاندان میں مرکزی حیثیت لاڑکانہ کے المرتضیٰ کو حاصل ہو گئی تھی۔

میری والدہ مقابلتاً شہری صنعت کاروں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جو زمینداروں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع المشرب خیالات کا مالک ہوتا ہے۔ جب کہ بھٹو خاندان کی خواتین ابھی بھی پردہ کرتی تھیں اور اپنے گھروں کی چار دیواری سے باہر شاذو نادر ہی نکلتی تھیں اور وہ بھی سیاہ برقعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اپنے جسم کو مکمل طور پر چھپائے ہوئے۔ میری والدہ اور ان کی بہنیں کراچی میں بغیر نقاب کے پھرتی تھیں اور اپنی اپنی گاڑیاں خود چلاتی تھیں۔ ایک ایرانی کاروباری کی بیٹیاں، انہوں نے کالج تک تعلیم حاصل کی اور قیام پاکستان کے بعد خواتین کے ایک عسکری ذیلی ادارہ میں بطور نیشنل گارڈ کے افسروں کی خدمات بھی بجالائیں۔ بھٹو خواتین کے لئے پبلک میں نقاب کے بغیر پھرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ 1951ء میں میرے والد اور والدہ کی شادی کے بعد میری والدہ نے بھٹو خواتین کی طرح پردہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں اپنے خاندان کو ملنے جانے کے لئے ہفتہ میں صرف ایک بار گھر چھوڑنے کی اجازت تھی۔ لیکن قدیم طرز بود و باش سے ہر کوئی تنگ آ چکا تھا۔ جب بھی میری دادی کو کراچی کے اپنے گھر سے باہر جانا ہوتا اور ڈرائیور دستیاب نہ ہوتا تو وہ میری والدہ کو گاڑی چلانے کے لئے کہتیں۔ جب ہمارا کنبہ المرتضیٰ کو جاتا تو میرے والد مردانہ حصے کی بجائے زنانہ حصہ ہی میں میری والدہ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرتے اور جب 70 کلفٹن کی تعمیر مکمل ہوگئی وہاں خواتین کے لئے کوئی علیحدہ حصہ نہیں تھا مگر میرے دادا نے مردانہ مہمانوں سے ملاقات کے لئے بالمقابل ہی ایک اور گھر خرید لیا تھا۔ ایک نئی اور زیادہ روشن خیال نسل پاکستان میں جڑ پکڑ رہی تھی۔

ہمارے مردانہ غلبہ زدہ کلچر میں لڑکوں کو ہمیشہ ہی لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اور نہ صرف انہیں اکثر تعلیم ہی سے محروم رکھا جاتا بلکہ بعض مرتبہ اتنی انتہا بھی کی جاتی کہ لڑکوں کو کھانا بھی پہلے دیا جاتا جب کہ ماں اور بیٹیاں انتظار کرتیں۔ تاہم ہمارے خاندان میں ایسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ علی الرغم مجھے سب سے زیادہ توجہ ملتی۔ چاروں میں سب سے بڑی، میں 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئی...... میری جلد گلاب کی طرح سرخ ہونے کی بنا پر میری کنیت ''پنکی'' پڑ گئی۔ میرا بھائی میر مرتضیٰ میرے ایک سال بعد پیدا ہوا، صنم 1957ء میں اور بے بی شاہنواز 1958ء میں ...... بڑی ہونے کے ناطے آغاز ہی سے گھر میں میری مخصوص اور الگ حیثیت تھی۔ میری عمر چار سال تھی اور والد کی 28 سال۔ جب پریذیڈنٹ سکندر مرزا نے میرے والد کو اقوام متحدہ میں بھیجا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے والد کی بعدازاں صدر ایوب خان کی کابینہ میں تقرری بطور وزیر تجارت ہوئی پھر وزیر توانائی بنے اور پھر وزیر خارجہ۔ وہ اکثر اقوام متحدہ میں پاکستانی وفود کے سربراہ کے بطور شریک ہوئے۔ اس سات سالہ دور نے انہیں اور والدہ کو زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے اپنے والد کو اخبارات کے پہلے صفحات کی زینت بنتے دیکھا اور اسی طرح اقوام متحدہ میں پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک کی حمایت میں دلیلیں دیتے ہوئے۔ 1960ء میں سویت یونین سے مالی اور ٹیکنیکل امداد کے معاہدے بھی انہوں نے کئے۔ 1963ء میں ممنوعہ پیکنگ سے سرحدی معاہدہ کرتے ہوئے جس میں چین نے متنازعہ علاقہ کے 750 مربع میل خاموشی سے پاکستان کے حوالے کر دیئے۔ میری والدہ عام طور پر ان کے ساتھ سفر کرتیں۔ بچوں کو گھر میں گھریلو عملہ کے پاس چھوڑ دیتیں اور مجھے تنبیہہ کے انداز میں کہتیں "دوسرے بچوں کا خیال رکھو تم سب سے بڑی ہو" میں فقط آٹھ سال کی تھی جب مجھے گھر کی نگہداشت کا چارج سنبھالنا پڑا جب کہ میرے والدین گھر سے دور تھے۔ میری والدہ خوراک اور گھر کی دوسری ضروریات کے لئے مجھے پیسے دے جاتیں جو میں اپنے تکیئے کے نیچے چھپا دیتی۔ اگرچہ میں سکول میں ابھی جمع تفریق سیکھ رہی تھی، ہر شب والدہ کی غیر حاضری میں کچن کے ایک سٹول پر چڑھ جاتی اور ظاہر کرتی کہ میں بابو کے ساتھ حساب کتاب کر رہی ہوں۔ بابو ہمارا دیرینہ اور بزرگ ترین وفادار ملازم تھا۔ آیا حساب آپس میں مطابقت رکھتا تھا یا نہیں مجھے بالکل یاد نہیں۔ خوش قسمتی سے چھوٹی چھوٹی رقموں کا معاملہ تھا ان دنوں دس روپے میں پورے گھرانے کے لئے خوراک خریدی جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں سب سے زیادہ ترجیح تعلیم کو حاصل تھی۔ اپنے والد کی طرح میرے والد ہمیں تعلیم یافتہ اور ترقی پسند پاکستانیوں کی اگلی نسل میں ایک مثال کے طور پر شامل کرنا چاہتے تھے۔ تین سال کی عمر میں مجھے لیڈی جیننگز کے نرسری سکول میں بھیجا گیا پھر پانچ سال کی عمر میں کراچی کے اعلیٰ ترین مدرسوں میں یعنی کانونٹ آف جیزس اینڈ میری میں۔ کانونٹ میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا اور یہی زبان ہم گھر پر بھی زیادہ تر بولتے تھے بجائے والدین کی مقامی زبانوں یعنی سندھی یا فارسی کے یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومی زبان اُردو کے۔ اگرچہ آئرش آیائیں جو وہاں پڑھاتی تھیں بڑے طلباء اور طالبات کو مختلف اقامت گاہوں میں تقسیم کر دیتی تھیں اور ان اقامت گاہوں کے متاثر کن نام رکھتی تھیں مثلاً ''تنظیم، خوش مزاجی، کوشش اور خدمت'' انہوں نے ہمیں عیسائیت کی تبلیغ کی کوئی ظاہری کوشش نہیں کی۔ سکول مشنریوں کے لئے آمدنی کا معقول ذریعہ تھا اور وہ مسلمان خاندانوں کی تھوڑی تعداد کو بھی ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے کیونکہ یہ خاندان کافی متمول تھے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں دور اندیش بھی۔

''میرا تم سے صرف ایک ہی سوال ہے کہ تم اپنی پڑھائی میں اچھی پوزیشن حاصل کرو'' میرے والد بار بار یہی پوچھا کرتے تھے۔ جیسے ہی ہم عمر میں بڑھتے گئے انہوں نے ہمارے لئے سکول کے بعد سہ پہر کے وقت حساب اور انگریزی پڑھانے کے لئے اتالیق رکھ دیئے۔ وہ خود دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتے تو ٹیلی فون پر ہماری سکول رپورٹوں کا پوچھتے رہتے۔ خوش قسمتی سے میں اچھی طالبہ تھی کیونکہ ان کے ذہن میں میرے لئے وطن سے باہر تعلیم حاصل کرنے والی بھٹو خاندان کی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کرنے کی بڑی بڑی تجاویز تھیں۔

''تم اپنے اپنے سوٹ کیس تیار رکھو اور میں تم سب کو ائرپورٹ پر الوداع کہنے کے بعد چھوڑ آؤں گا'' انہوں نے ہم چاروں کو بہت پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''پنکی ایک چھوٹی سی بچی کی طرح جائے گی اور واپس ساڑھی میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان لیڈی بن کر آئے گی'' شاہنواز اپنے سوٹ کیس میں اتنے کپڑے بھر لے گا کہ اس سے بند نہیں ہو سکے گا ہمیں بابو کو بلانا پڑے گا تاکہ وہ اس کے اوپر بیٹھے۔ میرے خاندان میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا کہ میری ہمشیرہ اور مجھے زندگی میں وہی مواقع نہیں ملیں گے جو میرے بھائیوں کو ملیں گے۔ اسلام میں بھی کوئی ایسی تفریق نہیں۔ ہمیں چھوٹی عمر ہی میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں بعض مردوں کی تاویل ہے جو عورتوں کے لئے مواقع کو محدود کر دیتی ہے۔ دراصل ہمارا مذہب اسلام اپنی ابتداء سے ہی عورتوں کے لئے بہت ترقی پسند نظریہ رکھتا ہے۔ ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت کے عربی رسم و رواج کے مطابق چھوٹی بچیوں کے قتل کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کا حکم دیا اور انہیں وراثت کا بھی حقدار بنایا تھا، ہزاروں سال قبل جبکہ مغرب میں یہ حقوق عورتوں کو ابھی نہیں دیئے گئے تھے۔

بی بی خدیجہؓ مسلمان بننے والی پہلی خاتون بیوہ تھیں اور تجارت کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نو جوانی میں ہی اپنے ہاں ملازمت دی اور بعد میں ان سے شادی کرلی۔ ام عمارہ نے مردوں کے دوش بدوش کفار کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تلوار سے حفاظت کی۔ جنوبی ہندوستان کی ریاست احمد نگر کی چاند بی بی نے مغل شہنشاہ اکبر کو شکست دیکر صلح نامہ پر مجبور کردیا۔ شہنشاہ جہانگیر کی بیوی نور جہاں جو دراصل خود ہی حکمران تھی حکومت کے نظم و نسق میں مہارت کے لئے مشہور تھی۔ اسلامی تاریخ میں ایسی متعدد خواتین گزری ہیں جنہوں نے اپنا عوامی کردار مردوں کی طرح مکمل کامیابی سے نبھایا۔ اسلام نے یہی راستہ اختیار کرنے کو ان کی یا میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ قرآن کریم کی سورہ "النحل" میں چیونٹی بیان کرتی ہے۔ "میں نے ایک عورت کو ان پر حکومت کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اسے ہر شے کثرت سے عطاء کی گئی ہے اور اس کا تخت بہت طاقتور تخت ہے" سورہ النساء میں درج ہے "مرد جو کماتے ہیں انکا ہے اور عورتیں جو کماتی ہیں وہ ان کا ہے۔"

ہر سہ پہر اتالیق سے نصابی سبق پڑھنے کے بعد ہم نے مولوی صاحب سے جو ہمارے گھر پڑھانے آتے تھے قرآن مجید میں سے یہ اور دوسری سورتیں پڑھیں اور اسی طرح دیگر مذہبی ہدایات حاصل کیں۔ قرآن کریم کی عربی میں تلاوت اور پھر اس کے اسباق کو سمجھنا ہمارے لئے سب سے اہم موضوع تھا۔ ہم گھنٹوں مشکل عربی الفاظ پر تگ و دو کرتے، عربی کے حروف تہجی اُردو سے ملتے جلتے ہیں مگر اس کی گرائمر اور مطالب انگریزی اور فرانسیسی کے مابین تفاوت کی طرح بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

ایک سہ پہر مولوی صاحب نے قرآنی احکام کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "اپنے والدین سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہربانی سے پیش آؤ اور ان کی اطاعت کرو" یہ بھی بتایا کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے" اس بات میں حیرانی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ہماری والدہ اکثر یہی ہدایت دیا کرتی تھیں۔ مولوی صاحب یہ بھی پڑھایا کرتے تھے کہ دنیا میں ہمارے اعمال عقبیٰ میں ہماری قسمت سنوارنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ "تمہیں ایک وادی نار کے اوپر بال سے بھی زیادہ باریک پل صراط پر سے گزرنا ہوگا" "کیا تمہیں معلوم ہے وہ بال کتنا باریک ہوگا؟" وہ ڈرامائی انداز میں پوچھتے۔ "وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا دوزخ میں گر پڑیں گے اور جنہوں نے دنیا میں نیکیاں کمالی ہیں وہ جنت میں جائیں گے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔"

میری والدہ نے نماز کے تمام آداب مجھے سکھائے۔ وہ اپنے دین پر سختی سے پابند تھیں۔ دنیا کے جس خطے میں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہی ہوں وہ پنجگانہ نمازیں ضرور ادا کرتی تھیں۔ جب میں نو سالہ بچی تھی وہ نماز فجر کے لئے صبح سویرے بستر سے جگاتیں ہم اکٹھے ہی وضو کرتیں، خدا کے روبرو جانے کے لئے پاؤں اور منہ دھو کر صاف ہو جاتیں اور پھر مغرب کی طرف قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتیں۔

میری والدہ اکثر ایرانیوں کی طرح شیعہ مسلک کی تھیں جبکہ ہمارا باقی خاندان سنی ہے۔ لیکن یہ ہمارے درمیان کوئی مسئلہ نہیں۔ شیعہ اور سنی ہزاروں سال سے پہلو بہ پہلو رہتے چلے آرہے ہیں اور آپس میں شادیاں بھی کی ہیں۔ ہمارے اختلافات کم ہیں اور مشترکہ معتقدات زیادہ ہیں۔ جو چیز تمام مسلمانوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ فرقوں کی تفریق کے باوجود ایک کلمہ پر ایمان ہے۔ "ہمارا کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری پیغمبر ہیں" یہی ایک مسلمان کی قرآنی تعریف ہے اور ہمارے خاندان میں اسی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

محرم کے دوران جب عراق میں کربلا کے مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؓ کو شہید کر دیا گیا ان کی یاد میں بعض اوقات میں مکمل سیاہ لباس پہن کر اپنی والدہ کے ساتھ شیعہ مناسک ادا کرنے کے لئے مجلس میں جاتی تھی۔ "ساتھ ساتھ رہو" والدہ اصرار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتیں کیونکہ شیعہ رسومات سنیوں کی نسبت زیادہ مفصل ہوتی ہیں۔ میں ذاکر سے اپنی آنکھیں پرے نہ کرتی جو انتہائی موثر انداز میں کربلا میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں پر جو المیہ گزرا تھا اسے دہراتا اور بتاتا کہ کس طرح گھات لگا کر غاصب یزید کے فوجیوں نے انہیں شہید کیا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا گیا چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی یزید کے خنجروں کا شکار بنے۔ امام حسینؓ کا سر قلم کر دیا گیا اور ان کی ہمشیرہ زینبؓ کو یزید کے دربار میں ننگے سر لیجایا گیا۔ جہاں انہوں نے ظالم حاکم کو اپنے بھائی کے سر کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ان کا دل نہیں ٹوٹا اس کے برعکس بی بی زینبؓ نے پختہ عزم کر لیا اور اسی طرح امام حسینؓ کے باقی مقتدیوں نے بھی ان کے پیروکار جنہیں شیعہ کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ کربلا کے سانحہ کو کبھی نہیں بھولتے۔

''سنو کہ چھوٹی بچی پانی پانی پکار رہی ہے'' ذاکرہ بھرائی ہوئی آواز میں چلاتی ہے۔ ''اس ماں کے دل کی حالت محسوس کرو جو اپنی بچی کی آواز سن رہی ہے۔ اس جوان رعنا کو دیکھو جو اپنے گھوڑے پر سوار پانی لینے جا رہا ہے۔ وہ دریا پر جھکتا ہے۔ ہم اسے پانی کی خاطر دریا پر جھکتا دیکھ رہی ہیں۔ دیکھو غور سے دیکھو لوگ ان پر تلواروں سے پل پڑے ہیں'' جونہی ذاکرہ نے یہ الفاظ ادا کئے کچھ عورتوں نے آہ وزاری کے ساتھ ماتم شروع کر دیا۔ پوری کہانی کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی جو دل کو ہلا دے۔ میں خود بھی یہ سن کر کئی مرتبہ چیخی اور چلائی۔

میرے والد کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ اپنے ملک اور اپنے بچوں کو بیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھائیں ''کیا بچے خاندان ہی میں شادیاں کریں گے؟'' میں نے ایک دن والدہ کو والد سے یہ سوال پوچھتے ہوئے سنا۔ جواب سننے کے لئے میری سانس وہیں رک گئی۔

''میں نہیں چاہتا کہ لڑکے اپنے چچازادوں کے ساتھ شادی کریں اور باہر جاتے ہوئے ان کو گھر کی چاردیواری میں چھوڑ جایا کریں اور اس طرح میں لڑکیوں کو اپنے رشتہ داروں کی چاردیواری میں زندہ درگور ہونے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا'' مجھے یہ جواب سن کر بہت سکون ہوا۔ ''انہیں پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لینے دو پھر وہ اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے والد کا ردعمل میرے لئے خوشگوار تھا یہ وہی دن تھا جب میری والدہ نے مجھے پہلی مرتبہ برقع پہننے کے لئے کہا۔ ہم اس وقت کراچی سے ٹرین میں لاڑکانہ جا رہے تھے جب میری والدہ نے ایک سیاہ رنگ کا کپڑا اپنے تھیلے میں سے نکالا اور مجھے اس میں لپیٹ دیا۔ ''اب تم بچی نہیں ہو'' انہوں نے تاسفانہ انداز میں کہا۔ قدامت پسند جاگیردار گھرانوں کی بیٹیوں کو اس قدیم رسم سے واسطہ پڑتا تھا۔ اور میں جب بچپن سے بلوغت کی دنیا میں داخل ہوئی تو مجھے حیرت ناک حد تک مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان، گھاس اور پھولوں کا رنگ اڑ چکا تھا وہ سب بھورے رنگ کے ہو چکے تھے۔ میری آنکھوں پر کپڑے کے پردے کی وجہ سے ہر چیز دھندلا گئی۔ جونہی میں ٹرین سے نیچے اُتری، پردے کی وجہ سے جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا چلنا دوبھر ہو گیا۔ باہر کی ہوا بالکل بند تھی اور میں پسینے میں شرابور۔ ''پنکی نے آج پہلی مرتبہ برقع پہنا'' میری والدہ نے میرے والد کو المرتضیٰ پہنچنے پر بتایا۔ ایک لمبے وقفے کے بعد میرے والد بولے ''اسے برقع پہننے کی ضرورت نہیں'' خود پیغمبر خدا کا فرمان ہے کہ بہترین پردہ آنکھوں کے پیچھے ہوتا ہے۔ ''جانچنا ہو تو اس کے کردار اور اس کے ذہن سے جانچو نہ کہ اس کے لباس سے'' اور اس طرح میں بھٹو خاندان کی پہلی خاتون بن گئی جسے مستقل دھندلکوں سے نجات مل گئی۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماں جی

قدرت اللہ شہاب کا نام اگرچہ پاکستان کی اعلیٰ ترین سول سروس میں کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن اُردو ادب میں ان کی پہچان کا ذریعہ ''شہاب نامہ'' بنا۔ ''شہاب نامہ'' کے بعد ان کی اور کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ لیکن جو مقام اور مرتبہ ''شہاب نامہ'' کو حاصل ہے۔ وہ کسی کو نہیں۔ ''شہاب نامہ'' میں ان کی ایک عظیم المرتبت شخصیت کے طور پر تصویر سامنے آئی۔ وہ صدر کے سیکرٹری سے لے کر تمام اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے۔ آخری عمر میں دین کے قریب ہو کر تصوف سے لو لگائی۔ اس مضمون میں انہوں نے ماں جی کے حوالے سے اپنے بچپن کے کچھ گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

••••••••••••••••••••••

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہیں ہو سکا۔ جس زمانے میں لائل پور (فیصل آباد) کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آرہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو ''بار'' کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نام تھا۔ والدین کے پاس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے، لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی، لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب بھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔

ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی، لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی، نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا، تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فر اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے کھالیتی تھیں، لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں، اکثر و بیشتر دوپہر کا، شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں، سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی ''میرے بیٹے'' یا ''میری بیٹی'' کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے بار بار اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خرد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سرراہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا، لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے چک نمبر 392 میں، جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا، ڈیرے ڈال دیے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی طریقہ ہو گا، چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے، چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا، اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لئے گئے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کا کان کا زیریں حصہ بری طرح پھٹ گیا۔

چک نمبر 392 سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر 507 میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارا کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریے اور کلستھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ جب پک کر تیار ہو گیا اور سالن کو الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا باگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیٹ بھرا۔

چک نمبر 507 نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں وطن کی یاد ستانے لگی، چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکالے باہر کا تماشا دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گردوغبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لئے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا، چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لئے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں:

''ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔''

''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

''توبہ توبہ پت'' ماں جی کانوں پہ ہاتھ لگاتیں۔ ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہوگئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائداد رہن پڑی ہے، چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے، چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا منشی خاص گاؤں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلی ملازمتوں میں جائیں، چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کر کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟'' سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

''جی ہاں!'' عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخاست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: ''اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔''

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا، چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی، انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا، ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

''اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟'' عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

''اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔'' ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نے کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا، بلکہ ماں جی کی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا: ''تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر رہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آیا۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا: ''مسٹر گورنر، جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔''

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں وشاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا: ''اگر لارڈ کچنر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟''

''میں!'' ماں جی تنک کر بولیں: ''میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟''

''میں'' عبداللہ صاحب نے ڈراما کیا ''میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاتا جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔''

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار...... ماں جی رشک وحسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات ''گورنری'' کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا:

''بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!''

عبداللہ صاحب، علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا: ''بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے، گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔''

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ عرصے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی: ''ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔''

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی، لیکن جب معاملے کی تہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے، چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کی وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ 1947ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

''اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو'' مہارانی نے کہا: ''کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔''

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب مائیں دنیا میں کم ہی ہوتی ہیں، لیکن اگر صبر وشکر، تسلیم ورضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے کے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہا اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا، لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر بچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چار پائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائینتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے: ''بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں، میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟''

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈ آئے۔ ''ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے، لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔''

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیے پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی: ''بچہ رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔''

کہنے کو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا، ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی، لیکن کیا وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الہڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیاباں میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی، لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے، لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری والدہ محترمہ

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا شمار ایٹمی پروگرام کے معماروں اور محب وطن پاکستانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو ایٹمی ممالک کی صف میں کھڑا کر کے جہاں اقوام عالم میں اسے بلند مقام و مرتبہ عطاء کیا وہاں دنیا بھر کے مسلمانوں کا سر بھی فخر سے بلند کر دیا۔ انہوں نے اس مضمون میں اپنی والدہ محترمہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کہ وہ کوئی غیر معمولی شخصیت نہیں بلکہ یہ سب کچھ جو آج میرے اندر ہے۔ اس کی بنیادیں میری والدہ نے تعمیر کیں۔ اس لئے وہ ایک مکمل شخصیت اور عظیم خاتون تھیں۔

•••••••••••••••••••••••••

ماں کے پاؤں تلے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ صورت حال مغرب میں نہیں۔ مغربی معاشرے میں ماں اور اولاد کے مابین رشتہ ضرورت سے زیادہ دی جانے والی آزادی کی نذر ہو چکا ہے لیکن ہم جو مشرقی اقدار و روایت کے پاسدار ہیں، اس رشتے کے تقدس اور اس کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ماں جب جھولی پھیلا کر اپنے بچوں کے لئے دعا کرتی ہے تو وہ دعا رب ذوالجلال کے حضور شرف قبولیت حاصل کرتی ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس کے دل میں ماں کی عظمت کا احساس نہ ہو۔ ایسے لوگ اگر ہیں تو یقیناً وہ بد قسمت اور بد بخت ہیں۔ جب میں اپنی ماں کو یاد کرتا ہوں تو میرے ذہن میں بچپن کی یادوں کے کتنے ہی دریچے کھل جاتے ہیں۔ میری والدہ محترمہ سختی سے اس مقولے پر عمل کرتی تھیں کہ ”کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے۔‘‘انہوں نے ہمیں سونے کے نوالے کھلائے اور شیرنی کی آنکھ سے دیکھا۔ بہت سخت طبیعت کی تھیں، لیکن ان کی ساری سختی کے اندر ایک ایسا پیار تھا جسے بیان کرنے کے لئے شاید لفظ نا کافی ہیں۔ ہمارے والد محترم اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے......نرم اور شفیق۔ ان کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا میں کوئی بھی فرد تعلیم سے محروم نہ رہے۔ کوئی بھی سماجی اور معاشی حقوق سے محروم نہ رہے۔

عام طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ والد بچوں کو ڈانٹتا ہے اور بچے ماں کی گود میں تحفظ حاصل کرتے ہیں۔ باپ کا غصہ ارر ماں کا پیار مشہور ہے، لیکن ہمارے ہاں اس کے برعکس تھا۔ والدہ ڈانٹتی تھیں اور والد ہمیں اس ڈانٹ سے تحفظ دیا کرتے تھے۔

عظیم مائیں عظیم بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ میں نے اپنے بارے میں کبھی یہ سوچ نہیں رکھی کہ میں کوئی غیر معمولی شخصیت ہوں یا میں نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ میں نے جو کیا دیانتداری کے ساتھ اور ملک وقوم کی خدمت کے جذبے کے ساتھ کیا۔ مجھے قدم قدم پر یہ احساس ضرور ہے کہ میری ماں بہت عظیم تھیں۔ ویسے تو ہر شخص کو اپنی ماں برتر اور عظیم محسوس ہوتی ہے، لیکن جوں جوں میں سن شعور کو پہنچا مجھ پر یہ عقدہ کھلتا چلا گیا کہ واقعی وہ ایک مکمل شخصیت اور ایک عظیم ماں تھیں۔ ان کے ہاں جو دل دھڑکتا تھا، وہ بیک وقت ایک عورت کا دل تھا، ایک ماں کا دل تھا، انسانیت سے پیار کرنے والی ایک شخصیت کا دل تھا۔ فراخدلی، انسانیت سے پیار، دوسروں کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینے کی روش، سادگی، انکسار سب کچھ مجھے اپنے گھر سے ملا ہے۔ میری طبیعت اور مزاج کی جو بھی ساخت ہے، اس کی بنیادیں میری والدہ نے تعمیر کیں۔ میں نے تعلیم حاصل کی، مغرب میں گئے، مغرب سے بہت کچھ حاصل کیا، لیکن ہمارے اندر سے مشرق کا مزاج نہ نکل سکا۔ ہم نے اہل مشرق کی ترقی وخوشحالی کے بارے میں سوچا تو مغرب والے ناراض ہو گئے۔ مغرب اور مشرق میں بہت فرق ہے۔ مغرب والے یہ فرق قائم رکھنا چاہتے ہیں، جبکہ ہم اس فرق کو ختم کر کے اپنی صلاحیتوں کا سکہ چلانا چاہتے ہیں اور یہیں سے ہمارے ان کے معاملات کی سرحدیں جدا ہوتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی عظیم شخصیت کا پرتو ہمیشہ انسان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ میری ذات میں ماں اور باپ دونوں کا ایک امتزاج ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم نے اپنے والد کی کونسی عادات اور مزاج کو اپنایا ہے اور اپنی والدہ کی کون سی عادات کو اپنی ذات میں جذب کیا ہے۔ لیکن ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہماری شخصیت میں والد کے مزاج کا تناسب زیادہ ہے یا والدہ کی شخصیت کا عکس زیادہ، البتہ یہ ضرور ہے کہ والدہ کی شخصیت کے سحر سے ہم ابھی تک نہیں نکل سکے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک فطری سی بات ہو کہ والدہ چونکہ والد کی نسبت بچے کو زیادہ وقت دیتی ہے، اس لئے بچے پر اس کی شخصیت کی چھاپ زیادہ ہوتی ہے، لیکن بہر حال وجہ کچھ بھی سہی، حقیقت یہی ہے کہ ہمیں اب بھی نرم لمحوں اور سرد موسموں میں والدہ کی دعاؤں کا کیف شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی بھاری لمحہ آتا ہے، ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہماری والدہ اس بھاری لمحے ہمارے تحفظ کے لئے آ پہنچی ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اب ہمارے معاشرے سے ''عظیم مائیں'' کم کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟ عظیم قوم تو اس وقت ہی منظر عام پر آ سکتی ہے جب لیڈر بھی عظیم ہوں اور عظیم مائیں بھی بکثرت ہوں۔ شاید ہم نے مجموعی طور پر مادیت پرستی اور مادیت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ اس وجہ سے، یا اس کی کچھ دوسری وجوہات ہیں۔ یہ ایک بالکل علیحدہ موضوع ہے۔

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادر ہمدرد

حکیم محمد سعید اپنے علمی، تحقیقی اور طبی کاموں کی بدولت پاکستانی معاشرے میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے ادارے قائم کیے۔ ان کی شخصیت بے حد فعال اور اعلیٰ اقدار سے متصف تھی۔ افسوس کہ دہشت گردوں نے اُن کی جان لے کر ایک ایسے روشن چراغ کو بجھا دیا جس سے علم کے پیاسے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لیکن ان کے مقصد کا سفر رکا نہیں۔ ہمدرد یونیورسٹی، ہمدرد وقف اور بہت سے علمی، طبی اور تحقیقی اداروں کی صورت میں ان کا سفر جاری ہے۔ ہمدرد جنوبی ایشیاء کا ایک مسلمہ طبی ادارہ ہے۔ اس عظیم ادارے کی تعمیر و تشکیل میں حکیم محمد سعید اور ان کے بزرگ حکیم عبدالحمید کے علاوہ ان کی والدہ ماجدہ کا روشن کردار ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں خواجہ حسن نظامی نے حکیم سعید کی والدہ محترمہ کے حالات زندگی دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔

•••••••••••••••••••••••••••

''ایک دن کسی واقف کار نے مجھ سے کہا حکیم حافظ عبدالمجید مرحوم کی بیوی بڑی نصیب والی ہیں۔ کسی نے ان کو دست غیب کا عمل بتا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خاوند کا دواخانہ ہمدرد دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔''

''حکیم حافظ حاجی عبدالمجید مرحوم بانی دواخانہ ہمدرد کی خوش نصیب اور ہمہ صفت موصوف اہلیہ کا نام رابعہ تھا۔ حضرت رابعہ بصری کا جو درجہ اسلامی خواتین میں مانا جاتا ہے، یقیناً اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برکات کا اثر بیگم اہلیہ حکیم صاحب میں بھی تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے 1900ء میں بانی دواخانہ ہمدرد کا نکاح رابعہ بیگم صاحبہ سے ہوا تھا۔ اس وقت حکیم حافظ عبدالمجید صاحب پندرہ روپے ماہوار کے نوکر تھے۔ اس واسطے مہر بتیس روپے کا باندھا گیا تھا اور چونکہ بتیس روپے کا مہر شرعی مہر کہلاتا ہے اس واسطے قدرت نے ان کی زندگی کی شروعات کو بھی شریعت کا پابند دیا تھا۔''

(مادر ہمدرد صفحہ 185)

''مادر ہمدرد کی ابتدائی زندگی صدیوں پہلے کی مشہور خواتین کی سی زندگی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی اطاعت اور خدمت اس عمدگی سے کرتیں کہ حکیم صاحب کو اپنا گھر جنت معلوم ہوتا تھا۔ خدا نے اس خوش نصیب خاتون کو ان کی محنت اور شرافت کا بہت اچھا صلہ دیا، یعنی ان کو پانچ بچے عطا فرمائے۔ پہلے ایک لڑکی پیدا ہوئی، حمیدی بیگم نام رکھا گیا۔ پھر ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام عبدالحمید رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسری لڑکی پیدا ہوئیں جن کا نام محمودی بیگم رکھا گیا۔ ان کے بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا جن کا نام عبدالوحید رکھا گیا، مگر افسوس کہ حافظ عبدالوحید نے عین جوانی کی حالت میں انتقال کیا۔ میں ان کی بیماری کے دوران کئی بار بیمار پرسی کے لئے گیا۔

مادر ہمدرد کو آخری فرزند عطا ہوئے تو محمد سعید نام رکھا گیا۔ جو حکیم بھی ہیں، حافظ بھی ہیں اور کمالات طب یونانی کے علاوہ ویدک اور ڈاکٹری بھی خوب جانتے ہیں۔''

(مادر ہمدرد صفحہ 153-154)

''رابعہ بیگم صاحبہ مادر ہمدرد اپنے شوہر کی زندگی میں بھی گھر کے سب کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں اور شوہر کی وفات کے بعد بھی انہوں نے گھر کے کام کے لئے کبھی کوئی عورت نوکر نہیں رکھی، البتہ اب آخر زمانے میں محض ہاتھ بٹانے کے لئے دو ایک مامائیں ان کے ہاں تھیں، مگر اب بھی گھر کا سب کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ ان کے انتظام کا یہ عالم تھا کہ روزانہ نوکر سے سبزی کا نرخ معلوم کراتی تھیں اور موسم کی جو سبزی سب سے کم نرخ کی ہوتی وہی منگاتی تھیں، مگر اس سے زیادہ قابل ذکر اولاد کی سعادت مندی ہے کہ مرحوم کے بچے کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ ہمیں فلاں چیز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں بھاتی۔ یہ کیوں پکائی ہے؟ والدہ جو کچھ پکا کر سامنے رکھتی تھیں بچے خوشی خوشی کھا لیتے تھے۔''

''بانی ہمدرد کی وفات کے وقت سب سے بڑے لڑکے کی عمر تیرہ برس کی تھی۔ اس واسطے ماننا پڑتا ہے کہ ہمدرد کو جو بے نظیر عروج حاصل ہوا وہ سب مادر ہمدرد کی نیک نیتی اور حسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ پردے کے مخالف ہیں ان کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس پردہ نشین خاتون نے اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے اولاد کو بھی تربیت دی اور دواخانے کو اس طرح چلایا کہ روز بروز ترقی ہی کرتا رہا اور آج وہ دواخانہ برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیاء کا سب سے بڑا یونانی دواخانہ ہے۔''

حکیم محمد سعید اور ان کے بھائی بہن اپنی والدہ ماجدہ کو آپا صاحبہ کہتے تھے۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

''ہم سب کی ذمے داری ابتداء میں ہماری آپا والدہ مرحومہ پر رہی اور انہیں کی تربیت نے ہمیں وہ بنا دیا جو آج ہم ہیں۔'' (نذر حمید صفحہ 33)

جب حکیم محمد سعید کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے دادا جان اور چچا جان اور ماموؤں نے ہمدرد پر قبضہ جمانے کی کوشش کی، اس وقت یہ ان کی والدہ ہی تھیں جنہوں نے پردے میں رہ کر اس پودے کی آبیاری کی۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

''حکیم حافظ عبدالمجید کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہمدرد کے چاروں طرف فتنے جاگ اٹھے۔ حرص و آز کی ہر آنکھ وا ہوگئی۔ دادا اور چچا دعویدار بنے کہ ہمدرد ان کی ملکیت ہے۔ وہ بہر طور بیوہ مجید اور فرزندان ہمدرد کو ہر حق سے محروم کر دینے کے درپے تھے۔ اور دونوں ماموں جو ہمدرد میں بااختیار کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اب محنت کے صلے میں حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ہمدرد کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتے تھے اور اپنے علاوہ ہر ایک کو بے وزن اور بے وقعت رکھنے پر مصر۔'' (نذر حمید صفحہ 30)

ایسے سازشی اور حرص و لالچ کے ماحول میں اس خاتون نے حالات کا بڑی بہادری اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ تب مولانا قاضی مشرف علی بدایونی، جو ہمدرد کے ایک مخلص کارکن تھے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سہارا بنے۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

''بالآخر ہماری آپا نے دلیرانہ فیصلہ کیا کہ دادا ابا اور چچا جان کا جو حق ہے وہ انہیں ادا کر دیا جائے اور ماموں حافظ نور محمد کو ایک موثر کارکن کی حیثیت سے کام کی دعوت دی جائے۔ ان کا یہ بھی ایک مستحکم فیصلہ تھا کہ ان کی حیثیت قطعی طور پر ملازموں کی سی ہوگی اور ان کا حق محنت ان کو ادا کر دیا جائے گا اور وقت آنے پر عبدالمجید، حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی پوری قطعیت کے ساتھ بااختیار ہوں گے۔'' (نذری حمید، صفحہ 30-31)

مادر ہمدرد ایک مثالی خاتون تھیں۔ وہ زندگی بھر بڑی پابندی اور لگن سے نماز کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔ وہ اخلاق کی کوئی کوتاہی کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتی تھیں۔ اس معاملے میں وہ بڑی سخت گیر تھیں۔ توازن قائم رکھنے کا گر بھی جانتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم سعید کے الفاظ میں ''اگر ان میں یہ عظمتیں نہ ہوتیں تو ابا جان کے انتقال کے بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا۔'' حقیقت یہ ہے کہ ہمدرد کے قیام میں اپنے عظیم شوہر کی دست راست تھیں۔ خالص روغن بادام کے لئے وہ رات رات بھر بادام توڑ کر گریاں نکالا کرتی تھیں۔ حبوب مقوی معدہ کی گولیاں برسہا برس اپنے ہاتھوں سے بناتی رہی تھیں۔

زندگی میں انہوں نے کبھی کوئی نماز قضا نہ کی اور ایک دن پردہ نہ چھوڑا۔ وہ بہت کفایت شعار تھیں۔ جو پکاتی تھیں اس میں ایک لذت ہوتی تھی۔ ان کے شوہر دن بھر کی محنت کے بعد گھر آتے تو وہ ان کا خوشدلی کے ساتھ استقبال کرتیں۔ وہ کھانا لاکر سامنے رکھ دیتی تھیں۔ وہ اس آمدنی سے کچھ پیسے غائب کر دیتی تھیں۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ یوں وہ تھوڑی تھوڑی رقم الگ کر کے رکھتی رہیں۔ ان کے شوہر کو سب علم تھا، لیکن بے خبر بنے رہتے۔

بالآخر وہ وقت آیا جب کاروبار کی توسیع کے لئے ایک عمارت کی خریداری ناگزیر ہوگئی، مگر سرمایہ نہیں تھا۔ ایک رات ان کے شوہر تھکے ہارے گھر آئے۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ بیگم نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''سامنے کی دکان کی ضرورت ہے۔ دلال نے جو رقم بتائی ہے، وہ ہے نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا، کیا جائے۔''

وفا شعار دست راست بیوی سے اپنے شوہر کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے اپنی چارپائی سرکائی پیچھے کی دیوار کو توڑا، اس میں سے ایک تھیلی نکالی۔ رقم کی گنتی ہوئی تو دس ہزار سے اوپر روپے (چاندی کے) تھے۔

یوں کفایت شعار خاتون برسوں جو رقم ''چراتی'' رہیں اور شوہر سب کچھ جانتے ہوئے خاموش رہے اور اپنی پریشانی کے زمانے میں ایک بار بھی نہ پوچھا کہ وہ پیسے کہاں ہیں، وہی پس انداز کی ہوئی رقم جوں کی توں بیوی نے شوہر کے حوالے کر دی۔ اس طرح وہ عمارت خریدی گئی جہاں لال کنویں پر ہمدرد آج بھی قائم ہے۔

یہ حکیم محمد سعید کی عظیم والدہ کی تعلیم و تربیت، ایثار قربانی، منصوبہ بندی اور جرات کا فیضان تھا کہ ان کی اولاد نے کامیابیوں اور فتوحات کا ایک عظیم سلسلہ قائم کیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

حکیم محمد سعید کی والدہ ماجدہ کو گیارہویں شریف سے بے حد شغف تھا۔ وہ سال بھر اس کے لئے تیاریاں کرتی تھیں۔ حکیم محمد سعید لکھتے ہیں:

''ہمارے بچپن میں یاد ہے کہ اول شام 30-35 بکرے آیا کرتے تھے۔ بکرے رات کو کٹتے اور گوشت بنتا۔ رتجگا ہوتا اور اس میں بڑے چھوٹے سب ہی شریک ہوتے۔ پھر صبح قصائی رخصت ہوتے اور اللہ بندہ باورچی کندھے پر بڑا سا آہنی کفگیر رکھے اپنے مددگاروں کے ساتھ آموجود ہوتا۔ تو تلے اللہ بندے کو آپا کواڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر ہدایات دیتیں۔ اتنی دیگیں بریانی کی اور اتنی قورے کی پکنی ہیں۔ زردہ اتنے سیر چاولوں کا پکے گا۔ دوپہر تک درجنوں دیگیں تیار ہو جاتیں اور رات تک سینکڑوں سے بڑھ کر غریب غربا کھانا کھاتے رہتے۔ اس خدمت میں گھر کا ہر فرد مصروف رہتا۔ اس زمانے میں ساڑھے چار پانچ کا ایک بکرا آتا تھا۔ تو تلے کو درجنوں دیگوں کی پکوائی کا شاید ڈھائی روپیہ دیا جاتا تھا۔ آٹا روپے کا 35 سیر تھا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''وہ زندگی بھر ہم کو انتہائی سستا کھا کھلا کر جوان کرتی رہیں۔ مشہور تھا کہ رابعہ کے گھر جو ترکاری پکے سمجھو کہ وہ ترکاری ان دنوں سستی ہے، مگر وہ بڑی رقمیں پس انداز کر کے ضرورت مندوں کو خود جا جا کر خاموشی سے پہنچاتی رہیں۔''

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اللہ ہو، اللہ ہو''

مولانا عبدالستار ایدھی کا نام دکھی انسانیت کی خدمت اور فلاح و بہبود کے حوالے سے دنیا بھر میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی پوری زندگی زخمیوں اور انسانی لاشوں کو اٹھاتے گزر گئی اور بڑھاپے کے باوجود ابھی تک وہ اسی تندہی سے یہ کام کر رہے ہیں۔ حکمرانوں کی بے حسی، اپنوں کی مخالفت اور نیک کاموں میں روڑے اٹکانے کے باوجود ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آئی بلکہ انہوں نے اپنی مسلسل محنت سے ایدھی فاؤنڈیشن کو ایک بہت بڑا ادارہ بنا دیا۔ مولانا ایدھی اپنی پوری سماجی زندگی کا کریڈٹ اپنی والدہ محترمہ کو دیتے ہیں۔ جنہوں نے بچپن میں ہی انہیں لوگوں کی خدمت کرنا سکھا دیا۔ عبدالستار ایدھی نے اپنی سوانح حیات میں یہ جوش الفاظ میں اپنی والدہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یادوں کے دریچوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

• •

میرے والدین کا تعلق کھیتی باڑی کرنے والے غریب کسانوں سے تھا جو دریا کنارے آباد مختلف قبیلوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دست و گریباں رہتے۔ تین سو برس پہلے ٹھٹھہ میں ایک مذہبی پیشوا نے ہمارے آباؤ اجداد کو مسلمان کر کے ان کا نام ''مومن'' رکھا، جس کا مطلب پکا عقیدہ رکھنے والا صاحب ایمان ہے۔ بعد میں یہ نام بگڑ کر ''میمن'' ہو گیا۔ حضور نبی اکرمؐ اور حضرت بی بی خدیجہؓ کی تجارت میں مثالی شراکت اور شاندار روایت کے پیش نظر قبیلے کے ایک دانا بزرگ نے میرے خاندان والوں کو کاروبار کرنے کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت کی کہ لوگوں میں ایک دوسرے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ برادرانہ احساس بھی برقرار رہنا چاہیے۔

میمن لوگ سندھ میں ہالہ سے چلے اور ایک روایت کی رو سے، صحرائے تھر اور دوسری کے مطابق رن آف کچھ کے راستے سفر کرتے ہوئے گجرات کاٹھیاوار (بھارت) میں آ کر آباد ہوئے۔ وہ جہاں جہاں بھی ٹھہرے، آنے والے دور میں وہ مقام ان کی شناخت کا حوالہ بن گیا۔ جیسے وراول، دھوراجی اور کتیانہ میمن...... چونکہ شروع سے ہی ہمارا آبائی تعلق بستی بانٹوا سے تھا لہٰذا ہم ''بانٹوا میمن'' کہلائے۔ نسلی طور پر ہمارا تعلق ایدھی خاندان سے تھا۔ کئی سال پہلے ایدھی محلہ نام کا ایک گاؤں تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہو گیا۔ گجراتی زبان میں ایدھی کا مطلب سست اور کاہل ہے لیکن عملی طور پر ایدھی قبیلے کے لوگ انتہائی محنت کش، مشقت سے جی نہ چرانے والے اور پیدائشی طور پر انسان دوست تھے۔ یہ لوگ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی بھی جھگڑے فساد میں الجھنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میری والدہ، جن کا نام غربا تھا، کی شادی سے قبل میرے والد کی پہلی دو بیویاں وفات پا چکی تھیں۔ پہلی سے ایک بیٹا اور دوسری کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ان دنوں میمن خاندان میں شادیوں کے لئے مناسب لڑکیوں کی کمی تھی جن کے حصول کے لئے وافر دولت اور سونا درکار ہوا کرتا لہٰذا چاروناچار لوگوں کو شادی بیاہ کے لئے بنگال، کرناٹک اور مالابار تک رجوع کرنا پڑتا...... شادی کے موقع پر میری والدہ کو دس تولے سونا بطور تحفہ دیا گیا۔ اس زمانے میں، کسی مطلقہ یا بیوہ سے شادی کرنا رسوائی والی بات نہ تھی بلکہ اس قسم کی شادی کو اسلامی اصول کے مطابق کار ثواب سمجھا جاتا تھا...... میرے سوتیلے بہن اور بھائی کو میری خالہ نے پروان چڑھایا جبکہ ہماری پرورش ہماری ماں نے ہی کی۔

گجرات کاٹھیاوار میں جوناگڑھ کے قریب بانٹوا نام کا ایک قصبہ تھا، جس کے گھر کھلے اور گلیاں کشادہ تھیں۔ قریب قریب پچیس ہزار نفوس پر مشتمل اس گاؤں میں ایک چوتھائی میمن لوگ تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب عمومی طور پر سادہ زندگی پسند کی جاتی تھی۔ لہٰذا بانٹوا کے امیر، کبیر کاروباری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی مشترکہ خاندانی سسٹم کی روایت پر عمل کرتے ہوئے مل جل کر رہتے...... ایک ہی کمرے میں پورا پورا خاندان سما جاتا...... کچھ لوگ تنگ گلیوں کے اطراف میں اکٹھے رہتے اور باقی آس پاس کے ٹیلوں پر آباد تھے۔

ہم ایک علاقے ''دھوبی باڑہ'' میں رہتے تھے جو قدیم دھوبی آبادکاروں سے منسوب تھا یہیں میرے والد کا ایک ذاتی مکان تھا جہاں ہماری رہائش تھی۔ دادی کی وفات کے بعد والد نے دوسرے محلے میں رہائش اختیار کی...... جو کمرہ میسر آیا اس کا ایک برآمدہ تھا جسے لوہے کی جالی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چھت کے بغیر ایک غسل خانہ ہمارے اور دو دوسرے گھروں کے مشترکہ استعمال میں تھا۔ میرے سوتیلے بھائی کام کاج کے لئے بمبئی چلے گئے تو گھر میں میرے علاوہ ننھا بھائی عزیز اور بہن زبیدہ رہ گئے۔ رات آتی تو ہم فرش پر سیدھے ایک قطار میں روئی کے گدے بچھا کر سو جاتے۔ صبح سویرے میری والدہ مجھے طاق پر رکھے ہوئے برتنوں کو نیچے اتار لانے کے لئے الماری پر چڑھا دیتیں۔ وہ ہمارے لئے دال روٹی کا بندوبست کرتیں، جو ہم خوشی خوشی کھا لیتے۔ والدہ شام ڈھلے، دن بھر کے استعمال شدہ برتنوں کو دھو کر چمکا دیتیں اور میں انہیں دوبارہ الماری پر رکھ دیتا۔ میں نے اس دوران بھانپ لیا کہ والدہ ایک برتن کو کسی کام میں لائے بغیر الماری پر رہنے دیتیں...... جس میں روزانہ کے خرچ سے بچ رہنے والے پیسے ڈال دیئے جاتے...... گھر میں اور کوئی اس الماری پر چڑھنے والا نہ تھا......

میرے دادا حاجی رحمت اللہ کو ضرورت سے زیادہ پیسہ کمانے کا شوق نہ تھا۔ وہ قناعت پسند تھے اور جو ملتا، اسے صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیتے۔ انہوں نے اپنا طرز زندگی نچلے طبقے کے لوگوں جیسا اختیار کر رکھا تھا۔ خاندان برادری کا کوئی رکن مالی طور پر دیوالیہ ہو جاتا تو اس کی امداد کی جاتی یا پھر دو گروپوں کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا تو میرے دادا ثالث بن کر تمام جھگڑے ختم کرا دیتے۔

میرے والد، عبدالشکور ایدھی نے بھی ورثے میں ایسی ہی عادات پائی تھیں اور انہوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی میرے دادا کے پیشے کو اختیار کرتے ہوئے بمبئی میں کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے آبائی کام کو جاری رکھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر جب اس وقت کے دو معروف تاجروں حبیب رحمت اللہ اور حاجی داؤد پاریکھ نے حبیب بنک کی بنیاد رکھی تو والد سے رابطہ قائم کیا گیا، جنہوں نے دوستی کی بناء پر حبیب بنک میں نئے کھاتے کھلوانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

میں عام تعلیم سے کسی رغبت کے بغیر ہی بانٹوا کے تنگ و تاریک گلی کوچوں میں، طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرتے جوان ہوا۔ مجھے جس مدرسہ میں داخل کرایا گیا وہاں کے مقاصد سے مجھے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی البتہ میری شرارتوں اور اوٹ پٹانگ حرکتوں سے توجہ ہٹانے کے لئے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت مجھے ہر جماعت کا ''مانیٹر'' لگا دیا جاتا۔ میں جن لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا، وہ سارے میرے زیر اثر تھے۔ کبھی ہم پتھروں کا ایک ڈھیر لگاتے، کافی دور جا کر بجلی کی سی رفتار کے ساتھ سرپٹ بھاگتے، شور مچاتے، ٹھوکریں مارتے اور پتھروں کی اس دیوار کو زمین بوس کر دیتے جسے ہم نے خود بنایا ہوتا۔ بعض اوقات ہم منڈی تک فروٹ لے جانے والی گاڑیوں کا انتظار کرتے اور محض تفنن طبع کے لئے پیچھے سے خربوزے اور دوسرے موسمی پھل اڑا کر، رفو چکر ہو جاتے اور کہیں مل بیٹھ کر خوب دعوت اڑاتے...... یہ سب کچھ شکم پری کے لئے نہیں بلکہ...... محض تفریح کے لئے ہوا کرتا...... یہ بچپن کی اٹھکیلیاں تھیں۔ ہم کبھی کبھی درختوں پر چڑھ جاتے اور لوگوں کو ڈرانے کے لئے جنگلی جانوروں کی خوفناک آوازیں نکالتے۔ دن کا بیشتر وقت، کھیتوں میں دوڑتے اور گرد آلود کچے راستوں پر اچھلتے کودتے گزر جاتا تھا۔

میری ماں شریف، سمجھدار اور خاموش خاتون تھیں۔ اگرچہ ایسے مواقع بہت ہی کم آئے کہ میرے والدین کے درمیان اختلاف رائے کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہو، اس کے باوجود ماں اکثر اداس رہتیں...... شاید اس کیفیت کا تعلق ان دو بچوں کی جدائی سے ہو جنہیں پالنے پوسنے کے لئے خالہ کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ والد کبھی کبھار جھنجھلاہٹ کے ساتھ اپنا سر جھٹک کر کہتے......

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''کسی بیوہ سے شادی بھی عجب مصیبت ہے......اس نے پہلے ہی بہت سارے بکھیڑے پال رکھے ہوتے ہیں''۔

میمن برادری کے افراد سال کے دس مہینے بمبئی، رنگون، حیدرآباد اور کولمبو میں مختلف اشیاء کا کاروبار کرتے تھے......والد بھی اسی دھندے کے باعث زیادہ تر گھر سے دور رہتے۔ وہ جب باہر ہوتے تو ہمیں گری پستہ، کاجو اور ادرک تھیلوں میں، بھر بھر روانہ کرتے لیکن ماں اپنے اور میرے حصے کا سارا پھل فروٹ ان نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتیں جو ہم سے زیادہ ضرورت مند ہوتے۔ یہ وہ عادت تھی جو ماں نے بچپن ہی میں میرے اندر رچا بسا دی تھی۔ وہ ہر روز سکول جانے سے پہلے مجھے دو پیسے دیتیں لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ میں ان میں سے ایک پیسہ لازماً کسی دوسرے حاجت مند کو دونگا۔ وہ سمجھاتیں کہ کسی کو کچھ دینے سے پہلے یقین کر لیا کرو کہ تم سے خیرات لینے والا واقعی حق دار بھی ہے کہ نہیں......

میں جوں ہی سکول سے واپس آ کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا، ماں مجھ سے فوراً پوچھتیں:

''تم نے پیسوں کا کیا کیا؟''

میری اکھڑی اکھڑی وضاحت سنتے ہی وہ کہتیں......

''خود غرض لوگ اپنے سوا کسی کو بھی کچھ دینا نہیں جانتے......''

میں والدہ کے غم و غصہ سے بچنے کے لئے تیز تیز کھانا کھاتا۔ مارا ماری میں برتن صاف کرتا اور جس عجلت کے ساتھ کام ختم کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرتا، والدہ بھی اسی شدت کے ساتھ کہتیں......

''دیکھو بیٹا، غریبوں کو ستانا اچھی بات نہیں......ان کی ہر ممکن مدد کیا کرو......اوپر والے کو راضی رکھنے کا یہی ایک راستہ ہے......''

ماں کے چہرے پر رنج کے آثار اور لہجے میں تندی و تیزی مجھے ہمیشہ شرمسار کر دیتی۔ جب میں اپنے کیے کی تلافی اور ان کی شکایتوں کا ازالہ کر دیتا تو ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ جاتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق تو یہ ہے کہ ماں نے میری اچھی پرورش کے لئے، حد سے زیادہ جان ماری کرتے ہوئے بچپن میں میری جو سرزنش کی تھی، اس نے مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا سکھا دیا......اور یہ سبق بھی دیا کہ کسی چیز سے محرومی اس لالچ سے بہتر ہے جس کی بیج بونے سے پرشکوہ درخت تو اگیں لیکن بے ثمر رہیں۔

نادار اور حاجت مند لوگوں میں پیسوں کی تقسیم، اگرچہ ماضی کا ایک حصہ تھا لیکن تربیت کے باعث میں بے حد حساس ہو گیا تھا...... جس نے آگے چل کر اس قابل بنا دیا کہ حقیقی ضرورت مندوں اور پیشہ ور گداگروں کے درمیان فرق کو جان سکوں۔ بانٹوا ایک خوشحال قصبہ تھا اور اس کے آس پاس غریب بستیاں آباد تھیں۔ میں ان بستیوں میں جا کر وہاں کے غریبوں، ناداروں اور حاجت مندوں کی مشکلات معلوم کرتا اور واپس آکر ماں کو ان حالات سے آگاہ کرتا جو مجھے کھانے پینے کی چیزیں اور ادویات دے کر الٹے پاؤں، واپس بھیج دیتیں۔

بستی کے اکثر مرد کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے لہٰذا ماں زیادہ تر وقت ان گھروں کی پریشانیوں کو کم کرنے کیلئے اپنے آپ کو مصروف رکھتیں۔ وہ بچوں کی پیدائش کے وقت خواتین کو حوصلہ اور مشورہ دیتیں کہ وہ اپنی گھریلو مصروفیات کے علاوہ بھی کوئی کام کریں، تاکہ خود کفیل ہو سکیں۔ ہمیں کبھی محرومی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ والد پچاس ساٹھ روپے ماہانہ دے دیا کرتے، جس سے گزر بسر آسانی سے ہو جاتی۔ اس کے باوجود والدہ، دکان سے روئی کا بنڈل اٹھا لانے کو کہتیں جنہیں ہم معاوضے پر صاف کر دیتے۔ بھوسہ اور چھلکا تو ہم اپنے پاس چولہا جلا لینے کو رکھتے۔ باقی جو دھنی ہوئی صاف شدہ روئی ہوتی، اسے میں ایک بڑے بنڈل کی صورت میں اپنی پیٹھ پر اٹھائے بازار کے بیچوں بیچ "راستہ دو، راستہ دو" کی آواز لگاتا، دکاندار کو ان کا مال دیتا اور کام کی مزدوری لے کر واپس گھر آجاتا۔ ماں محنت کی توقیر پر پختہ ایمان رکھتی تھیں۔

والدہ، رمضان کے مقدس مہینے میں قبیلے کی دوسری میمن خواتین کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی چیزوں کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ تیار کرتیں، جنہیں میں بے کس و ناچار رشتہ داروں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناداروں کو ان کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی شکستہ کھڑکیوں کے ذریعے پہنچا آتا۔ اس تگ و دو کے دوران ایک سرگوشی کے انداز میں ماں کی آواز میری رہنمائی کرتی۔

''ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اسے اصل خیرات اس وقت کہا جا سکتا ہے جب دائیں ہاتھ کا پتہ بائیں ہاتھ کو بھی نہ چلے اور جس کی امداد کی جا رہی ہے، اس کی عزت نفس بھی قائم رہے۔''

میں یہ سن کر، تقسیم کی جانے والی اشیاء کو، ضرورت مندوں تک کم سے کم وقت میں پہنچانے کے لئے برق رفتاری کے ساتھ گلی کوچے عبور کرتا۔

عید، بقرعید کے موقعوں پر کچھ گھروں میں تو گھی کے چراغ جلتے، زرق برق لباس پہنے جاتے اور لوگ خوشیوں سے دوہرے تہرے ہو کر یہ تہوار سناتے۔ لیکن بانٹوا لبستی اور اس کے آس پاس پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں ایک عجیب تہی دامنی اور بے سروسامانی کا منظر نظر آتا۔ اداس اور سہمے ہوئے بچے، بے بس والدین...... ماں ان دکھی لوگوں کو کیسے بھول جا سکتی تھیں۔ وہ عید والے روز، صبح صبح، ان کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق لفافوں میں پیسے رکھ کر مجھے ہدایت کرتیں کہ ہمیشہ کی طرح پہلے جیسی تیزی کے ساتھ کام کو سرانجام دینا۔

ہمارے گھر کے نزدیک ایک کھاتے پیتے امیر کاروباری شخص نے ڈسپنسری کھول رکھی تھی۔ جب بھی وہاں سے گزرتا، ڈسپنسری کے قریب رہنے والی بزرگ خواتین مجھے دیکھ کر پیار سے آواز دیتیں:

''اوستاریا! کچھ ہمارا کام بھی کر...... نیکی کے اس کام میں ہمارا حصہ بھی ڈال دے۔ کھانے پینے کی چیزیں نادار لوگوں میں تقسیم کر دے''۔

میں پلک جھپکنے میں یہ سارا کام نمٹا دیتا۔ جب گھر کو واپس لوٹنے لگتا، گاؤں کے مرد اور عورتیں بڑے پیار اور چاؤ کے ساتھ مجھے پکڑ کر گلے لگاتے۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے اور میں ان کی دعائیں لیتا واپس آجاتا۔

ماں کی ہدایت پر، اکثر اوقات بانٹوا کے گلی کوچوں میں کسی معذور یا اپاہج کی اعانت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لئے گھومتا رہتا۔ اس دوران اگر حاجت روائی کے لئے، کوئی محتاج مجھے مل جاتا تو میں دوڑتا ہوا گھر جانے کے لئے چھوٹے سے چھوٹا راستہ اختیار کرتا...... سامنے آنے والی بیل گاڑیوں اور بازار میں لگائے گئے ٹھیلوں سے ٹکراتا اور لوگوں کو "آگے سے ہٹو" کی آواز میں خبردار کرتے ہوئے گھر سے ضروری سامان لے کر ضرورت مند کے حوالے کر آتا۔ شروع شروع میں تو لوگ میرے اس ہنگامہ خیز شور شرابے کے باعث بازار میں سے ایک طرف ہو جاتے رہے لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ میں صرف راستہ لینے کے لئے یہ واویلا مچاتا ہوں تو وہ ازراہ مذاق مجھے دبوچ لیتے۔ میں خود ہی ان کے چنگل سے نکل بھاگتا۔

میری مہربان اور نرم دل ماں، ان کاموں کی وجہ سے اکثر بھول جاتیں کہ میں ایک مدرسے میں پڑھتا بھی ہوں اور میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ وہ مطمئن تھیں کہ میں ان کی مرضی و منشاء کے مطابق غریبوں کے لئے دوڑ دھوپ میں کسی قسم کا جھول نہیں آنے دیتا۔ والدہ نے زندگی کے ابتدائی دنوں میں میرے لئے سماجی خدمت کے کاموں کا جو چناؤ کیا، شاید اسی نے میرے دل میں انسان دوستی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ وہ وقت جو فلاحی مصروفیات سے بچتا، میں اسے اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارتا۔ ہم سب نے اپنی ایک چھوٹی سی سرکس ٹیم بنا رکھی تھی۔ طرح طرح کے کھیل تماشوں اور اپنے فن کی نمائش کے لئے ہم دوسرے بچوں سے، ایک یا دو پیسے لیتے۔ غریبوں کیلئے تماشا مفت تھا...... مجھے ہر لمحہ اس بات کا احساس رہتا کہ ہماری اوٹ پٹانگ اور ناقص کارکردگی کی بناء دیکھنے والوں کے پیسے ضائع نہ ہوں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہم متوازی درختوں پر باندھی گئی رسیوں پر ہچکولے کھاتے چلتے، قلابازیاں لگاتے، کشتی کے مقابلے کرتے اور مزاحیہ خاکے پیش کر کے لوگوں کو خوب ہنساتے۔

اس دوران صرف ایک ہی مرتبہ میں نے کسی سے جھگڑا کیا...... وہ بھی اس وقت جب سکول کے چند سینئر طلباء، ایک بے بس ذہنی معذور کو مل کر ستا رہے تھے...... وہ خوف کے مارے، اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر گر رہا تھا...... ایک لڑکے نے اس کے بے حد قریب جا کر شیر کی آواز میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ وہ بچنے کی کوشش کرتا تو لڑکے اس کے بگڑے ہوئے بھیانک چہروں کے ساتھ خوفناک جانوروں جیسا روپ دھار کر شور مچاتے۔ اور وہ بے بسی کے اس عالم میں کسی باڑ میں گھرے ہوئے جانور کی طرح ادھر ادھر دوڑتا۔ میں بے حد رنجیدہ اور غصے کے عالم میں اس مظلوم پردیسی کو اذیت پہنچانے والے ایک لڑکے کے پاس پہنچا اور اکڑ کر اس سے کہا کہ...... وہ اس مظلوم پر مزید ستم نہ کرے۔ سارے لڑکے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میرا چھوٹا سا وجود ان سب کو اپنے پہلے شکار جیسا لگا۔ میں ان کے پاس یہ فیصلہ کر کے گیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، اس ستم رسیدہ لڑکے کو ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلوا کر ہی پیچھے ہٹوں گا لہٰذا میں نے تنہا، پوری قوت سے ان سب لڑکوں کے ساتھ جنگ کی...... اس تصادم میں مجھے تو جیسے بھی زخم آئے...... وہ ان جنونی لڑکوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔

گھر پہنچا تو والدہ نے میرے جسم پر آنے والے زخموں اور خراشوں کو دھو کر بڑی شفقت سے دوا لگائی اور کہا...... ''شاباش بیٹا! آج تم نے ایک ایسے انسان کو زبان دی ہے جسے خوف کے باعث جانے کب سے چپ سی لگی تھی...... اسے ستانے والے ابھی بچے ہیں۔ بڑے ہو کر انہیں خود ہی سمجھ آ جائے گی۔'' میں نے اپنی ماں کے ان خیالات کو پلے باندھ لیا اور ایسے لوگوں کی حالت پر ترس اور ہمدردی کے احساسات لے کر جوان ہوا جو خستہ ذہنی حالت کے باعث اپنی شناخت سے بھی محروم ہو چکے تھے۔

والد کام کاج سے فارغ ہو کر جب بھی گھر لوٹتے تو ہر پندرہ دن بعد آتے ہی میرے سر کے سارے بال صاف کر دیتے۔ میری ہیئت دیکھ کر برادری کے لوگوں نے میرا نام ''روٹی'' رکھ دیا۔ شاید اس لئے کہ میرا سر گول اور چپٹا تھا۔ ایک مرتبہ جب والد گھر آئے تو تعلیم سے میری عدم دلچسپی اور بیشتر وقت گھر سے باہر رہنے پر بہت فکر مند ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ستار اب راجکوٹ کے بورڈنگ سکول میں پڑھے گا۔ یوں تو یہ ایک اچھا فیصلہ تھا لیکن ماں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ ان کی دلیل تھی کہ ستار گھر پر نہیں ہو گا تو اتنے ڈھیر سارے میرے کام کون کرے گا۔ والد نے ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی یہ کیفیت دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا...... سچ تو یہ ہے کہ میری بھی جان میں جان آئی۔

ماں کو ورثے میں ایک تجارتی ادارے کے کچھ حصص ملے تھے جن کا منافع لینے کے لئے میں ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ منافع کے عوض وہ سونا خرید لیا کرتی تھیں۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ بمبئی کی ایک مل کے حصص برائے فروخت ہیں...... میں الماری کے اوپر رکھی ہانڈی میں سے وہ رقم لینے گھر کی جانب دوڑ پڑا جو میں نے ریزہ ریزہ جمع کی تھی۔ میں نے دس، دس روپے کے تین حصص خریدے اور گھر جا کر چپکے سے متعلقہ کاغذات ہانڈی میں رکھ دیئے۔

ایک دوپہر، ہم فٹ بال میچ دیکھنے جارہے تھے۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک اجنبی تھڑے پر لیٹا دکھائی دیا...... ایسا لگا کہ یہ شخص پیشہ ور گداگر نہیں ہے...... وہ زخمی تھا اور بخار کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس مسافر کی حالت دیکھ کر اپنے ساتھی سے کہا......

"تم چلو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا"۔

واپس گھر پہنچتے ہی ماں کو ساری بات بتائی...... انہوں نے مجھے روئی کا گدا، کمبل، دوائیاں، کپڑے اور کچھ کھانے پینے کی اشیاء دیں، جنہیں لے کر میں اجنبی کے پاس پہنچا اور اس کے گہرے زخموں کو صاف کیا، مرہم پٹی کی...... میں سوچتا رہا کہ راہ میں پڑے اس بے وسیلہ شخص کو اتنے سارے زخم کہاں سے لگے......؟ میں نے روٹی اس کے سامنے رکھی تو وہ روٹی کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور...... اس سے باتیں کرتا جاتا......! پھر ہم اسے مسجد میں لے گئے۔

وہ عجیب وغریب شخص سب میں منفرد تھا۔ اس کے ہر وقت کھلے آسمان کو دیکھتے اور دور خلاء میں گھورتے رہنے کی عادت نے اسے اور بھی پراسرار بنا دیا تھا۔ اسی نے مجھے دینی اسرار ورموز سکھائے اور خیرات کے معنی بھی سمجھائے۔

میری بہن زبیدہ کی شادی، خالہ زاد بھائی سے طے پائی تھی، جب وہ دونوں نابالغ تھے۔ میرے والدین کو ہمیشہ دولت کی نمائش سے نفرت رہی...... ماں نے زبیدہ کو دیئے جانے والے برائے نام جہیز پر اعتراض کرنے والی ایک خاتون سے کہا......

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جہیز میں کمی کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہمیں اپنی بیٹی سے پیار نہیں۔ ہمیں بیٹی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی سادگی...... ہماری یہ دونوں محبتیں جہیز میں بھی شامل ہیں۔''

زبیدہ کی شادی کے موقع پر مسجد میں ایک سادہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جہاں نکاح پڑھا گیا اور برادری کے ریکارڈ رجسٹر میں درج کرا دیا گیا۔ ماں گھر کے سامنے ایک خیمے کے نیچے ہو'' کا دم کرتے ہوئے مجھے پھونکیں مارتیں اور پھر میرے کانوں میں سرگوشی کرتیں

''بیٹے...... میری ساری دعائیں تیرے لئے ہیں......''

ہم اتنے غریب تو نہ تھے لیکن ہماری بود و باش بے حد سادہ تھی...... مختصر سا گھریلو سامان ہماری ضروریات کے لئے کافی تھا۔ ماں، اپنی بہن سے اس کے بچوں کے پرانے استعمال شدہ کپڑے ہمارے پہننے کے لئے منگوا لیتی تھیں۔ سالہا سال محنت مزدوری کر کے اکثر لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ ان کا معیار زندگی اب پہلے سے بہت بہتر تھا لیکن بڑے بڑے بنگلوں اور گھروں میں رکھا ہوا قیمتی فرنیچر کبھی بھی میرے والدین کے لئے رشک کا باعث نہ بن سکا۔ والد اکثر اس بات پر زور دیتے کہ سادگی سے بڑھ کر افادیت کا حامل کوئی اور طرز زندگی نہیں ہے...... سادگی اپنی مرضی و منشاء سے اپنائی گئی تھی، کسی جبر کے تحت نہیں...... اور ہم اسی میں خوش تھے۔ اس دور کی خواتین بہت سلیقہ مند تھیں۔ وہ اپنے فرش خود صاف کرتیں اور انہیں پالش کر کے چمکائے رکھتیں۔ ماں باقاعدگی سے ہر روز جھاڑو پوچا دیتیں۔ ہم سارے گھر والے فرش پر ہی سوتے، وہیں اٹھتے بیٹھتے اور کھانا کھاتے۔ مجھے بچپن میں کھڑے پاجاموں پر سرخ رنگ کی قمیض پہننا پسند تھا۔ ماں میرے شوق کے مطابق سبز، نیلے اور لال رنگ کے کرتے سی کر دیا کرتی تھیں جنہیں میں بہت سنبھال کر پہنتا۔

جب میں چودہ برس کا ہوا تو ایک روز میں نے اپنا دل ایک لڑکی کے لئے دھڑکتے محسوس کیا...... وہ بے حد شرمیلی تھی لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس کے لئے میرے دل میں انس موجود ہے۔ وہ ہمارے گھر کے اوپر والے کمرے میں رہتی تھی۔ جب سویرے سویرے وہ اپنے نازک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلو میں گگری اٹھائے نیچے اترتی تو میں نماز کے لئے وضو کر رہا ہوتا۔ وہ نلکے سے پانی بھرتی اور پلک جھپکتے سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ کبھی کبھی وہ مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیتی...... بعض اوقات میں اس کی واپسی کا انتظار کرتا لیکن سیڑھیوں میں ڈوبنے والا وہ چاند پھر کبھی طلوع نہ ہوا اور میں نے بھی چپ سادھ کر صبح دیدار کے سارے منظروں سے آنکھیں پھیر لیں۔ میرے عشق خانہ خراب کی یہ لمحاتی سرگرمیاں اچانک اس وقت دم توڑ گئیں جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہونے والی ہے۔ یوں یہ قصہ یہیں ختم ہو گیا۔

جب میں خیراتی کام سے برادری کی اجارہ داری توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو ماں روز بروز کمزور اور نحیف ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ پچھلے چار برسوں میں وہ کمزور ہوتے ہوتے اپنے سائے کی مانند ہو چکی تھیں اور ان کا سارا رعب داب اور طمطراق ختم ہو چکا تھا۔ وہ بہت کم بات کرتیں...... بس زیر لب کچھ کہتی رہتیں۔ کبھی ایسے روتیں کہ چپ رائے نہ بنتی اور کبھی بلاوجہ ہنسنے لگ جاتیں...... شاید ان کی اس کیفیت کا باعث، پہلے بچوں سے جدائی ہو......!

والدہ کی بیماری کے دوران ایک اچھوتے پہلو سے میرا سامنا ہوا۔ زیادہ بیمار لوگوں کو ایک سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ٹرانسپورٹ کی سہولت تقریباً ناپید تھی۔ پہلی بار والدہ کو ہسپتال لے جانے کے لئے ایمبولینس کا انتظام کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ پورے کراچی شہر میں صرف ایک گاڑی ہے جو ''ریڈ کراس'' کی ملکیت ہے اور اسے حاصل کرنا آسان نہیں...... کئی بار تو میں والدہ کو رکشا میں لے کر گیا۔ رکشا میں ڈالنے کے بعد میں پچھلی سیٹ پر لٹک جاتا اور مضبوطی کے ساتھ انہیں دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتا...... رکشا شور مچاتا، جھٹکے کھاتا ہمیں ہسپتال پہنچاتا۔

ایک روز، ہمسایہ دوڑتا ہوا ڈسپنسری میں آیا اور بتایا کہ سانس اکھڑنے کے باعث والدہ گر پڑی ہیں...... گھر کا دروازہ کھلا تھا اور وہ فرش پر بیٹھی برتن دھو رہی تھیں کہ باہر کھیلتے ہوئے چند بچوں نے انہیں گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جب تک میں دوڑتا بھاگتا گھر پہنچا، ان کی سانس اکھڑ چکی تھی اور فالج کے شدید حملے سے، جسم کا بایاں حصہ متاثر ہو چکا تھا۔ والد اور بھائی بھی بے حد پریشان تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس عورت نے مجھے جنم دیا، شفقت سے نوازا، اس کی خدمت کرنا میں اپنا اولین فرض سمجھتا تھا، ماں کے لئے یہ سب کچھ غیر اہم تھا۔ میں جتنا کہتا کہ ان کا خیال رکھنے میں میرے لئے بے پایاں خوشی اور اطمینان ہے، اتنا ہی وہ بگڑتیں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہی کہتیں...... ''اللہ سے دعا کرو کہ وہ مجھے آزاد کر دے محتاجی کے باعث تمہیں پہنچتی ہے''۔ کبھی پیار سے مناتا، کبھی ڈانٹ بھی دیتا، ایسے وقت میں وہ اپنا دھیان بالکل ہٹا لیتیں اور اپنے ہی خول میں چھپ جاتیں۔ ہر صبح میں انہیں کھانا کھلاتا، اور ان کے کپڑے بدلتا، دوا دیتا۔ پھر جب تک وہ پرسکون نہ ہو جاتیں، ان کے ساتھ ہی رہتا۔ ماں کی بیماری کے چند ہی ماہ بعد احساس ہوا کہ روایتی گھر دار عورتیں، مردوں کی ذمہ داری ہوا کرتی ہیں...... بیمار ہو جائیں تو ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ غربت ہو تو یہ صورتحال ایک بھیانک خواب سے کم نہیں۔ اب میں والدہ کے سرہانے بیٹھا رہتا اور ڈسپنسری کے کاموں سے لوگوں کو گھر تک ہی آنا پڑتا۔ والد کے گھر آنے کا وقت ہو جاتا تو ماں اپنا چہرہ موڑ کر دروازے کی جانب تکتیں، میں پرانے وقتوں کے بارے میں ہنسی مذاق کر کے ماں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ......اور باقاعدگی کے ساتھ، منہ ہاتھ دھلاتا...... ایک روز میں نے ان سے کہا...... ماں یاد ہے کہ میں جب بیمار ہوتا تھا تو آپ مجھے نہلایا دھلایا کرتی تھیں...... آج میں بھی وہی کچھ کر رہا ہوں......'' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بالکل چارپائی سے لگ گئیں، اب انہیں غسل خانے تک لے جانا بھی محال ہو چکا تھا۔ اس دوران حجاب کے کئی ایسے مواقع بھی آئے کہ ان کی دیکھ بھال کرنے، انہیں اٹھانے بٹھانے اور نہلانے میں بے حد دقت پیش آئی۔

ہر لمحہ، مجھے دست بستہ دیکھ کر، ماں کچھ زیادہ بے چارگی اور معصومیت سے دو چار رہنے لگیں۔ وہ اپنے طور پر شرمسار اور اداس تھیں کہ ان کا وجود بوجھ بن گیا ہے مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے شادی کر ہی لینی چاہیے۔ جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے، سب جانتے تھے کہ میں کسی کاہل عورت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بیوی کی حیثیت میں ایسی عورت کی تمنا تھی جو شریک حیات کے علاوہ کارکن بھی ہو اور، کام سے لگن اور محنت سے انہماک کا اندازہ، میٹھادر کی آزمائش گاہ میں ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکے......

امینہ، حال ہی میں طلاق حاصل کرنے کے بعد اپنے ایک بچے کو لے کر ہمارے ہاں کام کر رہی تھی ...... وہ میٹرنٹی یونٹ میں، جونیئر طالبات کی انچارج تھی۔ اس کے کام میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا رجحان محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غریب عورتوں اور بچوں سے خدا ترسی کے ساتھ پیش آتی۔ وہ ذہین بھی تھی، حاضر جواب بھی، اسے اپنی کارکردگی پر بھروسہ بھی تھا...... ناک نقشہ بھی گوارا تھا۔

ایک روز، میں نے اسے دفتر طلب کیا اور سامنے بیٹھ جانے کو کہا...... لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شادی جیسے حساس موضوع پر، کچھ کہنے سننے کیلئے شاید مزید وقت درکار تھا...... اس دوران میرا رویہ اس کی جانب عجیب جھکاؤ کا سا تھا...... باقی سب لوگ حیران تھے۔

مجھے اپنے آپ سے گلہ تھا کہ میں شادی جیسے ایک عام مسئلے کا ابھی تک جرات مندی کے ساتھ سامنا نہیں کر سکا ہوں...... میں نے امینہ کو دوبارہ طلب کیا اور سامنے بیٹھنے کا حکم دیا...... اب کی مرتبہ، میں نے بے دھڑک کہہ دیا...... ''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' امینہ، اچانک چونک گئی...... صدمہ تھا یا خوشگوار حیرت...... جو کچھ بھی تھا اس کے چہرے پر عیاں تھا...... وہ صاف جواب دینے کی بجائے گھبراہٹ کے عالم میں ہنس دی اور اپنی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے زیر لب صرف اتنا کہا...... ''ماں سے پوچھ کر بتاؤں گی''...... جب اس واقعہ کو کافی دن گزر گئے تو خیال آیا کہ اب تک تو، اس نے اپنی ماں سے پوچھ ہی لیا ہو گا؟...... گومگو کی اس حالت سے دو چار، اس سے ایک بار پھر ملا...... اس نے ادپر دیکھے بغیر یہ مژدہ سنایا کہ ماں نہیں مانتی...... پھر مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی...... ''مجھے دینے کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟...... تم مجھے کہاں رکھو گے؟...... تمہاری بیمار ماں بھی تمہارے پاس رہتی ہے اور تم خود ڈسپنسری کے باہر بنچ پر سوتے ہو۔''...... میں جان گیا کہ امینہ خود ہی انکاری ہے...... ماں کا تو فقط بہانہ ہے۔

ہمارے علاقے میں، پہلے داڑھی رکھنے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ اس وقت سو میں سے دو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چار ہی بارلیش ہوں گے۔نو جوانی میں ہی داڑھی کے باعث اکثر لوگوں نے مجھے ملا کہنا شروع کر دیا۔میں نے دل ودماغ سے ان پریشان کن خیالات کو نکال باہر پھینکا کہ محض شادی کے لئے ،اپنی شناخت کیوں تبدیل کروں......سوچا کہ کوئی عورت، میری زندگی میں ہے تو اسے میرے متعین کردہ راستوں پر چل کر زندگی گزارنا ہوگی۔

اس دوران گذشتہ دو برسوں میں میرے لئے سات رشتے تجویز ہوئے۔سبھی نے ایک سا جواب دے کر انکار کر دیا کہ...... میں بہت غریب ہوں یا سخت گیر...... مذہبی خیالات کا آدمی ہوں......یا پھر بہت کنجوس......آخری اعتراض بہت زیادہ تھا کہ میں ضروری پڑتال کئے بغیر ایک پیسہ دینے کا روادار نہیں......البتہ ماں کی بیماری پر بغیر کسی چون وچرا کے بے دھڑک پیسہ خرچ کیا۔

اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی شادی کے مسئلہ پر خاموش ہو جانا چاہیے اور موجود حالات سے مفاہمت کر لینی چاہیے کیونکہ ہر طرف سے انکار، اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنے مقدر پر خاموش رہوں اور ہیجان واضطراب کو ترک کر دوں۔

ماں اب کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھیں اور ان کا وزن اس قدر گھٹ گیا تھا کہ جب میں انہیں نہلانے لگتا تو نقاہت کے باعث سٹول سے گر پڑتیں۔مجبوراً ان کے جسم کو گیلے تولیے سے صاف کرنا شروع کر دیا،اسی طرح میں ان کا سر بھی بمشکل تمام دھلاتا......پھر ان کے بے جان الجھے ہوئے ویران بالوں میں کنگھی کرتا اور کمرے کا سارا فرش صاف کرتا...... یہ سارا منظر وہ اپنی بوڑھی انکھوں کے جھروکے سے دیکھ کر کڑھتی رہتیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یہ ایک غیر معمولی کام ہے۔

وہ ہر وقت زیر لب اللہ ہو، اللہ ہو کا ورد کرتی رہتیں اور بس...... میں اپنی ماں کی حالت زار کو دیکھ دیکھ کر اس قدر درماندہ حال تھا کہ ان کے مرنے سے پہلے ہی ان کے ماتم میں نوحہ کناں تھا......پھر میری زندگی میں، ایک بدنصیب صبح ایسی بھی آئی کہ ان کی رگ دماغ پھٹ گئی اور پانچ روز تک موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ مجھے ہمیشہ کے لئے تنہا کر گئیں۔جب ہم نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس معتبر ہستی کو منوں مٹی تلے دفنا دیا تو ماں کے بغیر، گھر جانے کے لئے میرے پاس حوصلہ نہ تھا۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ سیدھا ڈسپنسری چلا گیا۔

ماں، اپنی آخری منزل کو جا چکی تھی...... سو کہانی ختم...... اب سیلاب غم کو روکنے کی مزید سکت نہ رکھتا تھا...... میں نے، کھڑکیاں اور دروازے اندر سے مقفل کر لئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا...... زندگی کی پوری تاریخ، درد و غم کے روپ میں ڈھل گئی...... چھوٹی چھوٹی ہر بات، خیرات کے پیکٹ اور حصے کا پیسہ نہ ملنے پر پیار بھری ڈانٹ اور پھر ان کی دعائیں...... میں ان لمحات کو یاد کر کے رویا جو میں نے ماں کی چار پائی سے لگ کر گزارے تھے...... وہ آنکھوں سے ہمیشہ یہی اشارہ کرتیں کہ مجھے، ان کے پاس ٹھہرنے کی بجائے کام پر چلے جانا چاہیے۔

اپنی ماں کی ہستی اور اس کے تجربات سے متحرک ہوا تو مجھ میں، پوری دنیا کی کایا پلٹنے کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ماں نے جانے سے پہلے میرے دل میں تڑپ پیدا کر دی تھی کہ جس طرح میں نے ان کی خدمت کی ہے...... ویسی ہی خدمت، انسانیت کے لئے بجا لاؤں...... انہوں نے خیرات کے ارفع تصور کے احترام میں شاید مجھے، تمام انسانوں کی خدمت کرتے رہنے کی وصیت کر دی تھی...... اب میرے پاس، لوٹ جانے کے لئے...... کوئی دوسرا راستہ نہ تھا!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

LUCKEY START

ورلڈ کرکٹ کے فاتح اور قومی ٹیم کے سابق کپتان عمران خان اگرچہ اب تحریک انصاف جیسی منظم سیاسی پارٹی کے سربراہ ہیں لیکن اُن کی اصل وجہ شہرت کرکٹ ہی ہے۔ جس نے اُنہیں دُنیا بھر میں مقبول بنا دیا۔ لندن کے ایک ہسپتال میں کینسر کے باعث جب اُن کی والدہ کا انتقال ہوا تو عمران کی اُن سے بے پناہ عقیدت ہی شوکت خانم کینسر ہسپتال جیسے عظیم اور بڑے پراجیکٹ کی وجہ بنی۔ اِن چند صفحات میں عمران خان نے اپنی والدہ اور اُن کے والد اکرام اللہ نیازی نے عمران کی اُن سے محبت کا ادھورا خاکہ پیش کیا ہے۔

••••••••••••••••••••••••

میری زندگی کے ابتدائی گیارہ سال تو اس طرح گزرے کہ میں اور کرکٹ کی گیم خاصے الگ تھلگ رہے بلکہ سچ پوچھیے تو ان دنوں میں اپنے والد کی اس رائے سے گویا متفق تھا کہ کرکٹ اکتا دینے والی گیم ہے۔ کیونکہ اس میں کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ میری والدہ کی طرف سے تو اکثر عزیز و اقارب نے کرکٹ کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ میری والدہ کبھی پرانی یادوں کے حوالے سے بتاتی تھیں کہ قیام پاکستان سے بہت پہلے جب ان کا خاندان جالندھر میں آباد تھا تو ان کے کئی رشتہ دار دن بھر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ گویا کرکٹ کے پودے نے بیسویں صدی کے اوائل میں ہی برگ و بار لانے شروع کر دیئے تھے۔ میری والدہ اور ان کی دو بہنوں نے تین ایسے بیٹوں کو جنم دیا جنھوں نے کرکٹ کی دنیا میں اپنے وطن کو لیڈ کیا۔ یعنی ماجد خان، جاوید برکی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں۔ لہٰذا یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کرکٹ میرے خون میں بخوبی اور واقعی رچی ہوئی تھی۔ جب میں گیارہ سال کا ہوا تو بہت سے ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے جو مجھے کرکٹر بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔

اکرام اللہ نیازی اپنے بیٹے عمران کی پیدائش کے حوالے سے بتاتے ہیں۔

25 نومبر 1956ء کی بات تھی۔ میری بیوی لیڈی ولنگٹن ہسپتال لاہور میں داخل تھی۔ کافی وقت گزر چکا تھا۔ حتیٰ کہ صبح کے نو بج گئے۔ میں نے ناشتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ سوچا آج چل کے پوریوں کا ناشتہ کروں۔ ناشتہ سے فارغ ہو کے لوٹا تو معلوم ہوا کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ یعنی عمران تشریف لائے تھے۔ نام کس نے رکھا...... یہ اچھی طرح یاد نہیں۔ غالباً میری بیوی نے یہ نام منتخب کیا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر سے مجھے بالکل ویسی ہی مسرت ہوئی جیسی بیٹی کی پیدائش پر ہوتی۔ جب عمران ایک سال کا ہوا تو اسکی ماں اسے برٹ انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ ریڈ کراس کے میلے میں لے گئی۔ گول مٹول سرخ وسفید اور صحت مند عمران کو صحت مند بچوں میں اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ میری بیوی نے اس انعام کے بارے میں جب مجھے بتایا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "It is a Luckey Start"۔

عمران بڑا ہوا تو اس نے کسی معاملے میں ہمیں تنگ نہیں کیا۔ ایک بیٹے کے طور پر وہ ہمیشہ ہمارا فرمانبردار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ ماں کی بے حد عزت کی ہے۔ اسے ماں کے ساتھ حد درجہ پیار تھا۔ ماں کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی بے حد گہری تھی۔ حالانکہ ماں اسے اکثر ڈانٹتی رہتی تھی لیکن جواباً وہ مسکرا دیتا تھا۔ ماں کے آگے کبھی نہیں بولتا تھا۔ حتیٰ کہ بہنوں کی ڈانٹ بھی وہ مسکرا کے سن لیتا ہے۔ اس کا رویہ ماں اور بہنوں کے ساتھ بے حد GENTLE رہا ہے۔ وہ ایک محبت بھرا بھائی اور بیٹا ہے۔ جب ایک بار عمران کی ٹانگ پر چوٹ لگی تو اس کی ماں کو سخت تشویش ہوئی۔ وہ اکثر جھنجھلا کے عمران کو کہا کرتی تھی۔

''بیٹا مت کھیلا کرو۔ تم نے ضرور کھیلنا ہے۔ اب بس کرو۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ خوش دلی سے محبت بھری ڈانٹ سنتا اور مسکرا دیتا۔

عمران کو زندگی میں، میں نے محض ایک بار رنجیدہ دیکھا ہے اسے جذباتی دھچکے کی گرفت میں دیکھا ہے یہ وہ دن تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا اتنا پژمردہ اور غم بار میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اسے اپنی ماں سے بہت گہری محبت تھی۔ جن دنوں میری بیوی لندن کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھی ان دنوں میں بھی وہیں ایک اور ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ عمران سارا سارا دن میرے بستر کے پاس بیٹھا رہتا۔ میں اسے اکثر کہتا جاؤ بیٹا اب چلے جاؤ۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتا اور بیٹھا رہتا۔ وہ جب میرے پاس نہ ہوتا تو اپنی ماں کے پاس ہوتا اور جب وہاں نہ ہوتا تو میرے پاس ہوتا۔ حالانکہ دونوں ہسپتالوں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ اس نے ہماری تیمارداری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں جیسے عمران کو لڑکیوں کے سوا کوئی کام نہیں۔ وہ ہر وقت لڑکیوں میں گھرا رہتا ہے۔ حالانکہ میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ لندن میں ان دنوں دو بیماروں میں گھرا رہا۔ اور اپنا پورا وقت انہیں دیا۔

عمران کے کردار کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل بھی اسراف پسند نہ تھا۔ بلکہ اسراف کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایک بہت بڑے خاندان میں پارٹی تھی۔ عمران بھی مدعو تھا۔ عمران گھر لوٹا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات میرے اندازے کی تائید کر رہے تھے میں نے پوچھ لیا۔

''کیوں بیٹے پارٹی کیسی رہی۔؟''

''بے حد بور......'' عمران نے بری سی شکل بنا کے جواب دیا۔

''کیوں کیا ہوا......؟'' میں نے تجسس سے سوال کیا۔

''سب لوگ وہاں بوتلیں اِدھر اُدھر پھینک رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پیسٹریاں مار رہے تھے۔ گھاس پر اِدھر اُدھر بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور پیسٹریاں بھی پیروں تلے آ رہی تھیں۔ یہ سب مجھے برا لگ رہا تھا۔ آغا جان کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہیں یہ سب میسر نہیں اور ادھر یہ لوگ ہیں جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان چیزوں سے کھیل کھیل رہے تھے"

پھر اچانک عمران نے ایک عجیب وغریب سوال کر ڈالا۔

"آغا جان ہم امیر ہیں یا غریب"

چھوٹے سے عمران نے بڑا مشکل سوال پوچھ ڈالا تھا۔ اگر جواب دیتا ہوں کہ امیر ہیں تو اس کی توقعات بڑھ جائیں گی اور اگر کہتا ہوں غریب ہیں تو اسے کمپلیکس ہو جائے گا بالآخر چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے کہا۔

"جب ہم خوب محنت کرتے ہیں تو امیر ہو جاتے ہیں اور جب محنت سے جی چرانے لگتے ہیں تو غریب ہو جاتے ہیں۔"

عمران نے جواب سنا اور سر ہلا دیا گویا وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔ اس مکالمے کے ایک دو روز بعد عمران کی والدہ نے تعجب کے ساتھ بتایا کہ عمران کے معمولات میں تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ کھیل کے وقت کھیلتا نہیں بلکہ اپنے کمرے میں گھسا رہتا ہے۔ وہ کھیلنے سے قبل ہوم ورک کیا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا وہ واقعی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں بیٹے آپ آج کھیلنے نہیں گئے......؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آغا جان میں امیر بننا چاہتا ہوں اس لئے زیادہ کام کر رہا ہوں" اس کا جواب تھا۔

عمران خان اپنے خلاف لگنے والے الزامات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں جب اخباروں اور رسالوں میں اس قسم کے مضمون پڑھتا کہ عمران "سیکس سمبل" ہے تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ پہلے پہل میں اس "انکشاف" سے واقعی متعجب ہوا تھا کہ میں تو شروع سے اس احساس میں مبتلا تھا کہ میری شکل بس یونہی سی ہے۔ دراصل لوگوں نے 1976ء کے بعد میری کرکٹ سے زیادہ میری شکل وصورت میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میری شکل وشباہت جیسی بھی ہے مگر اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اس کا دانستہ فائدہ نہیں اُٹھایا۔ میں فطری طور پر شرمیلا ہوں لیکن اس حقیقت کو غرور کا نام دیا گیا یہ ایک ایسا الزام ہے جو ساری زندگی میری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذات پر لاگو رہا۔ جو باتیں میرے نزدیک غلط ہیں۔ میں ان کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں ہر رات کو اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے زندگی میں ایمانداری پر قائم رہنے کی توفیق دے اور صحت و شادمانی عطا کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماں

''علی پور کا ایلی''، ''الکھ نگری'' ''لبیک'' اور ان جیسی بے شمار کتابوں کے خالق ممتاز مفتی اردو ادب کے ایسے درخشاں ستارے تھے جن کی تحریروں کی چمک کبھی ماند نہیں ہوگی کیونکہ انہوں نے دلوں کو امر کر دینے والی تحریریں لکھیں۔ ممتاز مفتی نے جو مقام حاصل کیا ان کے بقول اس میں ان کی ماں کی دعائیں شامل ہیں۔ ماں کی دعاؤں نے انہیں چاروں طرف سے گھیرے رکھا۔ ممتاز مفتی نے اپنی ''اماں'' کی کہانی آسان الفاظ کے ساتھ بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے۔ جس سے ان کی والدہ محترمہ کی تصویر سامنے آتی ہے۔

••••••••••••••••••••••••

اماں ازلی طور پر ایک المیہ تھی۔ وہ ایک ایسا کنول تھی جو آنسوؤں کی جھیل میں کھلتا ہے اور شبنم کی بھیگ سے تر و تازہ رہتا ہے۔

دکھ اسے راس تھا۔ خوشی کا لمحہ آجاتا تو گھبرا جاتی۔ یہ کیا ہوا۔ جیسے کوئی اجنبی آ گیا ہو۔

تین باتیں اماں کی ہڈیوں میں رچی بسی ہوئی تھیں...... عجز، خدمت، کام۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی تھی لیکن اسے بڑا بننا نہ آتا تھا۔ بنا دیا جاتا تو پریشان ہو جاتی۔ سمجھ میں نہ آتا کہ بڑائی قائم رکھنے کے لئے کیا کرے۔

وہ اس بات کی محتاج تھی کہ کوئی ہو جس کی خدمت میں وہ لگی رہے، لگی رہے...... ایسے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہے۔ ازلی طور پر وہ ایک کا ی تھی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ اسے بہت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کام آتے تھے کوئی نیا کام دیکھتی تو جھٹ اسے سیکھنے لگ جاتی اور چند روز میں ایسی دسترس حاصل کر لیتی جیسے وہ اس کا خاندانی کام ہو۔

اماں کا نام صغرا بیگم تھا۔ انہیں سب چھوٹے بڑے بھابھی کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال جاذب توجہ نہ تھے۔ بچپن میں ہی اس کی شادی ہو گئی۔ ساڑھے تین سال وہ اپنے گھر کی مالکہ رہی۔ پھر اسی گھر کی نوکرانی بنا دی گئی۔

اس مختصر سہاگ کے دوران اس کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ پہلے بیٹی پھر بیٹا۔ میری بہن اور میں۔ پھر ہمارے گھر میں نئی امی آ گئی۔ نئی امی نے آتے ہی مطالبہ کر دیا کہ نوکرانی کی تنخواہ لگا دی جائے اور اس کا چولہ الگ کر دیا جائے۔ یوں گھر میں دو چولہے ہو گئے۔ اماں پہلے ابا اور امی کا کھانا پکاتی، انہیں کھلاتی۔ جب وہ کھا پی کر فارغ ہو جاتے تو پھر اپنا چولہا جلاتی۔

نئی امی کو فکر لگا رہتا کہ اماں ان کے کھانے سے کچھ ہمیں نہ دے دے۔ وہ اماں پر شک کرتی تھی۔ اگر نئی امی بات بات پر شک کا اظہار نہ کرتی تو بھی اماں ان کے کھانے سے ہمیں کچھ نہ دیتی۔ چونکہ اماں اسے خیانت سمجھتی تھی۔ جب نو روپے ماہانہ ہماری تنخواہ لگا دی گئی تھی تو پھر اسے کوئی حق نہ رہا تھا کہ ان کی ہانڈی سے ہمیں کھلائے یا خود کھائے۔ اماں کو اس بات کا افسوس نہ تھا کہ نئی امی نے پابندی کیوں لگائی ہے۔ اماں کہتی۔ وہ گھر والی ہے، اسے حق حاصل ہے کہ پابندیاں لگائے۔ اماں کو صرف یہ افسوس تھا کہ نئی امی اس کی دیانت پر شک کرتی تھی۔

دو چولہوں کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا نہ تھا، کیونکہ ان کا کھانا پکانے اور کھلانے میں اس قدر دیر لگ جاتی کہ میں اور بہن دونوں بھوک سے بلکتے بلکتے سو جاتے۔

ہمارے خیال کی وجہ سے اماں جلدی جلدی ان کا کھانا پکانے سے فارغ ہونے کی کوشش کرتی تھی، لیکن نئی امی اسے بٹھائے رکھتی کہ جب تک ہم کھانے سے فارغ نہ ہوں اپنا چولہا نہ جلائے۔

جب ابا دسترخوان پر بیٹھتے تو اماں کو آواز دی جاتی کہ توے پر روٹی ڈال دے۔ جتنی دیر وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسترخوان پر نہ بیٹھتے تھے اماں پر کشمکش طاری رہتی۔ اس کی نگاہ نئی ای اور ابا پر لگی رہتی۔ کان ہمارے کمرے پر لگے رہتے۔ ایک گھبراہٹ طاری رہتی۔ بار بار دوڑ کر ہمارے کمرے میں آتی۔ ہمیں تسلیاں دیتی۔

بس اب تو کچھ دیر نہیں۔ وہ کھانے پر بیٹھنے ہی والے ہیں۔ آلو ہی تو تلنے ہیں۔ اس میں کیا دیر لگتی ہے ادھر کڑاہی میں ڈالے ادھر تیار۔

میں بتاؤں، میں چلاتا۔ وہ جان بوجھ کر آواز نہیں دیتی۔

''بس تو تو بیکار باتیں کرے گا۔'' اماں کہتی۔

بہر حال بچپن میں رات کا کھانا میں نے کبھی جاگتے ہوئے نہ کھایا تھا۔ کھانے کے انتظار میں، میں رو رو کر سو جاتا۔ پھر پتہ نہیں کس وقت اماں مجھے جگا جگا کر کھانا کھلاتی تھی۔

دو چولہوں کا اماں کو بڑا فائدہ تھا۔ ابا کے لئے بھنڈی پکتی تو اماں بھنڈی کی ٹوپیاں جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہیں ہمارے لئے تل دیتی۔ ابا کے لئے کریلے پکتے تو کریلوں کا بور دھو کر ابال کر، ہمارے لئے تل دیا کرتی۔ کبھی کبھی کھانا کھاتے ہوئے ابا مجھے آواز دیتے: ''بولی!''

جب میں پیدا ہوا تھا تو میرے دو نام رکھے گئے تھے۔ نانی نے مقبول حسین رکھا۔ ابا نے ممتاز حسین۔ بچپن میں مقبول کے حوالے سے مجھے بولی کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ میری بڑی بہن کا نام والایت تھا۔

ہاں تو ابا مجھ آواز دیتے: ''بولی......! میں جاتا تو وہ دو انگلیوں میں بوٹی تھامے ہوئے کہتے ''بولی لو بوٹی۔''

بچپن میں ابا اور میرا صرف یہی ایک واحد رابطہ تھا۔ وہ بوٹی میں دونوں انگلیوں میں لٹکائے ہوئے یوں اپنے کمرے میں لوٹتا جیسے تمغہ ہو۔ میں اس کی نمائش کرتا تو بہن چڑ جاتی۔ کہتی تمہیں شرم نہیں آتی بوٹی لیتے ہوئے۔ اس پر اماں بہن کو ٹوکتی۔ کہتی: ''اس میں کیا حرج ہے۔ وہ باپ ہے اگر بیٹے کو بوٹی دیتا ہے تو لینے میں کیا حرج ہے۔'' پھر میں بہن کو دکھا دکھا کر چڑا چڑا کر بوٹی کھاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیر تک کھاتا رہتا۔

بہن کو اور مجھے، دونوں کو نئی امی کے خلاف بڑا غم و غصہ تھا۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر اس کا منہ چڑاؤں۔ اماں اس بات پر بہت ناراض ہوتی تھی۔ کہتی اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔ قصور تو لانے والے کا ہے۔ اور اس کا بھی کیا قصور جب اللہ نے چار کی اجازت دے رکھی ہے تو کون بول سکتا ہے۔

نئی امی محلے سے نہیں تھی، باہر سے لائی گئی تھی۔ لہٰذا محلے والیاں سب اس کے خلاف تھیں۔ وہ اماں سے ہمدردی جتانے کے لئے نئی امی کو برا بھلا کہتیں تو اماں یہ کہہ کر انہیں چپ کرا دیتی: ''بہن، لانے والے کا بھی کیا دوش، یہ تو سب قسمت کے کھیل ہیں۔ جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔'' اماں کی ان باتوں پر ہمیں بہت غصہ آتا تھا۔ بڑی مکے کی حاجن بنی پھرتی ہے۔

نئی امی کو بن سنور کر بیٹھے دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ اس کے کپڑوں کی دھجیاں نوچ لوں لیکن جب میں اس کے سامنے جاتا تو میرے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے۔ نئی امی کا بڑا رعب تھا۔ اس کا چہرہ اتنا بڑا تھا۔ رنگ چٹا سفید تھا جس میں سرخی ملی ہوئی تھی۔ قد اونچا لمبا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت تھی۔ محلے میں کوئی ایسی عورت نہ تھی۔ یوں نئی امی کی طرف میرا رویہ دورخی ہو گیا۔ ایک طرف مجھے اس سے شدت نفرت تھی۔ دوسری طرف میں اس کے حسن اور رعب سے بری طرح مسحور تھا۔ میری نگاہ میں وہ آئیڈیل عورت تھی۔

ابا بڑے رنگیلے تھے۔ مجلسی تھے۔ توجہ طلب تھے۔ پتہ نہیں ان کی نگاہ میں کیا جادو تھا کہ راہ چلتی کو نظر بھر کر دیکھ لیتے تو وہ پیچھے پیچھے چلی آتی۔

تین چار سال تو ابا نئی امی کے وارے نیارے کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا رویہ بدل گیا۔ وہ گھر سے باہر وقت گزارنے لگے۔ آدھی آدھی رات کو گھر آنے لگے۔ اس پر نئی امی مرجھانے لگی۔ اسے یوں مرجھاتے دیکھ کر اماں کو اس کے ساتھ ہمدردی ہو گئی۔

اماں کی عادت تھی کہ اگر کسی سے ہمدردی ہو جاتی تو پھر اس کا جی چاہتا کہ سب کچھ اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدموں میں ڈھیر کر کے خود بیراگن ہو جائے۔

خاوند کی توجہ کھو دینے کے بعد نئی امی نے اماں کو اپنا لیا۔ اس سے ہمارے لئے مزید مشکلات پیدا ہو گئیں، نئی امی کا مطالبہ تھا کہ جب تک میاں گھر نہ آئیں تم میری ساتھ بیٹھی رہو۔ مجھ سے ہمدردی بھری باتیں کرو۔ میرے پیر دباؤ۔ یوں ہم اماں سے محروم ہو گئے۔ لیکن اماں بھی بری طرح سے۔ بٹ گئی۔ ایک طرف ہمدردی دوسری طرف ممتا۔ اماں کو اتنی رعایت مل گئی کہ اپنا چولہا جب جی چاہے جلا لیا کرے۔

پہلے اماں ہوتی تھی پر کھانا نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ کھانا تو ہوتا تھا پر اماں نہیں ہوتی تھی۔

نئی امی نے اماں کی ایک نئی ڈیوٹی لگا دی۔ کہنے لگی جب تک میرے میاں نہ آئیں تجھے جاگتے رہنا ہوگا۔ دوسرے میری پائینتی پر پڑ کر سو نہ جانا۔ جو تو سو گئی تو وہ دروازہ بجا بجا کر ہار جائیں گے۔ پھر مجھ سے ناراض ہوں گے۔ جب وہ آئیں تو دروازہ کھول دیا کر، پھر بے شک اپنے کمرے میں جا کر سو جایا کر۔ اماں نے ہامی بھر لی۔

نئی امی نے کہا اگر تو سو گئی تو......

اماں نے کہا سو گئی تو جو سزا چاہے دینا۔

ایک روز اماں سو گئی۔ نئی امی دبے پاؤں باورچی خانے گئی، وہاں سے چمٹے میں ایک انگارہ اٹھا لائی اور اسے اماں کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اماں کے ہونٹ جل گئے۔ کئی ایک دن وہ مرہم لگاتی رہی۔ میں بہت خوش ہوا۔ ''اور کر ہمدردیاں''۔ اور لگا سوتیلی سے عشق۔ خدمتیں کر۔

ابا کی بے توجہی پر نئی امی اکثر آنسو بہایا کرتی تھی۔ اماں اس کے آنسو پونچھتی اور تسلیاں دیتی۔ ایک روز نئی امی روتے روتے بولی، اب کون ہے جو میرے چاؤ پورے کرے گا۔

اماں ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر بولی: ''تو جی برا نہ کر۔ تیرے چاؤ میں پورے کروں گی۔'' اماں کی یہ بھی عادت تھی ایک بار چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہہ دیتی تو اس کا پالن کرنے کے لئے مرمٹتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماں پیدائشی طور پر کامی تھی۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا۔ فارغ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسے بہت سے کام کرنے آتے تھے۔ سری سلائی کے کام میں اسے بڑی دسترس تھی۔ اماں میں نقل مارنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ کوئی چیز دیکھتی تو ہو بہو ویسی ہی بنا لیتی۔

اماں نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہہ تو دیا کہ تیرے چاؤ میں پورے کروں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں گویا زلزلہ آ گیا۔ اماں کو فکر دامن گیر ہوا کہ چاؤ پورے کرنے کے لئے نو روپے ماہوار کی آمدنی کافی نہیں۔ اس نے جھٹ لاٹری ڈالی اور سلائی کی مشین خرید لی۔ یہ مشین باورچی خانے میں رکھ دی گئی۔ اماں ہنڈیا میں ڈوئی چلاتی اور پھر مشین پر جا بیٹھتی۔ ہمیں جلدی جلدی کھانا کھلاتی اور پھر مشین پر جا بیٹھتی۔ یوں اماں سلائی کے پیسے کمانے لگی۔ سلائی میں اس کا ہاتھ بہت صاف تھا، اس لئے اڑوس پڑوس سے سلائی کا کام ڈھڑا ڈھڑ آنے لگا اور نئی امی کے چھوٹے موٹے چاؤ پورے ہونے لگے۔

اس پر سارے محلے میں مشہور ہو گیا کہ اماں نے سوکن کو محبوب بنا لیا ہے۔ ہمیں اس پر بہت غصہ آتا۔ اماں سے کئی بار لڑنے کی کوششیں کیں لیکن جواب میں ماں بڑی معصومیت سے کہتی: ''تم ذرا سوچو تو اس کا یہاں کون ہے، کوئی بھی نہیں، نہ کوئی ہمدردی کرنے والا ہے نہ حوصلہ دینے والا۔ جو اسے لے کر آیا تھا، اس نے ساتھ نہ دیا۔ لے کر آنے کی لاج نہ پالی۔ ہمارا تو سارا محلہ اپنا ہے۔ رشتے دار ہیں، محبت کرنے والے ہیں۔ ہمدردی کرنے والے ہیں۔ دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ اس کے دکھ سکھ کا کوئی ساتھی نہیں۔ تم دونوں کیوں اس کے بیری بنے ہوئے ہو۔ نہ نہ بیٹے یہ بات اچھی نہیں۔'' اماں کی بات سن کر کچھ دیر کے لئے ہم شرمندہ ہو جاتے۔

پھر گھر میں بہت سے کام آ گئے، مثلاً جلدیں باندھنے کے لئے کتابیں آ گئیں اور جلد بندی کا سارا سامان بھی گتے، ابری، لئی، پتنگ بنانے کے لئے باریک کاغذ، دھاگا اور بانس کے ٹکڑے۔ پھر اماں نے ڈور پر ماجھا لگانا شروع کر دیا،

میں اور بہن شوقیہ ان کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے۔ نئی اماں کے چاؤ پورے ہونے لگے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن یہ سب باتیں نئی امی کے دل کو ڈھارس نہ دے سکیں۔ اسے دق کا عارضہ ہو گیا۔

اس پر اماں نے خدمت گار نرس کی ڈیوٹی سنبھال لی۔ مہینوں وہ نئی امی کی تیمارداری کرتی رہیں۔

پھر ایک رات جب ہم سب کوٹھے پر سوئے ہوئے تھے کہ آندھی اٹھی، سب لوگ اپنے اپنے بستر اٹھا کر نیچے چلے گئے۔ اماں نے سوچا کہ بیمار کو نیچے لے جانا مشکل ہو گا، لہٰذا وہ نئی امی اور ہمیں لے کر برساتی میں چلی گئی۔ برساتی چھتی ہوئی تھی لیکن اس کی صرف تین دیواریں تھیں۔ ایک طرف سے خالی تھی۔

طوفان بڑھتا گیا۔ ہوا کی رفتار شدت اختیار کرتی گئی۔ ساتھ بارش ہونے لگی، گرج کڑک دل دہلانے والی تھی۔ اس طوفان میں باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہم مدد کے لئے چیخ چیخ کر پکارتے رہے۔ کسی نے ہماری آواز نہ سنی۔

مریضہ کو طوفان کی بوچھاڑ سے بچانے کے لئے اماں نے ولایت اور مجھے مریضہ کے گرد گھڑا کر دیا۔ اس سے بھی بچاؤ نہ ہو سکا تو اس نے مریضہ کے گرد چارپائیاں کھڑی کر دیں۔ اور ہم سے کہا کہ انہیں تھامے رکھو۔ لیکن چارپائیاں گر گئیں۔ ہم انہیں سنبھال نہ سکے۔ اس وقت اماں ایک زخمی اور بے بس شیرنی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

پھر نئی امی نے ہاتھ بڑھا کر اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولی صغرا میں نے تیری قدر نہ کی۔ پھر آخری ہچکی لی اور رخصت ہو گئی۔

اماں کی سالہا سال کی خدمت کا انعام وہ ایک جملہ تھا۔ جو نئی امی نے مرتے وقت اسے کہا تھا: ''صغرا میں نے تیری قدر نہ کی۔'' اماں نے اس جملے کو تمغے کی طرح سینے پر سجا لیا۔

ابا ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں بٹالے میں محلے میں گزارتے تھے، پھر ڈیوٹی پر چلے جاتے۔ نئی امی کی وفات کے بعد جب وہ ڈیوٹی پر جانے لگے تو اماں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بولی آپ چاہیں تو ہمیں خرچ دیں نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیں تو بے شک نہ دیں لیکن اب میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ان دنوں ہمیں ماہوار سولہ روپے ملتے تھے۔ ابا کو مجبوراً اکیلے جانا پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد ابا نے بٹالے آکر اماں کی منتیں کیں کہ وہ ساتھ چلے۔ کہنے لگے: ''دیکھ صغرا گھر میں نئی دلہن آرہی ہے۔ وہ کشمیر کے سیبوں پر پلی ہے بڑی نازک ہے۔ اسے کون ''رسیو'' کرے گا۔ کون اس کی خدمت کرے گا، اس لئے تو میرے ساتھ چل، تیرے بغیر بات نہیں بنے گی۔ اس گھر میں تو ہی بڑی ہے۔ یہ تیرا فرض ہے کہ شادی میں بڑی کا رول ادا کرے۔ یہ تیسری ای کے آنے کی خبر تھی، لیکن اماں نہ مانی۔ تیسری ای کے بعد چوتھی ای بھی آگئی لیکن اس کے بعد ابا کے ساتھ نہ گئی۔

اب اماں آزاد تھی، لیکن اسے پابندیوں میں رہنے کی خو پڑ چکی تھی۔ اسے محنت مزدوری، مشقت اور خدمت کی لت پڑ چکی تھی۔ آزادی اس کے لئے پریشان کن تھی۔

اگرچہ سلائی، جلد بندی اور پتنگ سازی کے کام جاری تھے لیکن اب وہ اس قدر جاذب نہ رہے تھے کیونکہ اب وہ اپنے لئے کئے جارہے تھے۔ ان میں خدمت کا عنصر نہ تھا، لہٰذا اماں نے محلے کی بچیوں کے لئے ایک مدرسہ کھول لیا اور بچوں کو پڑھانے کا مشغلہ اپنا لیا۔

اس دوران میری بڑی بہن کی شادی ہوگئی۔ اور اماں مجھے لے کر بہن کے گھر جا مقیم ہوئی اور وہاں جاکر بہن کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگی۔ وہ سارا سوئی سلائی کا کام کرتی۔ رضائیاں بناتی۔ گدے تیار کرتی۔ سویٹر بنتی۔ پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرتی۔ سارے ہی کام کرتی تھی۔ صرف باورچی خانے کا کام نہیں کرتی تھی۔

اس دوران میں اماں کا سکول چل نکلا۔ اسکول کی بڑی شہرت ہوگئی۔ محکمہ تعلیم نے اماں کے اسکول کو امدادی اسکول کی فہرست میں رکھ لیا۔ یوں اسکول کو ماہانہ گرانٹ ملنے لگی اور اماں نے تنخواہ پر دو استانیاں اسکول کے لئے رکھ لیں۔ اب اماں کا کام صرف منتظم کا رہ گیا تھا۔

انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک پروفیسر آئے جنہیں جوانی میں تپ دق کا عارضہ ہوگیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے ڈاکٹر لوئی کونی کے ٹب باتھ کے طریقے کو اپنا رکھا تھا۔ وہ ٹب کرتے تھے، ابلی ہوئی سبزیاں اور دہی کھاتے اور خاصے صحت مند ہوتے جا رہے تھے۔ اماں اس طریقہ علاج سے بے حد متاثر ہوئی۔ اس نے ڈاکٹر لوئی کونی کے ٹب سسٹم کا بغور مطالعہ کیا۔ بڑی محنت سے ڈاکٹر لوئی کونی کا میٹیر یا میڈیکا حاصل کیا۔ پھر وہ محلے والوں کا علاج معالجہ کرنے لگی۔ جہاں کوئی بیمار پڑتا اماں اپنا ٹب اور لوئی کونی کی کتاب اٹھائے پہنچ جاتی اور گھر گھر جا کر منتیں کرتی کہ مریض کو ٹب میں بٹھانے کی اجازت دی جائے۔

پھر انہی دنوں محلے میں دلی کے ایک بزرگ حاجی رفیع الدین صاحب تشریف لے آئے۔ اماں ان سے بہت متاثر ہوئی۔ اس حد تک کہ ان کی بیعت کر لی اور اپنی توفیق کے مطابق عبادت میں مصروف ہو گئی لیکن اماں کے نصیب میں سکون نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے آخری دور میں اس کے دکھ، بے چینی اور اضطراب کا سب سے بڑا سبب میں تھا میں نے اماں کی قدر نہ کی۔ ہمیشہ اس کی بات کو رد کیا۔

اماں چاہتی تھی کہ میری شادی اس کے عزیزوں کے گھر ہو۔ اس نے بڑی دھوم دھام سے میری منگنی کی لیکن وقت آیا تو میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس پر اماں کی بڑی ہیٹی ہوئی۔ شاید اماں اسے بھی برداشت کر لیتی لیکن اسے اس بات کا دکھ لگا ہوا تھا کہ میں ایسے عشق میں سرشار تھا جہاں رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ تھا۔

رات کو چوری چوری جب میں محبوبہ کو دیکھنے جانے لگتا تو گہری نیند میں خراٹے لیتی ہوئی اماں جاگ پڑتی۔ اس کا چہرہ یوں مسخ ہو جاتا جیسے ضرب کھانے پر انڈا بہہ جاتا ہے۔ ''نہ ممتا زنہ'' وہ سراپا منت بن جاتی۔

میں کہتا اماں یہ بتا کہ تو گہری نیند سوئی ہوتی ہے لیکن جب بھی میں محبوبہ کو دیکھنے کی نیت سے اٹھتا ہوں تو تو جاگ پڑتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

ماں کہتی مجھے حاجی صاحب جگا دیتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں حیران ہوتا یہ حاجی صاحب کیسے آدمی ہیں کہ دلی میں رہتے ہیں لیکن یہاں بٹالے میں اماں کو ہر وقت جگا دیتے ہیں۔

اماں کہنے لگی بیٹا جا! ایک مرتبہ حاجی صاحب کی بیعت کر آ، پھر آ کر جو جی چاہے کرنا میں نہیں ٹوکوں گی۔

اماں نے مجھے ایک عزیز کے ساتھ دلی بھیج دیا۔

حاجی صاحب نے میری طرف دیکھا۔ مراقبہ کیا اور میرے ساتھی سے بولے: ''اماں جی سے جا کر کہہ دیجئے کہ جس کا آپ کو ڈر ہے وہ ہو کر رہے گا، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ دھول اڑے گی۔ ہاہا کار مچے گی۔ بدنامی، رسوائی، دھمکیاں، سب کچھ سننا پڑے گا۔ پھر آخری عمر میں، حاجی صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا: ''انہیں اچھے لوگ ملیں گے۔'' بہت اچھے۔

حاجی صاحب کے کہنے کے مطابق بڑی دھول اڑی، ہاہا کار مچی۔ اس دوران اماں مجھے کئی ایک بزرگوں کے پاس لے گئی کہ شاید آندھی تھم جائے لیکن آندھی نہ تھمی۔

آخر کار جب وہ تھمی تو میری محبوبہ بیوی دو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر فوت ہو چکی تھی۔ اور اماں پر انہیں سنبھالنے کا فریضہ عائد ہو چکا تھا۔ اماں ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھ سے کہا کرتی، دیکھ بیٹے اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ تیرا گھر سنبھال سکوں۔ تو دوسرا بیاہ کر لے جہاں بھی چاہے کر لے، لیکن کر لے۔

اماں کے کہنے پر میں نے دوسری شادی کر لی۔ اس کے بعد تقسیم عمل میں آ گئی۔ اور ہم سب بٹالہ چھوڑ کر لاہور میں آ بسے۔ پھر روزگار کا چکر کسی کو کہیں لے گیا کسی کو کہیں۔

بہن ملتان جا بیٹھی۔ میرا ماموں زاد بھائی ڈاکٹر امانت مفتی جس کے ساتھ اماں کو بڑی محبت تھی، فیصل آباد رہائش پذیر ہوا اور میں راولپنڈی اسلام آباد میں۔

اماں اتنا کچھ سہنے کے بعد بڑی بے چین ہو گئی تھی۔ وہ ٹک کر ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ بیٹھی بیٹھی گھبرا جاتی اور جانے کی تیاری کر لیتی۔ پھر اسے کوئی روک نہ سکتا تھا۔ میرے گھر سے وہ بہن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے گھر چلی جاتی۔ چار ایک مہینے وہاں کاٹتی پھر بے چین ہو جاتی اور ڈاکٹر امانت کے پاس فیصل آباد چلی جاتی۔ وہاں چند ایک ماہ گزارنے کے بعد میرے پاس آ جاتی۔

وہ فارغ بیٹھنا نہ جانتی تھی۔ جہاں بھی جاتی پرانے کپڑوں کا جائزہ لیتی۔ آدھ سلے کام اکٹھے کرتی۔ اور پھر کام میں لگ جاتی۔ گدے سیتی۔ رضائیوں کے ابرے ٹھیک کرتی۔ پرانے کپڑوں سے ٹی کوزیاں بناتی۔ بچوں کے لئے کھلونے بناتی۔ بچوں کی پھٹی ہوئی کتابوں کی جلد بندی کرتی۔ سبزیوں کو کاٹ کر سکھاتی۔ شربت کی بوتلیں تیار کرتی۔ ٹوٹے ہوئے جوتوں کی مرمت کرتی۔ پردے بناتی۔ قرآن کریم کے جزدان سیتی۔ جب گھر کے کام ختم ہو جاتے اور کچھ کرنے کو باقی نہ رہتا تو وہ بے چین ہو جاتی اور دوسرے گھر چلی جاتی۔

تینوں گھروں والے اماں کے آنے کے منتظر رہتے تھے۔ سبھی کہتے، اماں کے آنے سے برکت آ جاتی ہے۔ دراصل اماں کے آنے سے سینکڑوں روپوں کے کام مفت میں ہو جاتے تھے۔

میرے گھر میں اماں کا جی نہیں لگتا تھا چونکہ اسے ساس بن کر رہنا نہیں آتا تھا۔

وہ حکم نہیں چلا سکتی تھی۔ رعب نہیں جھاڑ سکتی تھی۔ اماں میں ہریجنوں کا سا عجز تھا۔

وہ صرف برہمنوں میں رہ سکتی تھی۔ سب لوگ اماں کی عزت کرتے تھے لیکن درپردہ وہ عزت کرانے سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اس لئے بے چین ہو کر چلی جاتی۔

1974ء میں 9 رمضان شریف کے دن دو فروری کو اماں صبح پونے دس بجے فیصل آباد میں وفات پا گئی۔

وہ بیمار تھی۔ مرنے سے پہلے چار ایک دن وہ اپنے ارد گرد فضا میں دیکھتی اور غصے سے مسلسل کہتی رہی۔ ''تم کھڑے ہو کر میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔ اب مجھے لے چلو نا۔ اب کیا دیر ہے۔''

اماں کی وفات کے کئی ایک سال بعد میں مسلسل بیمار رہنے لگا۔ بیماری کی نوعیت ایسی تھی کہ لوگ کہنے لگے کہ ممتاز پر کسی نے سفلی عمل کر دیا ہے۔

میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا جو صاحب کشف تھے۔ میں نے کہا دیکھیے تو سہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجھ پر کسی نے سفلی عمل تو نہیں کیا۔ وہ مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا بولے، مفتی صاحب آپ پر کوئی سفلی عمل اثر نہیں کر سکتا۔ آپ کی ماں کی دعاؤں نے آپ کو چاروں طرف سے احاطے میں لے رکھا ہے۔

اس روز مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہر مشکل کے وقت مجھے غیبی امداد مل جاتی ہے زندگی بھر مجھ پر کرم نوازیاں ہوتی رہی ہیں حالانکہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ پھر ایسے کیوں ہوتا ہے...... اس روز مجھ اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری امی

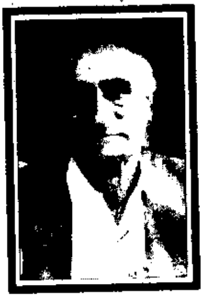

میرزا ادیب کا نام اُردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگر چہ وہ اب اس دنیا میں نہیں لیکن اپنی لکھی تحریروں میں وہ آج بھی اسی دنیا کے باسی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ میرزا ادیب نے اپنی والدہ کے حوالے سے جو کچھ لکھا وہ دراصل اس ماں کی صبر آزما کہانی ہے جس نے دلاور کو میرزا ادیب بنا دیا۔ اور پھر میرزا ادیب نے اُردو افسانے اور ڈرامے کو لازوال کر دیا۔

••••••••••••••••••••••••••

مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا!......زندگی کے آخری سانس تک بھی نہیں۔

اس وقت کے ایک لمحے کی کیفیت میرے دل پر طاری ہے۔ ایک ایک لمحے کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔

میں سیڑھیوں کے اوپر اس دروازے کے پاس کھڑا ہوں جس کے آگے ہمارے مکان کا درمیانی کمرہ واقع ہے۔ شاید رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے۔ ہو سکتا ہے پچھلے پہر کا آغاز ہو چکا ہو۔ اوپر دیکھ کر وقت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میرے چاروں طرف کوئی روشندان، کوئی خلا یا باہر دیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مجھے یہاں کھڑے کتنی دیر ہو چکی ہے، یہ نہیں بتا سکتا۔ لگتا ہے کئی دن، کئی راتیں میرے قریب سے دبے پاؤں آگے چلی گئیں ہیں اور میں یہیں کھڑا ہوں گزران وقت سے بے خبر، دیوار کے ساتھ لگ کر۔ ایک ہی رخ پر۔ ایک ہی آواز میں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب سے یہاں کھڑا ہوں، اپنے سامنے مجھے ہلکی سی روشنی بھی دکھائی نہیں دی۔ سب سے نچلی سیڑھی پر کچھ زردی سے پھیلی ہوئی ہے۔ کمزور، ضعیف روشنی جو کسی قدر دور سے آ رہی ہے۔ نیچے صحن ہے اور صحن کے ایک کونے میں باورچی خانے کے باہر ایک بلب روشن ہے جسے دھوئیں نے ملفوف کر رکھا ہے۔

آج شام ہی سے تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان ہواؤں کے شور میں یک بیک کئی چیخیں گونج اٹھی تھیں۔ پھر سسکیوں کی آواز آنے لگی اور اب ہر دس پندرہ منٹ کے بعد ایک چیخ پھیل جاتی ہے اور میں بے اختیار ایک عالم بے بسی میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

میں یہاں تنہا ہوں۔ کبھی کبھی یوں احساس ہوتا ہے کہ ایک جلتے ہوئے جہاز کے تختے پر بیٹھا ہوں، یہ تختہ کدھر جا رہا ہے۔ مجھے کہاں لے جائے گا؟ میں اس سفر کے بعد کس مقام پر پہنچ جاؤں گا، اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ بالکل کوئی علم نہیں۔

صرف چند لمحے بیتے ہیں کہ ایک ہاتھ نے میرے بازو کو چھو کر کہا تھا:

"بھائی جان نیچے آؤ، ماں بلاتی ہے!"

یہ میری بہن کے الفاظ تھے جو اتنی بات کہہ کر زور زور سے رونے لگی تھی اور جب نیچے گئی تھی تو اس کی آواز زیادہ بلند ہو گئی تھی اور پھر سسکیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ میری دوسری بہنوں کی سسکیاں ہیں جو ماں کی چارپائی کے ارد گرد بیٹھی ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رونے یا سسکیاں بھرنے لگتی ہیں۔

آخری سیڑھی سے آگے چھوٹے دالان میں شمالی دیوار کے قریب ماں ایک چارپائی کے اوپر ایک سفید چادر اوڑھے لیٹی ہے۔ آج شام ہوتے ہی اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور میری تینوں بہنیں "بے بے" کہہ کر اس کے اوپر گر پڑی تھیں۔ میں اس وقت مشرقی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ میرے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی سینہ شق ہو جائے گا ......ابھی دل ریزہ ریزہ ہو جائے گا......اسی لمحے میں چارپائی کے اوپر گر پڑا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طوفان آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہہ نکلا۔ رونے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں اور میں دم بدم پہلو بدلتا رہا...... اب نیچے وہ طوفان تھم چکا ہے۔ صرف تیز ہواؤں کا شور برپا ہے اور میں سیڑھیوں کے اوپر خاصی دیر سے کھڑا ہوں۔ کئی بار ارادہ کیا ہے کہ نیچے جاؤں اور ماں کے چہرے سے چادر سرکا کر اس سے پوچھوں: ''امی! تو تو کبھی خاموش نہ رہتی تھی۔ آج اس طرح کیوں چپ ہو گئی ہے؟ تو تو اپنی اولاد میں سے کسی کو ذرا ملول دیکھتی تو تڑپ جاتی تھی، مگر آج تیری بچیاں تیرے پاس زارو قطار رو رہی ہیں۔ تیرے چھوٹے بیٹے کے آنسو تھمتے ہی نہیں، مگر تو ہے کہ ان سے یہ بھی نہیں پوچھتی کہ تمہیں ہوا کیا ہے، کیا دکھ پہنچا ہے تمہیں...... کس لئے تم سب رو رہے ہو؟

میں نیچے نہیں گیا...... غالباً میرے ذہن کو یہ خیال بے قرار کر دیتا ہے کہ مجھے دیکھ کر بہنیں پھر رونا شروع کر دیں گی اور بھائی بے تاب ہو جائے گا۔ شام کے وقت ایک ایک بہن مجھ سے لپٹ لپٹ کر رو چکی ہے۔

آج اس گھر کے در و دیوار کتنے غم دیدہ، اندوہگیں اور اداس محسوس ہوتے ہیں، جیسے وہ اس ہستی کو رخصت کرتے ہوئے چپ چاپ، ہولے ہولے آنسو بہا رہے ہیں جس نے ان کے درمیان زندگی کا ایک بڑا طویل سفر طے کیا ہے...... طویل اور بڑا کٹھن سفر!

وہ جب اس گھر میں آئی تھی تو اٹھارہ انیس برس کی لڑکی تھی۔ مذہبی ماحول کی تربیت یافتہ، جس کے والد نے اسے اپنے سخت گیر اصولوں کی وجہ سے مدرسے میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی تھی، جس نے گھر میں رہ کر ایک بوڑھے مولوی سے صرف قرآن مجید پڑھا تھا، جس کی ساری دنیا سمٹ سمٹا کر اپنے چھوٹے سے گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

جب اسے ڈولی میں بٹھایا گیا تھا تو وہ نہیں جانتی تھی کہ اب اسے کس منزل سے زندگی کا نیا سفر شروع کرنا ہے اور آنے والے شب و روز اپنے اندھیروں اور اپنے اجالوں میں اس کے لئے کیا کچھ لے کر آئیں گے۔ نئے گھر میں آ کر اس نے اپنے آپ کو اجنبی لوگوں کے درمیان پایا اور یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب کے سب علم سے بے بہرہ تھے۔ پرانی روایتوں کے اسیر...... ادھر ادھر دیکھے بغیر زندگی کی راہ پر چلنے والے۔

شوہر پیشے کے لحاظ سے ایک درزی...... اپنے فن میں ماہر مگر مہینے میں پندرہ بیس دن دکان پر جاتا اور باقی دن دکان کے انچارج سے روٹھ کر گھر میں گزارتا۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ اور تیزی...... ساس پرانے زمانے کی عورت، لکیر کی فقیر، بہو سے یہ توقع رکھتی تھی کہ وہ صبح سے لے کر رات کو نو دس بجے تک سارا کام انجام دے اور اس دوران شوہر سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ دو جیٹھ، بالکل اپنے حال میں مست، گھر کے کسی فرد سے بھی انہیں کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، ہاں اپنی ماں سے ضرور واسطہ تھا اور وہ اس وجہ سے کہ وہ ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ چھوٹے فائز العقل جو دن چڑھے کچھ کھا پی کر گھر سے نکل جاتے اور رات کو واپس لوٹتے۔ دن بھر بازاروں میں گھومتے پھرتے یا لوہاری منڈی میں ایک خیمہ دوز کی دکان پر بیٹھے رہتے۔ گھر میں باقاعدہ کمانے والا کوئی نہ تھا۔ بڑے جیٹھ نوازش علی بازار جج محمد لطیف کے ایک جلد ساز کی دکان پر کام کرتے تھے، مگر ان کے کام کرنے کا وہی انداز تھا جو ان کے چھوٹے بھائی کا تھا۔ گھر کے معاشی حالات کی کفالت وہ زرعی زمین کرتی تھی جو کچھ مدت کے لئے ٹھیکے پر دے دی جاتی اور ہر چھ ماہ بعد ٹھیکے والے سے حساب کتاب ہوتا۔ اس زرعی زمین میں سنتروں کے باغات بھی تھے جن سے گاہے گاہے سنتروں سے بھری ٹوکریاں بھی گھر پہنچ جاتی تھیں۔

مکان دو منزلہ، نچلا حصہ کرایے پر جس میں ایک دھوبی اور اس کا کنبہ رہتا تھا۔ اوپر کے حصے میں سب افراد خانہ رہتے تھے، سوائے ساس کے جو بھاٹی دروازے کے اندر اپنے ذاتی مکان میں رہتی تھیں۔

امی جب اس گھر میں آئیں تو انہیں بتایا گیا کہ ان کے مرحوم سسر بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ سارا شہر ان کی عزت کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ چل کر ان کے پاس آتے اور ان سے فیض حاصل کرتے۔ وہ ایک وکیل کے منشی تھے۔ اپنی مختصر سی کمائی کو بڑی دور اندیشی کے ساتھ خرچ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہتے، چنانچہ اس کفایت شعاری کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر تین مکان اور زمین کا ایک اچھا خاصا ٹکڑا خرید لیا تھا۔ امی اپنے سسر پر فخر کرتی تھیں اور اکثر کہا کرتیں: ''کاش! میں ان کی زندگی میں یہاں آتی۔''

یہ تھا اس گھر کا ماحول جس میں میری امی دلہن بن کر آئی تھیں۔

امی نے اس ماحول کو بہ جان و دل قبول کر لیا۔ وہ سارے فرائض قبول کر لئے جو فاترالعقل جیٹھ کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے سے لے کر نجاست سے پاک کرنے پر مشتمل تھے۔ وہ ساری ذمے داریاں قبول کر لیں جن کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بڑے جیٹھ کے کسی معاملے میں دخل نہ دیں اور وہ جو حکم دیں فوراً بجا لائیں۔ انہوں نے سارے کاموں کی بجا آوری پر خود کو تیار کر لیا جن میں شوہر کی ہر طرح کی خدمت کرنے کے علاوہ ان کی بے جا سختی جھیلنا بھی تھا۔

انہوں نے اپنے لئے کبھی کچھ طلب نہ کیا۔ گھر کے سب افراد کو کھانا کھلا کر جو کچھ بھی بچ جاتا اس سے پیٹ بھر لیتیں۔ ناشتے میں گھر والوں کو تازہ روٹیاں پکا کر دیتیں اور خود رات کو بچی ہوئی روٹی توے پر گرم کر کے دہی یا تھوڑے سے دودھ کے ساتھ کھا لیتیں۔ اپنے لئے یہ اہتمام وہ اس طرح کرتی تھیں جیسے یہ بھی کوئی روزمرہ ہی کا معمول ہے اور وہ اسے اسی احساس کے ساتھ کرتی تھیں جس احساس سے دوسرے کام انجام دیتی تھیں۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ابا جان نے نماز پڑھنے کا آغاز نہیں کیا تھا۔ وہ سب سے پہلے بستر سے اٹھتی تھیں۔ وضو کر کے قرآن اور رحل لے کر باہر صحن میں ایک پرانے لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھ جاتی تھیں اور قرات کے ساتھ ایک پارے کا کم از کم چوتھائی حصہ پڑھ لیتی تھیں۔ جب اذان کی آواز بلند ہوتی تو وہ دعا مانگ کر قرآن مجید جزدان میں لپیٹ کر اس کے نیچے رحل رکھ کر درمیانی کمرے میں ایک اونچی جگہ پر رکھ دیتیں اور پھر یکے بعد دیگرے اپنے سارے بچوں کے چہروں پر ضرور بالضرور پھونک مارتیں۔

وہ سمجھتی تھیں کہ اپنے اس عمل سے وہ اپنی اولاد کو طویل زندگی اور زندگی کی برکتیں دے رہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، لیکن اس کا اثر کچھ الٹا ہی ثابت ہوا۔ ان کے پہلے دو لڑکے اپنی پیدائش کے تھوڑی مدت بعد چل بسے۔ ان کی تین لڑکیاں ان کی آنکھوں کے سامنے انتقال کر گئیں۔ ان میں دو شادی شدہ تھیں اور عین جوانی کے عالم میں فوت ہو گئی تھیں۔

وہ صدمے سہتی رہیں اور برابر کانٹوں بھرے راستے پر زندگی کا سفر طے کرتی رہیں۔

شادی سے پہلے ہر لڑکی قدرتاً اپنے مستقبل کے سہانے خواب دیکھا کرتی ہے۔ میری امی نے بھی ضرور ایسے خواب دیکھے ہوں گے۔ ان کی ماں بچپن ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور چھوٹی ہونے کے ناطے انہیں ہر ایک کا فرمانبردار رہنا پڑتا تھا۔ ڈھیر سارے کام کرنے کے بعد جب انہیں فراغت کے کچھ لمحے ملتے ہوں گے تو وہ ضرور اپنے خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں ڈوب جاتی ہوں گی۔ اپنے خوابوں میں ایک محبت کرنے والے خوش شکل، خوش لباس شوہر کو دیکھتی ہوں گی۔ اچھی آمدنی اور گھر میں خوشحالی کے بارے میں سوچتی ہوں گی۔ ایک خوبصورت اور کشادہ مکان کا نقشہ بھی خیالوں میں لاتی ہوں گی۔

غربت زدہ ماحول اور تنگ و تاریک گھر کے اندر رہ کر لڑکیاں ایسے ہی خواب دیکھا کرتی ہیں اور اس لڑکی نے بھی ایسے ہی خواب دیکھے ہوں گے جس کا باپ ایک مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتا تھا، جس کے گھر میں دوسروں کے گھروں سے روٹیاں آتی تھیں۔

میں جب بچہ تھا تو میں نے دو تین بار ای کو آٹا گوندھتے یا کسی کمرے میں جھاڑو دیتے ہوئے یک لخت اس عالم میں دیکھا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کر دہ اوپر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ہیں اور پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی ہیں۔

ایسے میں انہیں یقیناً وہ خواب یاد آ جاتے ہوں گے جو انہوں نے اس گھر میں آنے سے پہلے دیکھے تھے۔ اس وقت جو بچہ بھی ان کے قریب ہوتا اسے اٹھا کر بے تحاشا چومنے لگتیں...... اپنے سینے سے لگا لیتیں اور خاصی دیر لگائے رکھتیں۔

ایک بار، جب میں کچھ سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو چکا تھا، میں نے دیکھا امی نے چند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لمبے اوپر نگاہ کی، پھر حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر میری بڑی بہن کو گود میں اٹھالیا اور خاموش بیٹھی رہیں۔ بہن حیران و پریشان ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں بھی پاس کھڑا انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ انہوں نے اپنی بچی کو پیار کیا اور اپنے دوپٹے کی گرہ کھول کر دو آنے نکالے، ایک آنہ اسے دے دیا اور دوسرا آنہ مجھے۔

اپنے خوابوں کی پامالی کا گلہ وہ صرف اپنے خدا سے کرتی تھیں اور وہ بھی بڑی خاموشی سے، آنسوؤں کی زبانی...... جہاں تک میں سمجھتا ہوں انہوں نے کبھی قسمت کی شکایت گھر کے کسی فرد، کسی عزیز یا ہمسائی سے نہیں کی تھی۔

ہمارے مکان کے نچلے حصے میں سراج دین دھوبی اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی زینب ہمیشہ اپنے شوہر سے جھگڑتی رہتی۔ کوئی دن بھی ایسا نہ گزرتا جس دن میاں بیوی میں معرکے کی لڑائی نہ ہوتی۔ سراج دھوبی کی یہ بیوی جب بھی موقع ملتا، اوپر آ جاتی اور امی کو اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی ایک لمبی روداد سنا دیتی۔ امی اس سے سب کچھ سنتیں، مگر کبھی اپنی زبان سے ذاتی شکوے کا ایک لفظ تک نہ نکالتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرتی کہ زینب رونے لگتی تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو جاتے جنہیں وہ ہاتھ کی ہتھیلی سے فوراً پونچھ ڈالتیں۔ زینب سمجھتی کہ وہ ان کے غم میں شریک ہے...... اسے کیا خبر کہ امی کا اپنا غم بھی ہے، اپنا دکھ بھی ہے جس کا اظہار وہ صرف آنسوؤں ہی کی صورت میں کرتی ہیں۔

امی کے میکے سے کوئی آ جاتا تو اس کے آگے بچھ بچھ جاتیں، ہر طرح اس کی خاطر تواضع کرتیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتیں جیسے اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ ہر طرح سے خوش ہیں۔ وہ میکے والوں کو اپنی باتوں سے اپنی ذات اور گھر کی خوشحالی کا تاثر دیتی تھیں۔

میں بچہ ہی تھا کہ دادی اماں مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ وہاں مجھے گھومنے پھرنے اور کھانے پینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ چھٹے ساتویں روز گھومتا گھامتا اپنے گھر کی طرف رخ کر لیتا اور مکان کے نیچے آ کر رک جاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سراج یا ئے ینب کی نظر مجھ پر پڑ جاتی، تو ایک پر زور قہقہہ بلند ہوتا کوئی مجھ سے پوچھتا: ''اکو کھاؤ گے؟''

میں اثبات میں سر ہلا دیتا۔

''بھوک لگی ہے؟''

میں ''ہوں'' کہہ دیتا۔

ہمارے گھر کے سامنے ن دھوبی ہی رہتے تھے۔ اماں پھاتاں، چاگا، دینا اور چاگے کی بیوی زینب...... سب میرے گرد جمع ہو جاتے اور میں سب کے لئے تفریح کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتا۔ نیچے شور سن کر امی کھڑکی میں دیکھتیں...... جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑتی فوراً نیچے آتیں، مجھے گود میں اٹھا کر سینے سے لگا کر پیشانی چوم کر رخصت کر دیتیں۔

دادی اماں نے مجھے کاریگر بنانے کے لئے پہلے بڑھئی کے سپرد کیا۔ میں بھاگ آیا، تو ایک لوہار کے ہاں لے گئیں۔ میں کمزور، نحیف و نزار لڑکا بھلا یہ مشقت برداشت کر سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ استاد لوہار نے چند روز بعد ہی مجھے اپنی کارگاہ سے نکال دیا۔

دادی اماں کے دونوں تجربے ناکام ہو گئے تھے۔ مجھے صبح و شام آوارہ گردی کرتے دیکھ کر میرے پھوپھا کو احساس ہوا کہ لڑکا خود کو تباہ کر رہا ہے...... انہوں نے مجھے لاہور میونسپل کارپوریشن کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ دادا جان کے بعد میں پورے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے علم حاصل کرنے کی خاطر کسی مکتب میں قدم رکھا تھا۔

اب صورت یہ تھی کہ اگر میں دادی اماں ہی کے گھر میں رہتا ہوں، تو میری آوارہ گردی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ وہاں ماحول ہی ایسا تھا اور جب تک میں وہاں رہا۔ سوائے آوارہ گردی کے اور کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے پھوپھا نے یہ احسان بھی کیا کہ مجھے اپنے گھر میں پہنچا دیا اور امی سے تاکیداً کہہ دیا کہ آج سے اسے اِدھر اُدھر نہ جانے دینا، ورنہ یہ پڑھے لکھے گا نہیں بالکل آوارہ گرد ہو جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے روز جب اپنے ماں باپ کے گھر گیا تو مجھے فضا کافی اجنبی لگی۔ تایا جان برآمدے میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزرا، تو انہوں نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ابا جان حقہ پی رہے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے گھور کر دیکھا اور پھر گویا نظر انداز کر دیا۔

دادی اماں کے گھر کا صحن بہت کشادہ تھا اور اس میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ ایک گوشے میں نلکا تھا جو ہر وقت شور برپا رکھتا اور یہ شور روزمرہ کی رونق کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں اپنے گھر کے تنگ تنگ کمرے تھے۔ دن کے وقت بھی کسی قدر اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

اپنے فائز العقل تایا جان کو میں نے بارہا دیکھا تھا، لیکن دور ہی سے، کیونکہ چند گھنٹوں ہی کے لئے اس گھر میں آتا تھا اور اب جو انہیں اس احساس کے ساتھ دیکھا کہ رات دن ان کے قریب ہی رہوں گا تو میرا دل خوف کے مارے سینے میں ڈوبنے لگا۔ ایسی وحشت ہوئی کہ جی چاہا فوراً بھاگ جاؤں اور دادی اماں کے گھر پہنچ جاؤں۔

اس وحشت انگیز فضا میں صرف امی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ تھی جو میری دہشت دور کر رہی تھی۔ فقط ان کی آنکھوں کی شفقت تھی جس نے مجھے سہارا دیا اور ان کے ہاتھ کا لمس تھا جو گرمجوشی کی ایک لہر بن کر سر سے پاؤں تک میرے جسم میں سرایت کر گیا۔

انہوں نے ایک سفید کپڑے کو نیلے رنگ میں رنگ کر اس کا بستہ بنا دیا اور اس میں میرا قاعدہ، سلیٹ، سلیٹی، دو قلم اور ایک کاپی ڈال دی۔ دوسرے روز جب میں یہ بستہ گلے میں ڈال کر اسکول جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو انہوں نے اپنے دوپٹے کی گرہ کھول کر دو پیسے نکالے، میرا ماتھا چوما اور پیسے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"دلور! گند بلا نہ کھانا!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ میرے ساتھ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آئیں اور ایک بار پھر تاکید کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''گند بلا نہ کھانا، تانگے گھوڑے سے بچ کر چلنا۔''

گلی کا آدھا راستہ طے کر کے میں نے مڑ کر دیکھا۔ امی دروازے پر کھڑی تھیں اور ان کے ساتھ سراج دھوبی کی بیوی زینب اور اس کا بیٹا خالد بھی نظر آ رہے تھے۔ امی نے ان کو بتایا ہو گا کہ دیکھو دلور اسکول جا رہا ہے۔

امی مجھ اسکول جاتے ہوئے، سکول سے آتے ہوئے، بستہ گھر کی واحد آہنی کرسی پر رکھتے ہوئے پاتیں تو عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگتیں۔ ان نظروں میں ایسی کیفیت ہوتی جسے میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور اس کیفیت کو سمجھنے کی میں نے کبھی کوشش بھی نہ کی تھی۔ کئی سال بعد جب میں اس مسکراہٹ کا خیال کرتا تھا تو یہ میرے لئے کوئی معما نہیں ہوتی تھی۔ امی کی یہ مسکراہٹ فخر و غرور کی مسکراہٹ تھی۔ انہیں کیوں نہ فخر و غرور ہوتا۔ ان کے بچے نے جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم کی روشن دنیا میں قدم رکھا تھا اور پورے خاندان میں یہ فخر صرف انہی کے حصے میں آیا تھا۔

علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود علم کے لئے ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ دادا جان نے اپنی کتابوں کا ذخیرہ ایک لکڑی کے صندوق میں محفوظ کر دیا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ امی ہر دوسرے تیسرے دن کپڑے سے اسے صاف کرتیں اور سوائے میرے کسی کو اسے کھولنے کی اجازت نہ دیتیں۔ میں صندوق میں سے کوئی کتاب نکالتا، تو وہ بڑے یقین افروز لہجے میں کہتیں:

''دلور! تو بڑا ہو گا تو ان کتابوں کو پڑھے گا۔ تیرا دادا جو تھا نا، بڑا ہی لائق فائق تھا۔ وکیل کا منشی تھا۔''

اس زمانے میں وکیل کا منشی ہونا ایک بہت بڑی بات تھی۔

ایک روز انہوں نے مجھے کتابوں کے اس صندوق کے اوپر بیٹھے ہوئے دیکھا تو بولیں:

''دلور! کتابوں کے اوپر بیٹھا ہے، کتنا بدتمیز ہو گیا ہے!''

انہوں نے یہ الفاظ ایسے تلخ لہجے میں کہے تھے جس کی توقع ان سے شاذ و نادر ہی کی جا سکتی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری تعلیم سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ ایک بار میری چھوٹی بہن جلوہ بیگم نے میری تختی پر پانی بہا دیا جس سے اس کی گاچی بہ گئی۔ میری بہن نے تو اپنے خیال میں تختی کو صاف کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا الٹا اثر ہوا تھا۔ امی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اس کی پیٹھ پر اس روز سے دو ہنٹر مارا کہ بے چاری بلبلا اٹھی۔

ابا جان نے جب غصے سے دو مرتبہ میری کتابیں اماں پھاتاں کی بھٹی میں ڈال دیں تو دونوں موقعوں پر امی ہی نے انہیں آگ کے شعلوں سے بچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی اپنی انگلیاں جل گئیں۔

دوسری مرتبہ جب یہی حادثہ ہوا تو میرے دل و دماغ پر مایوسی کے اثرات اس طرح مسلط ہو گئے کہ میں نے طے کر لیا، اب اسکول نہیں جاؤں گا کبھی کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا...... ابا جان کو اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ میں اسکول جاتا ہوں یا نہیں، مگر امی نے جب دیکھا کہ میں دو روز سے اسکول نہیں جا رہا تو تیسرے روز شام کے قریب ایک چنگیر میں روٹی اور سالن لے کر کوٹھے پر آگئیں جہاں میں ایک چارپائی پر بیٹھا بکھری ہوئی ڈور لپیٹ رہا تھا۔ چنگیر انہوں نے میرے آگے رکھ دی اور بڑی نرمی سے بولیں:

''دلور! پڑھتا کیوں نہیں؟''

''میں نے نہیں پڑھنا وڑھنا!'' میں نے غصے میں کہا۔

دو تین لمحے وہ مجھے گھور کر دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں:

''نہ پڑھ! سو بار نہ پڑھ! پر مجھے کیوں شرمسار کراتا ہے۔ رات تیرے دادا خواب میں آئے۔

بولے! ''وزیرے! یہ تیرا دلور پڑھتا کیوں نہیں؟'' میں کیا جواب دیتی! سخت شرمندہ ہو کر رہ گئی۔''

انہوں نے بھانپ لیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے، بولیں: ''میرے دلور! کیا تو مجھے اپنے دادا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے شرمندہ ہی کراتا رہے گا؟''

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئیں اور بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

''پتر! پڑھے گا نہیں، تو لوگوں سے کیا کہوں گی......

امی نے اپنی باتوں سے میرے دل میں دادا جان کا کچھ ایسا احترام پیدا کر دیا تھا کہ میں نے جب سنا کہ وہ خفا ہو گئے ہیں میرے اسکول نہ جانے سے تو میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر رہ گیا اور پھر اسکول جانا شروع کر دیا۔ امی کو اپنے ہر بچے کا خیال رہتا تھا، اس کے کھانے پینے کا، اس کے کپڑے لتے کا، کوئی بیمار ہوتا تو اس کی دوا دارو کا، چھوٹی موٹی بیماری کا تو وہ خود ہی علاج کر لیا کرتی تھیں۔ ہمارے خاندان میں دو روایتیں نہ جانے کہاں سے چلی آئی تھیں۔ ایک روایت یہ تھی کہ کسی کے سر میں درد ہو، پیٹ میں درد ہو، زکام ہو، تو ما زار سے ایک بڑا سا پڑا آ جاتا، اس پڑے میں جوشاندے کے اجزا ہوتے جنہیں دیگچی میں ڈال کر چولہے پر رکھ دیا جاتا اور صبح سویرے اس میں تھوڑی سی چینی ڈال کر خالی پیٹ مریض کو پلا دیا جاتا۔

ان جوشاندے کے کڑوے گھونٹ بھرنے سے ہم بہتر یہ سمجھتے کہ اپنی بیماری کا اظہار ہی نہ کریں۔ مگر امی تو اپنی اولاد کے چہرے کی ذرا بدلی ہوئی کیفیت سے بھانپ لیتی تھیں کہ ان کے بچے کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔

ایک لمحے کے لئے وہ کسی کا چہرہ ذرا بدلا دیکھتیں تو کہتیں:

''ہے نا پیٹ خراب''۔

ایسے موقعوں پر وہ یہی الفاظ استعمال کرتی تھیں۔ اب ہم لاکھ کہیں کہ کچھ نہیں ہوا مگر امی نہیں مانتی تھیں۔ بازار حکیماں کے قدیمی عطار چنن دین یا سدے بازار کے لالہ دونی چند کی دکان سے جوشاندہ خرید لاتیں اور گھر پر بیٹھ کر اس کی مخصوص دیگچی مانجھنے لگتیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک عام سائز کی دیگچی مختص کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ کسی دوسری دیگچی میں جوشاندہ نہیں ابالتی تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری روایت یہ تھی کہ ہمارے گھر میں ایک ایسا لیپ تیار کیا جاتا تھا جس کو دکھتی آنکھوں میں ڈالا جاتا تھا۔ یہ لیپ جو سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، ایک پیالی میں جما رہتا اور یہ پیالی کبھی خالی نہ ہوتی۔ امی اسے خالی ہونے نہ دیتیں۔ گھر میں کسی کی آنکھیں دکھنے لگتیں یا محلے میں کسی کی آنکھیں آ جاتیں تو علاج کے لئے اسی لیپ سے کام لیا جاتا۔ درد میں مبتلا شخص کی دونوں آنکھوں میں ایک ایک سلائی ڈال دی جاتی۔ وہ درد کے مارے چیخ اٹھتا مگر کچھ دیر کے بعد آنکھوں کا درد دور ہونا شروع ہو جاتا، یہاں تک کہ آرام آ جاتا۔

امی یہ لیپ والی پیالی اچھی طرح ڈھانک کر قرآن مجید والے طاق کے اندر رکھتیں اور جب ضرورت ہوتی اسے نکال لیتیں۔

محلے کے سب لوگوں کو اس لیپ کی تاثیر کا علم تھا، چنانچہ ہر شخص کسی وقت بھی ہمارے گھر کے دروازے پر دستک دے کر یہ لیپ مانگ سکتا تھا اور امی اسے اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ دن ہو یا رات جو شخص بھی لیپ مانگنے کے لے آئے اس کی ضرورت پوری کیے بغیر سیڑھیوں سے نیچے اترنے نہ دیں۔ بعض دفعہ وہ خود سلائی خوب اچھی طرح صاف کر کے اس کے ساتھ لیپ آنکھوں میں ڈال دیتیں اور پھر مریض کو چارپائی پر لیٹا دیتیں۔ وہ زیادہ گھبرانے لگتا تو بازار سے دودھ منگوا کر اسے پلاتیں اور جب اس کی آنکھوں کی جلن دور ہو جاتی تو مجھ سے کہتیں کہ اسے اس کے گھر پہنچا آؤ۔

یہ فرض بڑا ناخوشگوار ہوتا، کیونکہ اسے گھر تک پہنچانے میں بڑا اتردد کرنا پڑتا، لیکن امی مٹھائی کا لالچ دے کر یہ کام کروا ہی لیتیں۔

جب میرے اندر سوچنے سمجھنے کا شعور پیدا ہو گیا تو میں کبھی کبھی خیال کرنے لگا کہ امی یا تو بالکل بے حس ہو چکی ہیں کہ کسی بات کا کوئی اثر قبول ہی نہیں کرتیں یا ان کا دل ایسا سمندر بن گیا ہے جس میں جو کچھ بھی ڈالا جائے چپ چاپ نیچے گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے اور سطح ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دادی اماں جب بھی ہمارے یہاں آتیں تو عموماً اس بات پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتیں کہ امی اپنے جیٹھوں کی خدمت نہیں کرتیں۔ ان کی خوراک اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لباس کا خیال نہیں رکھتیں۔

امی ان کے تلخ سے تلخ الفاظ سنتیں مگر جواب میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہتیں۔

فائز العقل جیٹھ کو غصہ آجاتا تو جو چیز اس کے پاس پڑی ہوتی وہ اٹھا کر امی پر دے مارتا۔ کبھی بچ جاتیں اور کبھی وہ چیز ان کے جسم کے کسی حصے پر آگرتی، مگر وہ یہ احساس ہی نہ ہونے دیتیں کہ انہیں تکلیف پہنچی ہے۔ ابا جان بھائی کو جھڑکتے یا اسے مارنے کے لئے چھڑی ہاتھ میں پکڑتے تو امی سامنے آجاتیں، کہتیں:

''ہائے اللہ! وہ تو اللہ لوک ہے بیٹھو، آرام سے!''

اور یہ کہہ کر وہ ان کے ہاتھ سے چھڑی لے لیتیں اور میں دیکھتا کہ اس روز وہ روٹی پکا کر سب سے پہلے پاگل جیٹھ کے منہ میں لقمے ڈالتیں اور اصرار کر کے زیادہ کھلاتیں۔

کبھی کبھی میں امی کی بے حسی پر بری طرح کڑھنے لگتا۔ بالخصوص اس واقعے پر تو میں امی سے لڑ ہی پڑا تھا۔ ہوا یوں کہ دادی اماں کے مکان کے ساتھ جو نیا مکان تعمیر ہوا تو اس کے نچلے حصے میں ڈاکٹر آبیٹھا اور محلے کے لوگوں کا علاج کرنے لگا۔

بڑا خوش بیان اور خوش لباس ڈاکٹر تھا۔ پریکٹس خوب چلنے لگی۔ اس کے ہاں زیادہ تر عورتیں آتی تھیں۔ دور دور سے، اور وہ ان کے علاج کی طرف توجہ دیتا تھا۔

ایک بار دادی اماں کے گھر گیا تو میرے ایک دوست نے بتایا کہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی بڑی دور سے ڈاکٹر کے پاس آتی ہے اور دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ اتفاق سے وہ اس وقت ڈاکٹر کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ سکینہ اس کا نام تھا۔ ایک رات دس گیارہ بجے ہوں گے، میں دیے کی روشنی میں کہانیوں کی کوئی نئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ دادی اماں آئیں اور ان کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون بھی تھی۔ دادی اماں نے جلدی جلدی امی سے کچھ کہا اور الٹے پاؤں چلی گئیں۔ امی اس برقع پوش خاتون کو گھر کے اس کمرے میں لے گئیں جسے ہم ''پرلا کمرہ'' کہتے تھے، یعنی آخری کمرہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غالباً میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ عنقریب کچھ ہونے والا ہے۔ کتاب میں دل نہ لگا۔ اسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ دل میں ایک کشمکش سی ہو رہی تھی کہ اس کمرے میں جاؤں یا نہ جاؤں۔

آخر اٹھا اور ادھر جانے لگا۔ دروازہ بند تھا۔ اسے کھولا۔ اندر اندھیرا تھا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ میں کھڑا رہا۔ چند منٹ بعد امی گھر کا واحد دیا لئے ہوئے آئیں، مجھے دیکھا تو بولیں،

''جاؤ......سو جاؤ......چلو!''

میں ذرا پیچھے جا کر رک گیا۔ امی اندر گئیں اور اب میں نے جو سامنے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چارپائی کی پائنتی کے ایک سرے پر سکینہ بیٹھی ہے۔ اس نے نقاب الٹ رکھا ہے۔ امی کو آتے دیکھ کر نہ جانے کیوں سکینہ نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

امی اس کے پاس کھڑی تھیں، سکینہ کا جسم کانپنے لگا۔ وہ رو رہی تھی۔

''برا کیا......بہت برا کیا!'' امی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

سکینہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور امی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''گھر واپس جائے گی؟'' امی نے پوچھا۔ سکینہ اسی طرح آنکھیں چھپائے بیٹھی رہی۔ امی نے پھر وہی سوال کیا۔

''مر جاؤں گی!'' سکینہ نے بدستور آنکھیں جھکائے ہوئے کہا۔

''گھر نہیں جائے گی؟''

سکینہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ہرگز نہیں جاؤں گی......مر جاؤں گی......لیکن نہیں جاؤں گی۔''

اس واقعے کے تھوڑی دیر بعد ہمارے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک ایسا ہنگامہ جو اس سے پہلے کبھی برپا نہیں ہوا تھا۔ محلے کا ہر ایک بزرگ خاص طور پر چاچا دین محمد اس بات پر زور دے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے تھے کہ اس لڑکی کو فوراً مکان سے نکال دو، کیونکہ ڈاکٹر اسے بھگا کر لے آیا ہے۔ اس کے لواحقین نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہوگی۔ سپاہی ادھر آجائیں گے اور سخت بے عزتی کریں گے۔ تایا جی الگ امی کو گالیاں دے رہے تھے کہ اس نے کیوں سکینہ کو گھر میں آنے کی اجازت دی۔ اماں پھاتاں کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ کر رہی تھی۔ ابا جان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، مگر وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ کوئی بری بات ہوئی ہے اور اس میں مجرم امی ہیں۔ وہ الگ امی پر برس رہے تھے۔ میری بہنیں سہمی سہمی کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

سکینہ تین چار بار جانے کے لئے اٹھی تھی مگر امی نے پکڑ کر بٹھا دیا۔

سب کے سب اسے گھر سے نکالنے پر تل گئے تھے، لیکن یہ صرف امی تھیں جو اسے جانے نہ دیتی تھیں۔ ہر بار اسے جانے سے روک دیتی تھیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بلند آوازیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ چاچا دین محمد یہ کہہ کر چلے گئے کہ تم جانو اور تمہارا کام! اماں پھاتاں اور زینب وہیں تھیں اور اب دونوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد بارہ دری میں جا کر کھڑکی سے باہر دیکھتیں اور پھر واپس آجاتیں۔ وہ کھڑکی کے پاس اس غرض سے جاتی تھیں کہ دیکھیں سپاہی آگئے ہیں یا نہیں۔ واپس آکر کبھی دالان میں اور کبھی باورچی خانے میں رک کر سر جوڑ کر نہ جانے ایک دوسرے سے کیا کہتی رہتیں۔ ابا جان اوپر جا چکے تھے۔ تایا جی اپنی لوہے کی کرسی پر بارہ دری میں بیٹھے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے امی کو گالیاں دے کر یہ خوفناک پیش گوئی کر دیتے تھے کہ گونگے کی بیوی ہمیں مصیبت میں ڈال دے گی۔ وہ ابا جان کو گونگا ہی کہتے تھے۔

ادھر مسجد سے صبح کی اذان کی آواز بلند ہوئی کہ دادی اماں ڈاکٹر کو لے کر آگئیں۔

یہ عجیب بات ہے، میں نے ڈاکٹر کے چہرے کو ویسا ہی پایا جیسا بارہا دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا فکر کی کوئی علامت نہ تھی۔

وہ سکینہ والے کمرے میں آگیا اور بولا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''چلو سکینہ!''

سکینہ ادھ موئی سے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اور اس کے یہ الفاظ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کی نظریں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ جب باورچی خانے میں سے گزرنے لگی تو امی کے قریب آ کر رک گئی۔ صرف دو تین لمحوں کے لئے وہ رکی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا...... آنسو بھری آنکھوں سے ایک بار امی کو دیکھا اور آگے چلی گئی۔

سکینہ چلی گئی۔ مصیبت ٹل گئی، مگر حالت یہ تھی کہ کئی دن تک ابا جان اور تایا جی نے امی سے سیدھے منہ بات نہ کی۔

دادی اماں کے گھر سے جو بھی آتا، امی اس سے یہ سوال ضرور پوچھتیں کہ سکینہ کا کیا بنا...... جواب یہ ملتا کہ اس روز سے ڈاکٹر نہیں آیا۔

کم از کم اس معاملے میں امی کا رول ایک فاتح کا رول تھا۔ انہوں نے سب کے اصرار کا مقابلہ کیا تھا اور سکینہ کو گھر سے نکلنے نہیں دیا تھا، مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے سے کسی قسم کی مسرت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسی طرح گھر کے کاموں میں منہمک رہتیں اور اسی طرح کبھی کبھی کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر اوپر دیکھ لیتیں۔

میں دو باتیں اپنی امی میں کبھی نہیں دیکھ سکا، بلند آواز میں رونا اور کھلکھلا کر ہنسنا۔ مجھے یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی انہیں قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھوں، لیکن یہ حسرت کبھی پوری نہ ہو سکی۔ زیادہ سے زیادہ مسکرا دیتی تھیں اور ان کی مسکراہٹ بھی کچھ جاندار نہ ہوتی۔ روکھی اور دبی دبی سی، پھیکی پھیکی سی۔ ان کے دو بیٹے فوت ہو گئے، شیر خوارگی کے عالم میں۔ اس وقت انہوں نے کیا کہا تھا میں نہیں بتا سکتا، میں دنیا میں تھا ہی نہیں، البتہ میں نے اس کے سامنے اپنی تین بہنوں کو یکے بعد دیگرے موت کی تاریک وادی میں اترتے دیکھا تھا۔ سب سے پہلے میری بڑی بہن انتقال کر گئی۔ مہینوں چارپائی پر تپ دق کے موذی مرض میں گھل گھل کر۔ امی خاموشی سے مرنے والی کی چارپائی کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتی رہیں اور پھر یک لخت اٹھ بیٹھیں، جیسے بیٹی کو رخصت کرنے میں دیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو رہی ہے۔

آپا کی جب شادی ہوئی تھی اور وہ بن سنور کر سہیلیوں کے درمیان آخری کمرے میں بیٹھی تھیں تو امی تیزی سے اندر آئی تھیں اور آتے ہی کہا تھا:

''سرفراز اٹھو...... دیر ہو رہی ہے!''

اور اس روز بھی وہ بزبان خاموشی کہہ رہی تھی۔

''جاؤ بیٹی دیر ہو رہی ہے!''

انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے بیٹی کو نہلانے اور کفن دفن کا انتظام کیا اور پھر چپ چاپ اسے رخصت کر دیا!

دوسری بہن چارپائی پر تھوڑے دن ہی لیٹی اور چلی گئی۔

میں نے دیکھا کہ رخصت ہوتے وقت اس نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ کیا کہنا چاہتی تھی...... شاید یہ کہ امی مجھے پکڑ لو۔ جانے نہ دو اور امی نے چپ چاپ اس کا ہاتھ پکڑے رکھا اور چند لمحوں کے بعد نرمی کے ساتھ اسے اس کے پہلو میں ٹکا دیا۔

تیسری بہن کی موت تو ایک معمہ بن گئی تھی۔

یہ جلوہ بیگم تھی...... بڑی دبلی پتلی...... زور سے آندھی چلتی، تو امی کو اس کی فکر پڑ جاتی اور اسے اٹھا کر جلدی سے کمرے کے اندر لے جاتیں۔ اتنی کمزور تھیں کہ لگتا تھا ابھی گر پڑے گی مگر اس کے اندر داخلی توانائی کافی مقدار میں تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ تانبے کی مٹی میں سے آٹا نکال کر گوندھنے لگتی اور ضد کرتی رہتی کہ خود روٹی پکائے گی۔ جب تک ٹکی پکا نہ لیتی، چولہے سے الگ نہ ہوتی۔ گھر کے ایک کونے میں میلے کپڑے پڑے رہتے، وہ اٹھا کر کھرے پر لے جاتی اور دھونے لگتی۔ امی بھاگ کر آتیں اور کہتیں:

''جلو کی بچی! کیوں جان کی دشمن بنی ہو!''

امی کپڑے چھین لیتیں، مگر وہ وہیں بیٹھی رہتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جلوہ سایے کی طرح گھر کے اندر گھومتی پھرتی۔ ابھی اس کمرے میں ہے اور اب دیکھو تو بارہ دری میں جھاڑو دے رہی ہے۔ جھاڑو دے کر کوٹھے پر چڑھ گئی ہے اور دوپہر کے وقت ہی چار پائیوں پر بستر ے بچھانے لگی ہے۔

بے کار کبھی نہیں بیٹھی تھی، امی کہتی تھی:

''بس کر جلو! بڑا کام کر لیا ہے۔''

جواب دیتی: ''امی ابھی تو بڑا کام پڑا ہے۔''

ایک روز امی نے دیکھا کہ گرمی میں چولہے کے پاس آ بیٹھی ہے۔ انہوں نے کہا۔

''جلوہ! گرمی نہیں لگتی؟''

''نہیں، سردی لگتی ہے۔''

امی نے اس کا ہاتھ پکڑا، تو بڑا گرم تھا۔ انہوں نے اٹھا کر چار پائی پر لٹا دیا اور اوپر لحاف ڈال دیا۔

جلوہ چپ چاپ پڑی رہی۔ دودھ کے دو تین گھونٹ حلق سے نیچے اتارے اور آنکھیں بند کر لیں۔

لحاف کے اندر بے حس و حرکت پڑی رہی، جیسے گہری نیند سو گئی ہے۔ دو تین گھنٹے بعد جب امی گندے برتن دھو کر انہیں اٹھا کر لے جا رہی تھیں، انہوں نے دیکھا، جلوہ اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ امی نے پوچھا:

''کیوں جلو! بھوک لگی ہے؟''

جلوہ نے اپنے معمول کے مطابق کوئی جواب نہ دیا۔ امی برتن نعمت خانے میں رکھ چکیں تو اس کے پاس آئیں۔

''بتاؤ نا کیا بات ہے جلو!''

جلوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امی نے چارپائی پر بیٹھ کر اسے سینے سے لگالیا اور بار بار پوچھتی رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہے، مگر بار پوچھنے پر وہ نفی میں اپنا سر ہلا دیتی اور اس کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ گھر کے سب افراد اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایسے موقع پر ہم خوب لطف اٹھاتے تھے۔ اس وقت ہر ایک اپنی اپنی ہانکنے لگا۔ امی کے سوا کوئی بھی سنجیدہ نہ تھا۔

رات کے دس بجے ہوں گے کہ جلوہ بولی:

''گڈی!''

اگر کوئی نارمل لڑکی اس حالت میں گڑیا کا مطالبہ کرتی، تو یقیناً ہمیں حیرت ہوتی، مگر جلوہ کے متعلق کوئی شخص بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس وقت کیا چیز مانگ لے گی۔ اس لئے اس نے جیسے ہی گڈی کا لفظ منہ سے نکالا، ہم بے اختیار ہنس پڑے۔

جلوہ اب رو تو نہیں رہی تھی، مگر گڈی گڈی کی رٹ لگا رہی تھی۔ امی نے بہتیرا سمجھایا کہ صبح گڈی لا دوں گی، مگر اس کی زبان تالو سے نہ لگی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا...... ہم آنکھوں میں نیند کا خمار لئے اپنی اپنی چارپائیوں کی طرف جانے لگے۔

میں چارپائی پر پہنچا ہی تھا کہ امی نے آواز دے کر بلایا:

''دلور! گڈی لا دو!''

''امی کہاں سے لاؤں؟''

''بازار سے''

''دکانیں بند ہو گئی ہیں امی!''

امی خاموش ہو گئیں...... جلوہ اب خاموش ہو گئی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر امی کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے امی نے اس کے خاموش چہرے پر کیا کیفیت محسوس کی، مجھ سے بولیں:

''دلور! تم اس کے پاس بیٹھو'' اور یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی کے اندر چلی گئیں۔ باہر آئیں تو ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہاتھ میں برقع نظر آ رہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ امی خود گڑیا لانے کے لئے بازار جا رہی ہیں۔ سوچا بازار تو بند ہو گئے ہیں، گڑیا لائیں گی کہاں سے؟

امی نے میرے چہرے سے یہ سوال پڑھ لیا۔ بولیں:

''لے آؤں گی کہیں نہ کہیں سے، خیال رکھنا اس کا!''

مجھے غصہ آیا، جب جلوہ ضد نہیں کر رہی چپ چاپ لیٹی ہے، تو امی کو ایسی کیا پڑی ہے کہ اس کے لئے اس اندھیری رات میں گڑیا خریدنے نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ گڑیا آخر ملے گی کہاں سے؟

امی چلی گئیں...... میں جلوہ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتی تھیں اور کبھی وہ انہیں کھول کر گھور گھور کر میرے چہرے کو یا دیوار کو دیکھنے لگتی۔ اس کے پچکے ہوئے گالوں پر جا بجا ہلکے ہلکے دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ آنسوؤں کے قطرے تھے جو جم گئے تھے۔

شاید آدھ گھنٹہ گزرا تھا کہ امی آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گڑیا تھی۔

یہ گڑیا امی کہاں سے لائیں؟ میرے ذہن میں سوال اٹھا۔ ان سے کچھ نہ پوچھا۔ خود ہی سوچ لیا۔ امینے یعقوب دکاندار کے گھر جا کر اسے جگایا ہو گا اور اس نے دکان کھول کر گڑیا دے دی ہو گی۔

آخر اس مصیبت کی ضرورت کیا تھی؟ یہ تو ہے ہی پاگل، امی بھی پاگل ہو گئی ہیں کیا؟ مجھے رہ رہ کر امی پر غصہ آ رہا تھا...... امی نے سر سے برقع اتارے بغیر گڑیا جلوہ کی طرف بڑھا دی۔

جلوہ نے ہاتھ آگے بڑھا کر گڑیا لے لی۔ اسے غور سے دیکھا اور چھاتی سے لگا کر لیٹ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔

امی نے کوٹھڑی میں جا کر برقع اتارا اور جلوہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''چلو! اب سو جاؤ!!''

جلوہ نے اس کے جواب میں کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا، آنکھیں بند کر لیں۔ امی کئی منٹ تک اس کی چارپائی کے قریب چپ چاپ کھڑی رہیں اور اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہیں۔ پھر وہ اپنی چارپائی پر نہیں گئیں، کھرے پر جا کر وضو کیا اور طاق سے قرآن مجید نکال کر، باہر تخت پوش پر جا کر پڑھنے لگیں۔ وہ قرآن مجید بلند آواز سے پڑھا کرتی تھیں، مگر اس وقت وہ خاموشی سے پڑھ رہی تھیں اور مٹی کے دیے کی روشنی میں ان کا جھکا ہوا، حرکت کرتا ہوا سر، قرآن مجید سے آگے تخت پوش پر لرزتا ہوا سایہ ڈال رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں امی نے کیا قرآن شریف پڑھا ......پھر کیا کیا اور کب چارپائی پر گئیں۔

مرغ بانگ دے رہا تھا جب کوئی شے میری پیشانی سے چھوئی۔ میری آنکھ کھل گئی امی پاس کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور رخسار گیلے تھے۔

''دلور! تری بہن!!''

میں کسی اچانک حادثے کا احساس کر کے فوراً اٹھ بیٹھا۔ جلوہ کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی اور گڑیا اس کے پہلو میں پڑی تھی۔

اس نیند سے جلوہ کبھی نہ جاگی۔

یہ واقعات اس تیزی سے آئے کہ میں انہیں سمجھ ہی نہ سکا۔ جلوہ نے کبھی ضد نہ کی تھی۔ میں نے کبھی اس کی زبان سے اصرار کے ساتھ کوئی مطالبہ نہیں سنا تھا۔ اس رات اس نے گڑیا کے لئے شدید اصرار کیا۔ امی نے اس کی ضد پوری کر دی اور پھر اس کے قریب رک کر دیر تک اسے دیکھتی رہیں......ان کا اس وقت قرآن مجید پڑھنا ایک خلاف معمول حرکت تھی۔ کیا امی کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ رات ان کی بیٹی کی آخری رات ہے!

ضرور معلوم ہو گیا ہو گا......جلوہ کے بارے میں کوئی بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ جو چاہتی تھی، کرتی اور جب تک چاہتی کرتی رہتی۔ بلاوجہ کوٹھڑی کے اندر چلی جاتی۔ امی نے سوچا ہو گا اس لڑکی سے کیا بعید ہے کہ اس رات جو اس نے ضد کی ہے تو اس وجہ سے کی ہے کہ کبھی بہنوں کے ساتھ اسے کھیلنے کا موقع نہیں ملا۔ بہنیں گڑیا گڈے کا بیاہ رچاتیں اور یہ الگ تھلگ بیٹھی رہتی، بس کبھی ایک نگاہ غلط انداز میں ان پر بھی ڈال لیتی۔ گڑیا دا اس نے کبھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوا تک نہ تھا مگر اس کے دل میں لڑکی ہونے کے ناطے ایک حسرت تو ضرور ہو گی۔ اس نے شاید اس وجہ سے گڑیا کے لئے ضد کی تھی کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی یہ حسرت پوری کر لے اور غالباً امی کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔

جلوہ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اپنے وجود کا احساس نہیں دلایا تھا کہ ہمیں معلوم ہو یہ بھی گھر کی ایک فرد ہے۔ کبھی کسی نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ ایک سائے کی طرح گھر میں گھومتی پھرتی...... لیکن جب وہ اس طرح چپ چاپ چلی گئی، تو ہم سب کو ایک بڑی کمی کا احساس ہونے لگا۔ ہم محسوس کرنے لگے کہ ہم نے کچھ کھو دیا ہے...... ہم سے ایک ایسی شے چھن گئی ہے جو غیر شعوری طور پر ہمیں بہت عزیز تھی۔

امی نے اس کی گڑیا اٹھا لی اور نہ جانے اسے کہاں چھپا دیا۔

ہمارے گھر میں مٹی کا دیا جلتا تھا۔ اس کا تیل ایک پرانے کنستر میں نیچے کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ ہر آٹھ دس روز کے بعد امی کوٹھڑی میں جاتی تھیں اور کنستر میں سے تیل کی بوتل بھر کر لے آتی تھیں۔ دیے میں اسی بوتل میں سے تیل انڈیلا جاتا تھا۔

امی نے منع کر رکھا تھا کہ اس کوٹھڑی میں کوئی بھی نہ جائے، کیونکہ ایک تو اس میں دن کے وقت بھی رات کا سا اندھیرا رہتا تھا۔ پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس کے اندر ضرور کوئی سانپ ہوگا، مگر ہم سے کوئی نہ کوئی ضرور وہاں چلا جاتا۔

امی جب ایک ہاتھ میں ماچس اور دیا اور دوسرے میں خالی بوتل پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگتیں تو ہمیں معلوم ہوتا کہ کہاں جا رہی ہیں اور کیا کرنے جا رہی ہیں۔

ایک روز جب میں نے انہیں اس عالم میں پایا، تو دالان کے ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ امی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر کوٹھڑی کے اندر چلی گئیں۔ میں نے وہیں رک کر چند منٹ انتظار کیا...... اور پھر اندر چلا گیا...... میں نے دیکھا امی ایک ہاتھ میں دیے کو پکڑے جلوہ کی گڑیا کو آنکھوں سے لگائے کھڑی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امی گھر میں ہر شخص کی خدمت اس انداز سے کرتیں جیسے وہ کوئی ناخوشگوار فرض انجام نہیں دے رہیں بلکہ ہر فرد خاندان کا حق اسے لوٹا رہی ہیں...... ہر ایک کو پوری پوری اہمیت دیتیں اور یہ اسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ وہ کبھی تو میرے تایا سائیں بکو کے پیچھے پیچھے تھالی میں روٹی، سالن اور پانی کا گلاس لئے چلی جا رہی ہیں اور یہ تایا جی ہیں کہ گالیاں دیتے، شور مچاتے، ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ اور کبھی بارہ دری میں جا کر جھاڑو دے رہی ہیں کہ ان کے بڑے جیٹھ صاحب صاف ستھری جگہ پر بیٹھیں۔ یہ کام بھی وہ اپنے دوسرے جیٹھ کی اہمیت کے زیر اثر کرتی تھیں۔

ابا جی غصے میں آ کر حقے کی خالی یا بھری ہوئی چلم ان کی طرف پھینک دیتے۔ اگر چلم ٹوٹ جاتی، تو وہ اس کی جگہ کوٹھڑی میں سے نئی چلم نکال کر لے آتیں...... چلموں کا ذخیرہ ہمیشہ ان کے پاس رہتا کہ ابا جان کو چلم توڑ کر بازار سے دوسری چلم کے آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ بڑے سلیقے سے حقہ تازہ کرتیں۔ چلم میں تمباکو ڈالتیں اور چمٹے سے اس کے اندر چھوٹے چھوٹے کوئلے بھرتیں۔ حقے کا کش لینے کے بعد اگر ابا جی کے چہرے پر بے زاری کا ذرا سا تاثر بھی ظاہر ہوتا تو وہ دوبارہ وہی عمل کرنے میں مصروف ہو جاتیں۔ میں روٹی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سالن استعمال کرنے کا عادی ہوں۔ امی پہلی مرتبہ برتن میں جتنا سالن دیتی تھیں وہ آدھی روٹی تک چلتا تھا، پھر میں خالی برتن امی کی طرف بڑھا دیتا تھا۔

''دلور! تو روٹی کے ساتھ سالن کھاتا ہے یا سالن کے ساتھ روٹی!'' وہ بناوٹی غصے سے کہتیں۔

ایسے موقع پر میں کبھی نہ چوکتا۔

''امی! ابھی تو ہانڈی بھری پڑی ہے۔''

''کھانے والے کتنے ہیں، کھوتے!''

امی کے منہ سے کھوتے (گدھے) کا لفظ سن کر میں گدھے کی سی آواز نکالتا، تو وہ مسکرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑتیں اور از سر نو سالن برتن میں ڈال دیتیں۔

کبھی کبھی جب میں دیکھتا کہ ہادن کے اندر دستے سے کچھ کوٹ رہی ہیں تو سمجھ جاتا کہ سالن ختم ہو گیا ہے اور امی روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے پیاز کوٹ رہی ہیں۔ پیاز کوٹ کر اس پر نمک مرچ چھڑک کر وہ اپنا پیٹ بھر لیتیں اور کبھی بازار سے کوئی چیز نہ منگواتیں۔

انہیں اس حالت میں دیکھتا، تو دل میں شرمندہ ہو جاتا، لیکن نہ جانے زیادہ سالن لیتے وقت میری یہ شرمندگی کہاں غائب ہو جاتی تھی۔

جب گھر میں ہم میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تھا اور موسم گرمیوں کا ہوتا تو نہ جانے امی کی آنکھوں سے نیند کیوں غائب ہو جاتی تھی...... ہاتھ کا پنکھا لئے آدھی آدھی رات تک اسے جھلتی رہتیں۔

جب مریض پوری طرح سو جاتا تو بستر پر جا کر سو نہیں جاتی تھیں...... حقہ تازہ کر کے چلم بھر کر مریض کی چارپائی کے پاس بیٹھ جاتی تھیں...... حقے کے لمبے لمبے کش لے کر بار بار اس کے چہرے کو دیکھتی تھیں...... اس کے ہونٹ ہلتے تو حقے کی نے چھوڑ کے فوراً اس پر جھک جاتی تھیں۔

"پانی پینا ہے۔"

اگر مریض کا سر اثبات میں ہل جاتا تو اوپر جا کر صراحی کے ٹھنڈے پانی سے گلاس بھر لاتیں اور نہ جانے کتنی بار ماں واری، ماں صدقے کہہ کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیتیں۔

امی گھر کے تمام افراد کے لباس کا خاص خیال رکھتیں۔ ہر ایک کے تین تین، چار چار جوڑے ٹرنکوں میں محفوظ رہتے۔ خود ان کے اپنے پاس فقط دو جوڑے رہتے، ایک جوڑا زیر استعمال اور دوسرا ان کے تکیے کے نیچے۔ جو جوڑا وہ پہنے رکھتیں ڈیڑھ دو ہفتے گزرنے کے بعد اسے دھو کر تکیے کے نیچے رکھ دیتیں اور نیچے رکھا ہوا پہن لیتیں۔ بڑی بہن سے سخت اصرار کر کے سردیوں میں انہیں سوئیٹر پہنا دیا، لیکن چند روز پہننے کے بعد یہ کہہ کر اتار دیا کہ کام کرنے میں حرج ہوتا ہے اور سوئیٹر میری چھوٹی بہن کو مل گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب لاہور میں نلکا لگوانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا تو متوسط طبقے کے گھروں میں ماشکی ہی پانی فراہم کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں لالو ماشکی ایک مشک صبح سویرے اور دوسری مشک دو تین بجے دے جاتا تھا۔ مشک کے پانی سے تانبے کی بڑی مٹکی نصف سے زیادہ نہیں بھرتی تھی ...... شام تک پینے کے لئے بھی پانی کی قلت ہو جاتی تھی۔

امی کا عام دستور یہ تھا کہ شام کے چار پانچ بجے تانبے کے گھڑے اٹھاتی تھیں اور ساتھ کے سکھوں کے مکان میں چلی جاتی تھیں ...... یہاں نچلے کمرے میں نلکا لگا تھا ...... گلی کی بعض عورتیں اسی نلکے سے ایک دو گھڑے بھر کر لے جاتی تھیں۔

امی ایک گھڑا اٹھا کر لاتی تھیں ...... اسے خالی کر کے پھر لے جاتی تھیں۔

اتنے میں دوسرا گھڑا ابھر چکتا تھا ...... وہ بھی لے آتی تھیں ...... چار گھڑے ضرور بھر کر لاتی تھیں۔

ایک روز میری بہن زبیدہ نے جب ان کے کپڑے دھونے شروع کیے تو کرتے کے شانے والے حصے کو داغ دار پایا ...... سمجھ گئی گھڑے اٹھانے سے امی کا شانہ ضرور زخمی ہو گیا ہے۔

ہم سب نے انہیں گھڑے اٹھانے سے روک دیا ...... یہ ذمے داری میں نے اٹھالی ...... مگر زیادہ دن اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔

امی کہتی تھیں ...... دلور! تو باؤ ہے ...... یہ تیرا کام نہیں ہے۔ اور یہ کام نہوں نے پھر اپنے ذمے لے لیا۔

امی کی زبان میں سے کبھی کوئی شعر نہیں سنا تھا۔ کسی وقت خاص موڈ میں ہوتیں تو حقہ پیتے ہوئے کہتیں۔

ملک ماہی دا وسے

کوئی رووے، تے کوئی ہسے

دیر تک ان کے ہونٹوں پر یہ الفاظ جاری رہتے۔ اس دوران دو تین بار سر اٹھا کر اوپر بھی دیکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیتی تھیں۔

وہ صبح سے لے کر شام اور بعض اوقات آدھی رات تک کام میں مصروف رہتیں۔ ایسے میں کسی واضح تاثر کی نشاندہی ان کے چہرے سے نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں ان لمحوں میں ان کا چہرہ ضرور کھل اٹھتا جب میری کوئی شادی شدہ بہن سسرال سے گھر آتی یا میں امتحان میں اپنی کامیابی کی خوشخبری سناتا، اس وقت بھی وہ خوش خوش دکھائی دیتیں۔ وہ اس وقت بھی خوش دکھائی دیتی جب ہم سب باورچی خانے میں چٹائی بچھا کر اس پر بیٹھ جاتے اور کھانا دینے کے لئے ان کے ہاتھ حرکت کرنے لگتے۔

اس موقع پر اگر جلوہ بھی بیٹھ جاتی، تو ای باغ باغ ہو جاتیں۔ وہ اسے اپنے قریب بٹھا لیتیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ خود لقمے توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتیں۔

میں نے انہیں کبھی بیمار ہوتے نہ دیکھا۔ زیادہ صحیح یہ کہ انہیں علیل ہو کر چار پائی پر لیٹے ہوئے نہیں پایا۔ سر درد ہوتا تو ایک رومال کس کر باندھ لیتیں اور کنپٹیوں پر تھوڑا تھوڑا آٹا لگا لیتیں۔ بخار ہوتا تو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس نہ جاتیں۔ عطار سے بخار کی گولیاں منگوا کر ایک ایک کر کے پانی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے نیچے اتار لیتیں۔ ہم بار بار انہیں ڈاکٹر کے ہاں لے جانے کی کوشش کرتے، وہ جانے پر تیار نہ ہوتیں۔ ان کی بیماری کے آخری دنوں میں جب حکیم اکبر حسین انہیں دیکھنے کے لئے گھر پر آئے تو یہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ تھا۔

گھر کا سارا خرچ چلانا امی کی ذمے داری تھی۔ آمدنی محدود تھی۔ سال میں دو مرتبہ ان کو مقررہ رقم ملتی۔ اسے ہم ''چھمائی'' کہتے تھے۔ بس یہی رقم ہوتی جس سے انہیں پورے چھ ماہ تک سارے اخراجات پورے کرنے ہوتے۔ تنگ دست ہمیشہ رہتی۔ امی اپنی ذات پر تو ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتیں۔ اولاد میں سے کوئی ذرا بڑھیا لباس بنوانے کی خواہش کا اظہار کر دیتا تو ناراض ہو کر فرماتیں: ''گزارے والی بات کر!''

یہ لفظ کہنے کو تو کہہ دیتیں، مگر تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنے بچے کی رونی صورت دیکھتیں تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں: ''ذرا صبر کر اب چھمائی آئے گی تو کپڑے بنوا لینا!''

یہ وعدہ عام طور پر پورا نہ ہوتا۔ امی اسے اگلی ششماہی پر ٹال دیتیں اور پھر اس سے اگلی ششماہی پر اور یہ ان کی مجبوری تھی۔ یہ بات ہم پہلے نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے انہیں بے تحاشا تنگ کرتے۔ بعد میں کچھ سمجھ گئے، تو انہیں زیادہ تنگ کرنا چھوڑ دیا۔

امی خرچ کرنے کے معاملے میں اباجی کے مطالبات کا بھی خیال نہ رکھتیں اور یہ واحد معاملہ تھا جس میں وہ اپنے شوہر کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھیں۔

اباجی ذرا شوقین مزاج واقع ہوئے تھے۔ مچھلی کے شکار کا انہیں شوق تھا۔ جس صبح انہیں دریا پر جانا ہوتا، امی کی شامت آجاتی۔ تقریباً صبح کی اذان سے بھی پہلے جاگتیں، تاروں کی چھاؤں میں سارا سامان تیار کرتیں اور جب کھانا تیار کرنے کی نوبت آتی تو جھگڑا شروع ہو جاتا۔ امی ان کے لئے تو دو پراٹھے پکا کر سالن تیار کر دیتیں، مگر اباجی کا اصرار ہوتا کہ ان کے ساتھ جو ان کے دوست جا رہے ہیں ان کے لئے بھی کھانا پکایا جائے۔

اباجی کہتے: ''میرے دوست بھوکے رہیں گے۔''

امی کہتیں: ''وہ اپنے گھروں سے روٹیاں سالن لے کر کیوں نہیں آتے؟''

اباجی اور تایا جی کے بارے میں خیال لوگوں کا یہ تھا کہ صاحب جائداد ہیں، بڑی آمدنی ہو گی، لیکن یہ حقیقت کون جانتا تھا کہ امی کس طرح گزارہ کرتی ہیں اور کس طرح ایک ایک پیسہ بچا کر گھر کے خرچ چلاتی ہیں۔

اباجی ہر چوتھے پانچویں دن پانچ سو روپے مانگ لیتے تھے۔ امی نہیں دیتی تھیں۔ اباجی پہلے تو زبان سے اور پھر ہاتھوں سے کام لینا شروع کر دیتے۔ ان کا دوپٹہ پھٹ جاتا۔ خود زخمی ہو جاتیں، لیکن اباجی کا مطالبہ تسلیم نہ کرتیں۔

جھگڑا بڑھ جاتا، تو زینب آجاتی یا مائی پاتھاں...... فیصلہ یہ ہوتا کہ اگر اباجی دس روپے مانگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے ہیں تو امی انہیں پانچ روپے دے دیں۔ امی پانچ روپے بھی نہیں دیتی تھیں۔ بڑی مشکل سے چار روپے دینے پر رضامند ہوتیں۔ اس وقت مجھے امی پر بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ ابا جی کو کیوں روپے نہیں دے دیتیں۔ کیوں جھگڑا بڑھاتی ہیں۔

اس سوال کا جواب آنے والے حالات نے مجھے دے دیا۔ میری بڑی بہن بیمار ہو کر میکے آگئی...... سارا علاج معالجہ امی نے کیا۔ دوسری بہن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بچوں کی شادیوں پر بھی انہوں نے بیشتر خرچ اپنی گرہ ہی سے کیا۔ مجھے دوران تعلیم میں فیس ادا کرنے اور کتابیں خریدنے میں کبھی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

امی کی وہ خوشی مجھے کبھی نہیں بھولتی جب میں نے اپنی اولین تصنیف ''صحرانورد کے خطوط'' کا انتساب ان کے نام کیا...... اس وقت میں نے نہیں کسی عزیز رشتے دار یا ہمسائے نے یہ بات ان سے کہہ دی۔ بولیں:

''دلور! تو نے میری کتاب لکھی ہے؟'' ان لمحوں میں ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا...... سوچتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا جو بچپن میں اپنے دادا جان کی کتابیں صندوق سے نکال نکال کر شوق سے دیکھا کرتا تھا، آج خود کتاب لکھنے لگا ہے۔

میں نے کہا: ''امی! آپ کی کتاب لکھی نہیں...... اپنی کتاب آپ کے نام کی ہے، اسے کہتے ہیں انتساب!''

امی یہ بات بالکل نہ سمجھ سکیں...... یوں سر ہلا دیا جیسے کہہ رہی ہوں پتہ نہیں تو کیا کہہ رہا ہے۔

میں نے کتاب کی پہلی جلد انہیں دی تو وہ دیر تک اسے دیکھتی رہیں...... اس کی ورق گردانی کرتی رہیں...... اس کے بعد تو یہ صورت ہوگئی کہ گھر میں جو شخص بھی آتا، اس سے ضرور کہتیں:

''میرے دلور نے میری کتاب لکھی ہے۔''

محلے میں بھی کسی کے گھر جاتیں، تو یہی بات کہتیں...... کتاب کو میلے ہاتھ نہ لگاتیں اور نہ کسی کو لگانے دیتیں...... جب بھی اسے ہاتھ میں لیتیں، ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج میری امی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہیں ہم سے رخصت ہوئے اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ میں جب یہ سوچتا ہوں کہ میں نے امی کی کوئی خدمت نہیں کی تھی...... خوشی کے بس صرف یہی لمحے دیے تھے، تو میرا دل ایک انجانی مسرت سے بھر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کی سوگوار ویرانیوں میں ایک نغمہ شریں گونج اٹھا ہے یا گرمی کی تپتی ہوئی فضا میں کہیں سے باد بہار کا ایک جھونکا آ کر میرے سینے میں اتر گیا ہے۔

میری امی اس دنیا میں نہیں ہیں، مگر یہ کس کا ہاتھ ہے جو مایوسیوں کے ہجوم میں میرے سر پر آہستہ آہستہ پھرنے لگتا ہے! یہ کس کی انگلیاں ہیں جو میرے گیلے گالوں کو چھونے لگتی ہیں اور سارے آنسو خشک ہو جاتے ہیں! یہ کس کا چہرہ ہے جو تاریکیوں میں طلوع ہو کر ہر طرف روشنی بکھیر دیتا ہے!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماں سردار بیگم

اشفاق احمد بے پناہ ادبی اور تخلیقی تجربات سے گزر کر اب ایک ایسے مقام پر آ پہنچے ہیں جو اہل دانش کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ ان کی عظمت خیال اور صداقت احساس نے فن کو ایک رفعت عطا کی ہے اور اسی رفعت فن کے ساتھ انہوں نے اپنی والدہ کا ایک جیتا جاگتا خاکہ تیار کیا ہے۔ ایک ایسا خاکہ جو زندگی کو ایک معنویت اور حقیقت عطا کرتا ہے!

••••••••••••••••••••••

میری والدہ کا نام سردار بیگم تھا اور گھر کے سب چھوٹے بڑے ان کو اماں جی کہہ کر بلاتے تھے، لیکن ان میں میرے حساب سے کوئی خاص بات نہ تھی جس کی وجہ سے ان پر کوئی مضمون لکھا جائے یا ان کو ادب و تاریخ کے فورم سے ہو کر گزرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی اور گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ پیچھے رہ جانے والوں کے لئے کوئی خلا نہیں چھوڑتیں!

اس وقت بھی جب میں یہ چند سطریں جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں تو مجھے اپنی اماں کا چہرہ، ان کی باتیں اور ان کا زمانہ یاد کرنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ وہ ہماری زندگیوں میں بہت قریب ہوتے ہوئے بھی کبھی شدت سے نظر نہیں آئیں۔ معدوم معدوم سی رہیں اور موہوم سی زندگی گزار کر ایک روز گھر کے پچھلے دروازے سے نکلیں اور میانی صاحب چلی گئیں۔ وہ دبدبہ اور طنطنہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جاہ وجلال جو آٹھ کامیاب بچوں کی ماں میں ہوتا ہے کہ اس ماں کا سایہ بھی ٹیڑھا نہیں پڑتا، میری ماں میں سرے سے مفقود تھا۔ وہ زمین سے، آسمان سے، زمانے سے اور ان کے خالق سے بہت ڈرتی تھیں۔ اور کچھ اس طرح دیواروں سے لگ لگ کر زندگی گزارتی تھیں کہ کسی کو ان کے بچوں کی خبر نہ ہو جائے۔ کوئی گنتی نہ کر لے۔ کسی کو ان کے گھرانے کے "ہونے" کا علم نہ ہو جائے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہم کو بھی اپنے جیسا گمنام اور بے نام بنا کر اسی دنیا میں داخل کر دیتیں اور پھر کسی کو علم تک نہ ہوتا کہ اس عہد کے گوہر نایاب کس طرح مٹی میں مل گئے!

اس زمانے میں بچے نوکر نہیں پالتے تھے مائیں پالتی تھیں۔ غریب مائیں، امیر مائیں، بھونڈی اور پھوہڑ مائیں، بیمار اور اپاہج مائیں، پاکباز اور طوائف مائیں، سبھی اپنے بچے خود پالتی تھیں۔ ان کے پاس بچے پالنے کا بڑا سستا اور آسان نسخہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بچے اپنی اپنی ماں سے چالیس پینتالیس گز کہیں بھی کھیلتے، ان کو اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ مشکل وقت میں ان کی پکار پر اماں بجلی کی طرح جھپٹ کر مدد کے لئے آ موجود ہوگی اور وہ اپنی مشکل اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر گھر کے اندر کسی محفوظ کونے میں پہنچ جائیں گے۔ اس زمانے کی مائیں بچوں کو اپنی عقل و دانش سے، یا نفسیاتی ذرائع سے یا ڈاکٹر سپوک کی کتابیں پڑھ کر نہیں پالتی تھیں بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح صرف ممتا کے زور پر پالتی تھیں۔ بچے بھی کھلونوں، تصویروں، ماؤں کی گودیوں اور لمبی لمبی کیمونی کیشنوں کے بغیر پروان چڑھتے تھے اور ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر بڑے ہی سرسبز ہوتے تھے۔ ان کے پاس یقین کی ایک ہی دولت ہوتی تھی کہ ماں گھر پر موجود ہے اور وہ ہر جگہ سے ہماری آواز سن سکتی ہے۔ جس طرح پکے پکے خدا پرست کو پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے حلقے میں ہر وقت موجود ہے اور وہ جب اسے پکارے گا اسے جان سے بھی قریب پائے گا، اسی طرح بچے کو بھی اپنی پکار اور ماں کے جواب پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے!

میری ماں کچھ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ گاؤں میں اپنے عالم فاضل، نوکری پیشہ چچاؤں کے چھٹی آنے پر جلدی جلدی جو کچھ پڑھ لیا، پڑھ لیا، اس کے بعد انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخبار بڑی آسانی سے پڑھ لیتی تھیں اور مضمونوں اور اداریوں کے رخوں کو بھی سمجھ لیتی تھیں، لیکن لکھنے کے معاملے میں ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی اور بھرپور دوپہر لگا کر ایک صفحہ لکھ تو لیتی تھیں لیکن اسے پڑھنا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ اماں کے ہجے بہت خراب تھے لیکن وہ اردو کے موثر الفاظ مثلاً مصداق، تفحیک، القصہ اور قطعی وغیرہ بڑے شوق سے استعمال کیا کرتیں تھیں۔ گو ان الفاظ کے سپیلنگ ہمیشہ غلط ہوتے تھے لیکن یہ فقرے میں سجتے بہت تھے۔ ان کے خط کا کوئی لفظ کٹا ہوا نہیں ہوتا تھا، ماسوائے ''طولعمرہ'' کے۔ وہ ہر بچے کا نام کے ساتھ طولعمرہ لکھنا ضروری خیال کرتی تھیں اور یہ لفظ بار بار کٹنے سے بچے کے حصے میں کم از کم چھ طولعمرہ آ جاتے تھے، اور نام کے سامنے ایک خوبصورت سی تجریدی جھالر بھی بن جاتی تھی۔ ان کے خطوں میں اکثر دو شعر بھی ہوا کرتے تھے۔ جب کسی وجہ سے انہیں یہ احساس ہوتا کہ ہم میں تکبر، رعونت یا گھمنڈ کا کوئی شائبہ پیدا ہو گیا ہے۔ تو وہ اکثر لکھا کرتیں۔

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نریل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر! کبیر!!

اور دوسرے جب انہیں ہمیں ''بک اپ'' کرنا مقصود ہوتا تو اپنی مخصوص لکھائی میں رقم کیا کرتیں:

الوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں، کوہ سے دریا بہاتے ہیں

جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ اماں کو صبح شام تین بھینسوں کا دودھ دوھنا پڑتا تھا۔ بڑے ٹوکے کا گول پہیہ چلا کر دو پولے چارہ کترنا پڑتا تھا۔ اور اٹھارہ آدمیوں کی روٹی پکانی پڑتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ مہمان آ جاتے تو اٹھارہ سے بڑھ کر یہ تعداد اٹھائیس تک بھی پہنچ جاتی تھی لیکن ان کو یہ بوجھ کبھی ناگوار نہیں گزرتا تھا کہ ایک تو مہمان اپنا رزق ساتھ لاتے تھے۔ دوسرے ان کے آنے سے گھر کی برکتوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تیسرے ان کی وجہ سے بچوں سے ہر قسم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلائیں دور ہو جاتی تھیں۔

اماں کا چولہا کھلے صحن میں تھا۔ نہ دھوپ سے بچنے کی کوئی اوٹ تھی نہ بارش سے بھیگنے میں کوئی رکاوٹ۔ چودہ مرلے کے کھلے آنگن میں بڑی آسانی سے ایک چھتی ہوئی رسوئی بن سکتی تھی لیکن پتہ نہیں اباجی نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اماں، گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھٹیوں کی طرح گرم اور الاؤ سے زیادہ سرخ چولہوں پر پاس بیٹھ کر مزے سے روٹی پکایا کرتیں اور ہم اپنا اپنا کھانا اٹھا کر برآمدے میں پنکھے تلے چلے جایا کرتے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کی دھار نمودار ہوتی تو وہ ہاتھوں میں پیڑا پکڑے آستین سے اپنا چہرہ پونچھ لیتیں لیکن جب ان دھاریوں کا دوابہ قابو سے باہر ہو جاتا تو وہ اپنے کھردرے دوپٹے کا ''بنوں'' سا بنا کر اس سے اپنا شرابور چہرہ رگڑ رگڑ کا خشک کر لیتیں، لیکن اگلی روٹی پر پھر یہی عمل دہرانا پڑتا۔ آفتاب بھائی اگر گھر پر ہوتے تو وہ چولہے کی دیوار کے ساتھ منجی کھڑی کر کے اس پر مجنوں ڈال دیتے اور اماں کے لئے سایہ مہیا ہو جاتا۔ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کے حصول میں بھی کوشاں تھے اور اماں ہمہ وقت ہماری خدمت گزاری پر مامور تھیں۔

اب جب میں اپنی بہوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اماں کا وہ ہولناک زمانہ یاد آتا ہے جب وہ رات کے بارہ بجے کام کاج سے فارغ ہو کر دودھ کو جامن لگا کے ہارے میں رکھ کر چارپائی پر لیٹتی تھیں اور ملا کی اذان سے پہلے صبح کے کام کی چیزیں چولہے پر سامنے نصف دائرے میں رکھ کر بانگ کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ نماز سے عجلت کے ساتھ فارغ ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں تلاوت شروع کر دیتیں اور پاؤ بھر خالص پنجابی لہجے میں تلاوت کرنے کے بعد دوپٹہ گردن سے لپیٹ کر دودھ بلونے لگتیں۔ اماں کی مدھانی کی آواز پر ہم سب جاگ جاتے لیکن اپنے اپنے بستروں میں اسی طرح سے پڑے رہتے۔ میری دونوں آپائیں ایک ساتھ وضو کر کے ایک ساتھ تخت پوش پر چڑھتیں اور روشنی پھیلنے تک برابر دی ایک ساتھ نفل پڑھا کرتیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب لسی رڑ کنے کی آواز بند ہو جاتی اور سارے گھر میں پراٹھوں کی دھواں دھار خوشبو پھیلنے لگتی تو ہم ایک ایک کر کے اٹھتے اور منہ پر کچے پکے چھپاکے مار کر اماں کے سامنے پیڑھیوں پر آبیٹھتے۔ بس یہی ایک وقت تھا جب ہمارے اور اماں کے درمیان کچھ واضح قسم کی گفتگو ہوتی، ورنہ باقی کا سارا وقت تو اپنے اپنے کام میں بھسم ہو جاتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو کچھ عجیب طرح کے خیال اور انوکھی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ اس وقت ان کا احساس تک نہ تھا، لیکن اگر احساس ہو بھی جاتا پھر بھی ہم کچھ نہ کرتے۔ اب بھی تو بہت سی چیزوں کا احساس ہو چکا ہے اور احساس کی اس وسیع وعریض جھیل میں نت نئے احساس کے صاف پانی ہر روز شامل ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ بھی نہیں ہو پاتا۔ انسان دراصل بہت سہل نگار اور آرام طلب شے ہے۔ جب کبھی اس کا احساس اسے شدت سے تنگ کرنے لگتا ہے تو وہ دوسروں کے درپے ہو جاتا ہے اور ان کو شرم دلانے لگتا ہے کہ تم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ کچھ جھڑکیوں اور المنوں کا انداز تو اس غضب کا ہوتا ہے کہ وہ دنیائے ابلاغ میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں۔

میری ماں کے زمانے کی عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تو غائب غلہ ہو جاتی۔ اس کو مکٹ سجا کے، پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کا جل لگا کے مہمان خصوصی بننے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو کر ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اس کے اثر آثار کا پتہ تک نہ چلتا تھا۔ یہ مہارت شاید اس نے پردہ نشین سے حاصل کی تھی۔ بڑے سے بڑا کام کرنے کے بعد بھی وہ ہیروئن کی سٹیج پر آنے سے کتراتی تھی۔ اس زمانے میں عورت کا روپ پری کا سا تھا۔ جب کوئی بھی نہ ہوتا تو وہ باغ لگا کر، پھول کھلا کر، تخت بچھا کر اور پکوانوں کے ڈھیر لگا کر غائب ہو جاتی تھی اور کہیں دور چھپ کر نوع انسانی کو حظ وسرور کی محفل انبساط سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھ کے خلاقی کے وسیع تر دائرے کا مرکز بنی رہتی۔ اور اس کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات کا کبھی احساس تک نہ ہوتا کہ وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہی ہے یا کسی مقصد کے لئے کر رہی ہے۔

اماں کا ہر روز باریک باریک پالک، موٹے موٹے آلو اور گول گول ٹماٹر کاٹ کر انہیں بڑے پریم اور چاؤ کے ساتھ دھونا، ساتھ کچھ پڑھتے جانا۔ گھی، پیاز، نمک، مرچ، ہلدی، دھنیا اس طرح دیگچی میں اتارنا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ خود اپنی نظر ڈالنے سے بھی گریز کرنا۔ ڈوئی کی ہر گھومتا کے ساتھ پانی کا چھینٹا دینے کے بجائے محبتوں کے چھپا کے مار مارک ہنڈیا بھوننا۔ پھر پڑھے ہوئے پانی کو جب ہنڈیا میں اتارنا تو پہلے ''چھوں'' کی جھانجر کا صحن خانہ میں تیزی سے لپکنا۔ اس کے بعد ہر طرف خاموشی کا پہرا بیٹھ جانا۔

میری ماں دس گیارہ برس سے ایک ہی قسم کے برتن دھو رہی تھی۔ وہی گلاب کے پھول اور ناشپاتی کی تصویر والی تام چینی کی تھالیاں، بھالو کی شکل کے چپ والی سلور کی دیگچی۔ چھوٹے پیندے اور بڑے منہ کے ڈگمگاتے گلاس۔ ایلومینیم کے کٹورے۔ ہشت پہلو تانبے کی رکابیاں جو قلعی کے گھس جانے سے باتصویری ہو گئی تھیں۔ اصل ریتی کی چھری جو درمیان سے گھس گھس کر کیلا کاٹنے والوں کی بانک بن گئی تھی اور مرادآبادی جگ جس پر بڑے بڑے ابھرنواں پھول بنے ہوئے تھے۔ چونکہ اس عہد کی عورتیں بور ہونے کے فن سے ناآشنا تھیں اسی لئے وہ گیارہ گیارہ سال تک ایک ہی قسم کے برتنوں کو دھوئے جاتی تھیں اور ان کی کمپنی میں خوش رہتی تھی۔ میری ماں کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اب جو تھالی دھونے کے لئے اٹھائی ہے اس کے گلاب کی ساری پنکھڑیاں گھس گئی ہیں لیکن اس کی ناشپاتی کی ڈنڈی بالکل سلامت ہے۔ یہ طشتری اسحاق کی ہے۔

جس کا سب کچھ معدوم ہو چکا ہے اس میں افتخار کھاتا ہے اور جس کا گلاب اور ناشپاتی اپنے اصل رنگ روپ کے ساتھ قائم ہیں وہ اشتیاق کی پلیٹ ہے۔ اب جن برتنوں کی نامزدگیاں اس قدر محترم ہوں ان سے کوئی ماں کس طرح سے بور ہو سکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تو ہر بے جان برتن کیسٹ کی طرح بولتا ہے اور کچن میں ریڈیو کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر طرف میلہ سا لگا رہتا ہے!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھانے کے ان اوقات میں جب بڑی آپا اور آفتاب بھائی فلسفے کی پیچیدگیاں سلجھا رہے ہوتے تو کبھی کبھی اماں بھی اس میں دخل دے دیا کرتیں۔ جب بھائی جان بنی نوع انسان کی زبوں حالی اور ہندوستان کے باکمال و پریشان مسلمانوں کی بے بسی اور بے آبروئی کا نقشہ کھینچتے تو ہم سب کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اماں ہلکے خوف، ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں کہتیں: ''ہمیں اپنے غریب بہن بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر اور ان کی بے سرو سامانی اور بے آبروئی پر ترس کھا کر ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے ان کی دستگیری کرنی چاہیے۔ ترس کھانے اور آنسو بہانے کے مقابلے میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم زیادہ زور آور اور زیادہ ڈاڈھا ہے۔ ہم کو حکم ماننا ہے ترس نہیں کھانا''۔

منجھلے بھائی ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہہ دیتے: ''اماں یہ باتیں آپ کی سمجھ سے اوپر کی ہیں، اس لئے آپ ان میں دخل نہ دیا کریں۔ ہو سکے تو ان کو غور سے سنا کریں اور ان پر عمل کی کوشش کریں''۔ اماں معذرت بھرا، شرمندہ سا چہرہ لے کر خاموش ہو جاتیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا موقع آجاتا کہ ان کے منہ سے ایسی ہی کوئی بات نکل جاتی اور ابا جی سمیت ہم سارے پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سے محبت نہیں کرتے تھے یا ان کی ہمارے گھر میں کوئی عزت نہیں تھی یا ہم ان کو مان نہیں دیتے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک وہ اتنی ہی معزز و محترم تھیں جس قدر پڑھے لکھے گروہ کے نزدیک ان پڑھ عوام الناس کا ٹولہ ہوتا ہے۔ ماں ہونے کے رشتے سے اور انسان ہونے کے حوالے سے ہم اپنی ماں کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث ہم ان کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑی خوبصورت، بہت ہی حسین اور بے حد وجیہ خاتون تھیں۔ لیکن ان کے اور ہمارے درمیان علم کی قدر مشترک نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اور ہمارے درمیان کوئی ڈائیلاگ نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب ہم اپنی شرافت علمی کی بدولت ان کے قریب آنے کی کوشش کرتے تو وہ کوئی ایسا جملہ بول جاتیں جس کی پڑتال ہماری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابوں سے نہیں ہوتی تھی، اس لئے ہم ایک مرتبہ پھر ان سے دور ہو جاتے۔ مثلاً ایک مرتبہ میرے والد اور بڑے بھائی زندگی اور موت پر اپنی خوبصورت آراء کا اظہار کر رہے تھے اور ہم سارے چھوٹے مبہوت ہو کر ان کے فلسفیانہ افکار سے مرعوب ہو رہے تھے کہ میرے والد نے کہا: ''بات یہ ہے آفتاب میاں کہ موت ایک معمہ ہے اور اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا'' اماں جو قریب بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی تھیں، رہ نہ سکیں اور سر اٹھا کے بولیں: ''موت اگر ایک معمہ ہے ڈاکٹر صاحب، تو موت ہی اس کا حل بھی تو ہے!'' ابا جی نے غضبناک آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھ کر کہا: ''جس بات کی سمجھ نہ ہو سردار بیگم اس میں دخل نہیں دیا کرتے۔'' اماں پھر سر جھکا کر بھنڈیاں کاٹنے میں مشغول ہو گئیں۔

اماں کی یہ باتیں مجھے اب یاد آ رہی ہیں تو میں انہیں زور لگا کر بیان کرنے لگا ہوں۔ اس وقت تو میں بھی ابا اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ میرے گھر میں میری بڑی آپا کے مضمون ''تہذیب نسواں'' اور ''عظمت'' میں شائع ہونے لگے تھے اور اماں گرمیوں کی بھی دوپہریں صرف کر کے ان مضامین کو بڑی مشکل سے اٹھاتی تھیں۔ آپا نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ اماں یہ آپ کے پڑھنے کی چیزیں نہیں ہیں کہ ان میں عورتوں کے مشکل مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے، لیکن وہ آپا کی بات کا جواب دیے بغیر بڑی کاوش سے ان پرچوں کو ڈھونڈتیں اور اپنی بیٹی کے مضامین کا مطالعہ کر کے خوش ہوتیں۔ آپا کو ہندوستان کے دور دراز شہروں سے تعریفی خط آنے شروع ہو گئے تھے اور ہم سب بڑے فخر کے ساتھ ان خطوں کو باجماعت پڑھا کرتے تھے۔

اماں بھی گھومتے پھرتے، کام کاج کرتے، بہانے بہانے ہمارے پاس رک کر خطوں کی عبارت سنا کرتیں اور دل ہی دل میں اترایا کرتیں۔ ایک روز جب بڑی آپا نے ابا جی کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اس وقت ہندوستان کے سبھی پڑھے لکھے لوگ میری تعریف کرتے ہیں اور میرا مان بڑھاتے ہیں تو اماں نے دلشگاف الفاظ میں کہا: ''جب سبھی لوگ کسی شخص کی تعریف کرنے لگ جائیں تو اس شخص کو آپ ہی شرم آنی چاہیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب سب تمہاری تعریف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توصیف اور قدر افزائی پر یکجا ہو جائیں تو تمہیں چوکنا ہو جانا چاہیے۔ یہ بہت ہی بری بات ہے"۔

یہ بات سن کر میری مضمون نگار آپا کا چہرہ اتر گیا اور ان کی آنکھیں بھر آئیں تو اباجی نے ہاتھ کے قہر آگیں اشارے سے اماں کو کمرے سے نکال دیا۔ دراصل بڑی آپا ہمارے ابا کی ساری اولاد میں سے سب سے زیادہ لاڈلی تھیں اور ہم سب ان کے جلو میں باادب باملاحظہ ہوشیار ہو کر چلا کرتے تھے۔

کھانے پینے کے معاملے میں اماں کا دستور نرالا تھا۔ جب گھر کے سب بچے، نوکر چاکر، مہمان اور کبھی کبھی آنے والے فقیر بھی کھا چکتے تو اماں کی باری آتی۔ وہ پہلے تو دیگچیوں میں آدھی چپہ روٹی پھیر کر انہیں دردتہہ جام سے لتھیڑتیں پھر انہیں نیبو یا آم کے اچار سے کھاتیں اور ساتھ دھنیا کی گھولوا چٹنی میں انگلی ڈبو کر لقمے کے ساتھ ساتھ چاٹتی جاتیں۔ اس وقت اماں چند ایسی لامعلوم بیماریوں میں مبتلا تھیں جن کے علاج دریافت نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً پھل کھا کر ان کے معدے میں جلن ہونے لگتی تھی۔ مٹھائی کھانے سے ان کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور پتی اچھلنے لگتی۔ دودھ پینے سے سر درد شروع ہو جاتا اور پلاؤ کھانے سے تنفس میں تیزی آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے پراٹھے کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھا لیا تھا تو مرتے مرتے بچیں۔ ٹھنڈا شربت، گرم چائے، آئس کریم اور فالودہ کھانے سے ان کی انتڑیوں میں سدے پڑ جاتے تھے اور مربہ کھانے سے ان کی نگاہ کمزور ہو جاتی تھی۔ ہم نے ساری زندگی ان کو کبھی ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوتے دیکھا نہیں لیکن ان کے بیان حلفی پر یقین رکھا کہ اگر وہ ایسی بے اعتدالی کریں گی تو یقیناً ایسی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔

اماں کو باسی کھانے، پرانے ساگ، اترے ہوئے اچار اور ادھ کھائی روٹیاں بہت پسند تھیں۔ دراصل وہ رزق کی قدردان تھیں، شاہی دسترخوان کی بھوکی نہیں تھیں۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں اس لئے جراثیموں سے ڈرتی نہیں تھی، صرف خدا سے ڈرتی تھیں!

اولاد کے بارے میں میری اماں کا رویہ بالکل دیہاتی ماؤں جیسا تھا۔ وہ جب بھی اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بچوں کی بھلائی سوچتیں۔سب سے پہلے کل دنیا کی خیر مانگتیں۔اس کے بعد دنیا بھر کے بچوں کی اور پھران کے طفیل اپنے بچوں کی صحت وسلامتی اور دین و دنیا میں سرخروئی کی طلبگار ہوتیں۔ میں نے ان کو بڑے بڑے سانحوں اور بڑی بڑی افتاد پر کبھی گھبرائے ہوئے یا بھرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن جب کبھی بدقسمتی سے انہیں پولیس کی وہ وین نظر آجاتی جس میں جیل سے قیدی کچہری لائے جاتے تھے تو ان کا رورو کر برا حال ہو جاتا۔ وہ قیدیوں کو مجرموں یا ملزموں کے بھیس میں نہیں دیکھتی تھیں بلکہ ماؤں کے بیٹوں کے روپ میں دیکھتی تھیں۔ ہاتھ باندھ کر اور چہرہ اوپر اٹھا اٹھا کر ایک ہی التجا کئے جاتیں کہ یا اللہ ان کو معاف کر دے۔ان کو آزاد کر دے۔ان کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملا دے۔اماں کے ساتھ کبھی باہر جاتے ہوئے ایسی وین کا مل جانا ہم سب کے لئے سوہان روح بن جاتا تھا اور ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس وین کو آتے دیکھ کر کسی بغلی گلی یا ملحقہ راستے سے نکل جائیں تا کہ اس پر اماں کی نظر نہ پڑے۔

جب میں ایف اے میں داخل ہوا اور میں نے درسی کتابوں کے علاوہ لائبریری میں دوسری غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اماں میں کم علمی کے باوجود کچھ خوبیاں بھی ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں ،لیکن جب میں ان خوبیوں کو تلاش کرنے بیٹھا تو مجھے وہ تین سے زیادہ نظر نہ آئیں۔اماں کو اپنا آپ ،اپنی خوبیاں ،اپنے کام اور اپنی مہربانیاں چھپانے کا ایسا اچھا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ موہڈی ہو کر بھی بیک گراؤنڈ کے اندر زندگی بسر کرتی تھیں۔ کسی کو پتہ نہ چل جائے ،کوئی جان نہ لے ،کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کام اماں سردار بیگم نے کیا ہے اور اپنی کلا جگانے کے لئے ہے۔ایک مرتبہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی شادی پر تو توجہ کا مرکز ضرور بنی ہوں گی تو انہوں نے کہا: ''میری شادی دراصل میری شادی نہیں تھی ،وہ تاج بی بی تھی۔اس شادی میں میرے گھر والوں نے مجھے بھی بٹھا دیا اور تمہارے ابا سے میرا نکاح ہو گیا۔ اصل میں وہ شادی میری پھوپھی زاد بہن تاج بی بی کی تھی اور چونکہ اصل دلہن وہی تھی ،اس لئے سب کی توجہ اسی پر مرکوز تھی۔ میری شادی تو میری پھوپھی نے میرے والدین سے یہ کہہ کر منتا دی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی کہ سردار بیگم کا پھاہا بھی ساتھ ہی کاٹ دو، پھر کہاں لوگ بار بار آتے پھریں گے!''

جب میں ادیب بن رہا تھا اور بڑی رات گئے گھر آتا تو اماں کو میرے اس دیر سے آنے کی بڑی تشویش تھی۔ جب تک میں نہ آتا وہ چارپائی پر جھوٹ موٹ سوئی ہوئی کچھ پڑھتی رہتیں۔ جب میں آتا تو وہی اٹھ کر دروازہ کھولتیں اور وہی جلدی سے توا ڈال کر میرے لئے گرم گرم روٹی پکاتیں۔ میں نے ٹی ہاؤس سے اور کافی ہاؤس سے بہت کچھ کھایا ہوتا لیکن اماں کی خوشنودی کے لئے مجھے ان کے پاس چوکی پر بیٹھ کر باقاعدہ کھانا پڑتا۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟'' تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں یہ بات اپنی ماں کو کس طرح سمجھاؤں کہ میں ادیب بن رہا ہوں اور ادیب رات کو دیر سے ہی گھر آیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بہت سی کمیوں کو پورا کرنا تھا اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنی تھیں۔ میرے تین افسانے چھپ چکے تھے اور مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کون ہے۔ میں اپنے کالج کی بڑی کلاس میں تھا۔ بڑی عمر کا تھا۔ پختہ کار تھا لیکن مجھے فراق کا ''ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی'' والا شعر نہیں آتا تھا اور اس کے اندرونی مطالب معلوم نہیں تھے۔ ہمارے کالج میں تھرڈ ایر کا ایک لڑکا مظفر علی سید نامی علم کا دریا تھا اور اس کو مشرق و مغرب کے سارے رموز سے گہری آشنا سائی تھی۔ سنگ میل پشاور میں میرا چوتھا افسانہ شائع ہو چکا تھا لیکن مجھے ڈی ایچ لارنس کا علم نہ تھا۔ مظفر علی سید نے مجھے بتایا کہ لارنس کا ایک ناولٹ The man who died پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک نمبر ڈ نسخہ ہے اور پرائیویٹ سرکولیشن کے لئے چھاپا گیا ہے۔

اسی نے مجھے بتایا کہ میرا جی کی نظم ''لب جوئبار'' کا کیا مفہوم ہے اور کیسے تلوار چلی، کیسے زمین کا سینہ...... کا کیا مطلب ہے۔ مظفر علی سید ہی نے مجھے میرا سین سے روشناس کرایا اور بتایا کہ میرا جی ساری عمر اس سے اپنا مدعا بیان نہ کر سکا تھا اور اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بمبئی چلا گیا تھا۔ عین اسی طرح جس طرح جارج مور کے ساتھ ہوا تھا۔ میں جارج مور کے بارے میں الف سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے نہیں جانتا تھا لیکن میں نے اس طرح سر ہلا دیا جیسے میں نے اس کا سارا لکھا ازبر کر رکھا ہو۔

مظفر علی سید نے کہا: ''جارج مور اپنی ایک من پسند خاتون کو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر لمحہ بھی نہیں گزار سکتا، چنانچہ اس نے اپنی محبت کے اظہار کے لئے سڑک کے ایک ایسے موڑ کا انتخاب کیا جہاں اس کی محبوبہ ہر روز سیر کی غرض سے جایا کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مور نے سوچا کہ اس موڑ پر نہ سہی تو اگلے پر میں اس سے ضرور بات کروں گا۔ لپک کر وہاں پہنچا تو اس کی محبوبہ دریا کنارے گل فروش سے ایک گلدستہ خرید رہی تھی۔ سوچا یہ مناسب وقت اور مناسب مقام نہیں، خط لکھنا چاہیے۔ گھر آ کر ایک دردبھرا خط لکھا اور اسے اپنی لینڈ لیڈی کے حوالے کر دیا کہ اسے احتیاط سے پوسٹ کر دینا۔ لینڈ لیڈی ڈاک خانے جا رہی تھی کہ اسے آواز دے کر روکا کہ خط میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔ تبدیلیاں ہو چکی تو سوچا کہ ایسا اہم خط مجھے خود پوسٹ کرنا چاہیے۔ گھر سے نکل کر بڑی سڑک کے ''لال بے'' پر پہنچا تو رک گیا کہ یہ لیٹر بکس ایسا ضروری خط پوسٹ کرنے کے لئے مناسب نہیں، اگلے چوراہے والے بے میں ڈالوں گا جہاں سے دن میں تین مرتبہ ڈاک نکالی جاتی ہے۔ مناسب بے پر پہنچا تو خیال آیا کہ کیوں نہ ایسا اہم خط جی پی او جا کر سپرد ڈاک کیا جائے۔ جی پی او بہت دور تھا۔ معاملہ اگلے دن پر ڈال دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خط جارج مور کی زندگی میں پوسٹ ہی نہ ہو سکا۔ ادھر ادھر ہو گیا۔ حال ہی میں اس کے سوانح نگار نے وہ خط شائع کیا ہے جس میں وہی باتیں ہیں جو میرا جی، میرا سین سے کرنا چاہتا تھا۔

اماں نے دبی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ تو اتنی رات گئے کہاں سے آ رہا ہے؟

میں رات گئے تک ادیبوں اور دانشوروں کی محفل میں رہتا تھا اور ان سے بڑی تیزی کے ساتھ وہ گر سیکھ رہا تھا جن کی بدولت وہ نامی گرامی ادیب و شاعر اور مفکر بن گئے تھے اور لوگ سڑک کے دونوں کنارے منہ میں انگلیاں ڈال کر انہیں دیکھتے تھے۔ منٹو، بمبئی سے لاہور آ کر لکشمی مینشن میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین دونوں بزموں میں افسانے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھتا تھا اور آستین چڑھا کر پڑھتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''خواجہ تم نے جب بھی اپنی کتاب چھاپی میں اس کا فلیپ لکھوں گا۔ تم بڑے ڈرپوک سے افسانے لکھتے ہو، اور چونکہ وہ میرے مزاج کے الٹ ہوتے ہیں اس لئے مجھے بہت پسند ہیں۔''

محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، مولانا اصلاح الدین اور مختار صدیقی میرے پسندیدہ رائٹر تھے اور میں ان سے ایک محتاط حد تک بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ زوبی میرا واحد بے تکلف دوست تھا اور اس نے لارنس باغ کے اوپن ائیر تھیٹر میں اپنا اسٹوڈیو بنا لیا تھا۔ دن کا میرا زیادہ وقت اس اسٹوڈیو میں گزرتا اور راتیں ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس اور مال روڈ کی مٹر گشت کے حوالے ہو جاتیں۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر ہولے سے پوچھا: ''تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟''۔

میں نے قیمہ مٹر لپٹے گرم روٹی کے لقمے کو ہاتھ میں روک کر کہا: ''اماں میں ادیب بن رہا ہوں، دانشور بن رہا ہوں اور چونکہ ادیبوں اور دانشوروں کی راتیں عام طور پر گھروں سے باہر ہی گزرتی ہیں اس لئے میں بھی راتیں باہر گزارنے پر مجبور ہوں''۔

اماں نے حیران ہو کر پوچھا: ''تو ادیب کیوں بننا چاہتا ہے؟''

میں نے کہا: ''میں علم پھیلانا چاہتا ہوں اور لوگوں کو عقل سکھانا چاہتا ہوں۔ میں کتابیں لکھوں گا۔ تصنیف و تالیف کروں گا''۔

''اور یہ جو اتنی ساری کتابیں پہلے لکھ رکھی ہیں؟'' اماں نے پوچھا: ''ان کا کیا بنے گا۔ ان کو کون پڑھے گا؟'' مجھے اپنی ماں کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی اور میں یہ سن کر دنگ رہ گیا کہ میری ماں کو تصنیف و تالیف کے عمل سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ میں نے ہنس کر کہا: ''میری پیاری اماں، اب تک چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ میرے حساب سے وہ اوسط درجے کی تحریریں ہیں، اس لئے میں خود نئی کتابیں لکھ کر زمانے کے سامنے پیش کروں گا اور ان کے علم میں اضافہ کروں گا''۔

اماں کو میری بات ٹھیک سے سمجھ آ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کئے بغیر نئی روٹی بیلتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے پوچھا: ''تو اپنی کتابوں میں کیا پیش کرے گا؟''

میں نے تڑپ کر کہا: ''میں سچ لکھوں گا ماں، اور سچ کا پرچار کروں گا۔ لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں اور سچ سننے سے گھبراتے ہیں۔ میں انہیں سچ سناؤں گا اور سچ کی تلقین کروں گا۔''

میری ماں فکر مندی ہوگئی۔ اس نے بڑی دردمندی سے مجھے غور سے دیکھا اور کوئیلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پروانہ کرتے ہوئے کہا: ''اگر تو نے سچ بولنا ہی ہے تو اپنے بارے میں بولنا۔ دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر ان کی زندگی عذاب میں نہ ڈال دینا۔ ایسا فعل جھوٹ سے بھی برا ہوتا ہے۔''

مجھے اپنی ماں کی سادہ لوحی پر بہت ہنسی آئی لیکن میں اس کے احترام کی وجہ سے ہنسا نہیں۔ آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا اور اس کے روٹی پکانے کی آواز سنتا رہا۔ میری ماں بیچاری یا تو کھانا پکا سکتی تھی یا گھر کے دوسرے کام کر سکتی تھی۔ اس میں باریک باتوں کی سمجھ مطلق نہیں تھی!

اصل میں اماں دماغ کے بجائے دل کو سوچ کا مرکز سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جو بھی بات، جو بھی سوچ یا تصور کی جو بھی لہر پیدا ہوتی ہے وہ انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے دل ہی عقل اور فکر کا منبع ہے۔ دماغ کو وہ سر کے اندر استر کے طور پر خیال کرتی تھیں تاکہ اس پر مضبوطی سے پگڑی باندھی جا سکے یا برقعے کی ٹوپی فٹ کی جا سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے جو تدبر اور تفکر کا حکم دیا ہے تو دل کے تفکر اور تدبر کے لئے دیا ہے، کیونکہ دماغ سے تو ایسی باتیں سوچی ہی نہیں جا سکتیں جن کا تعلق روح سے اور اللہ کے احکام سے ہوتا ہے۔

مجھ سے بڑے بھائی اسحاق نے اور ہمارے سب سے بڑے آفتاب بھائی جان نے اماں کے ساتھ اس معاملے پر تفصیل سے بحث کی اور انہیں ہر چند قائل کرنے کی کوشش کی کہ سوچنے اور غور کرنے کا کام صرف دماغ کرتا ہے اور انسان کی ساری یادیں اور یادداشتیں اس کے دماغ میں محفوظ ہوتی ہیں جن کا کارڈ نکال نکال کر وہ نئے تجربات اور نئے مشاہدات کے ساتھ ملاتا ہے اور ان میں اصلاح و تطبیق کرتا رہتا ہے۔ لیکن اماں، جو کبھی بھی ایسے مباحثے میں دخل نہیں دیا کرتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھیں، اپنی بات پر اڑی رہیں اور دل ہی کو فکر اور خیال کا ہیڈ کوارٹر سمجھتی رہیں۔ بلکہ اس گفتگو میں انہوں نے ایک اور عجیب بات کی جس پر ہم دل کھول کر ہنسے اور ''اماں پیاری زندہ باد'' اور ''اماں اماں ہپ ہپ ہرے'' کے نعرے مارتے رہے۔

میری بڑی خالہ جو مزاروں، مجاوروں اور دھمالوں، قوالیوں کی رسیا تھیں، ایک مرتبہ اماں کو اپنے پسندیدہ قوال عظیم پریم راگی کا گانا سنوانے لے گئیں۔ اماں، عظیم پریم راگی کی شکل و صورت، اس کے بھیس لباس اور پوشش پیرہن سے اتنی متاثر ہوئیں کہ دیر تک بت بنی فن اور فنکار کی بولتی فلم اپنے قلب ونظر پر اتارتی رہیں۔ جب لوٹ کے گھر آئیں اور ہم نے ان سے ان کے نئے تجربے کی بابت پوچھا تو انہوں نے کوئی شافی جواب نہ دیا، بس غوں غاں سا کر کے رہ گئیں۔ لیکن جس روز اسحاق بھائی اور آفتاب بھائی جان نے ان سے دل اور دماغ کے بنیادی فرق پر سیر حاصل گفتگو کی تو انہوں نے اپنے مشاہداتی علم پر پوری ٹیک لگا کر بڑی یقین کے ساتھ کہا: ''آفتاب میاں! یادداشت خالی دماغ میں ہی نہیں ہوتی بلکہ بدن کے ہر اس انگ میں ہوتی ہے جو کسی خاص فعل کی مسلسل پرورش کرتا ہے اور اس فعل کو محبوب جانتا ہے۔'' بھائی جان نے بڑی حیرانی کے ساتھ اپنی روشن روشن آنکھیں عینک کے پیچھے گھما کر اسحاق بھائی کو دیکھا اور بڑی مرعوبیت کے ساتھ کہا: ''اماں یہ آپ نے کیا بات کر دی۔ اسے ایک مرتبہ پھر تو دہرائیں۔ آپ سے تو ایک بڑا خیال سرزد ہو گیا ہے۔''

اماں نے شرمندگی کے ساتھ ہولے سے نفی میں اپنا سر ہلایا تو اسحاق بھائی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا: ''بتائیں، بتائیں اماں۔ گھبرائیں نہیں، آپ کے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟'' تو اماں نے حوصلہ پا کر کہا: ''جب عظیم پریم راگی باجہ بجا رہا تھا تو اس ک انگلیاں کالے اور سفید سروں پر جگہ دیکھے بغیر، رکے بغیر اور صحیح چابی کو پہچانے بغیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ان ساری سروں کی یادداشت ان کی مہارنی، ان کا حافظہ راگی کی انگلیوں میں تھا، اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اور جب عظیم پریم راگی گا رہا تھا اور تان پلٹے لے رہا تھا تو سارا گیت اور اس کے سارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بول اس کے حلق کے حافظے سے برآمد ہو رہے تھے، اس کے دماغ سے نہیں۔ ہم نے اس وقت تو تالی بجا کر اور ''تھری چیرز فار ماما'' کر کے اماں کو ان کی تحقیق پر شرمندہ کر دیا۔ لیکن آج میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مغربی ممالک میں میموری کے ڈسپلن پر جو ریسرچ ہو رہی ہے اگر کسی نے یہی بات سلیقے کے ساتھ کسی ولایتی زبان میں کھول کر بیان کر دی تو سائنسی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔

ان ساری باتوں کے باوجود میری اماں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اس پر باقاعدہ ایک مضمون لکھا جا سکے یا اس کو دنیا کی ان ماؤں کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے جنہوں نے اپنی زندگیوں میں عظیم کارنامے سرانجام دیے اور اپنی زندگیاں انسانیت کے عظمت عطا کرنے کے لئے وقف کر دیں...... میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جو گارڈ کی جھڑکی سے ڈر کر سامنے کے لبالب ڈبے میں گھس جایا کرتی ہیں اور زندگی کے کمپارٹمنٹ میں مناسب جگہ نہ پا کر گاڑی کے فرش پر ہی بیٹھ جایا کرتی ہیں، وہ بھی ایسی جگہ پر جہاں غسل خانے میں جانے والی ہر بی بی کے لئے انہیں بار بار اٹھنا پڑتا ہے اور اس وقت تک کھڑے رہنا پڑتا ہے جب تک بی بی واپس آ کر اپنی سیٹ پر نہ بیٹھ جائے۔ میری اماں ان عورتوں میں سے تھی جو دن بھر گھاس کھود کر شام کو گوالمنڈی میں کسی اہل کار کی ڈانٹ سہہ کر اور اپنا سارا پولا اسے دے کر خالی ہاتھ گھر واپس آ جایا کرتی ہیں اور پھر خالی ہاتھ گھر والوں کے طعنے الہنے بھی برداشت کرتی ہیں۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جو گھر سے ملکہ بننے کے لئے نکلتی ہیں اور رسم تاجپوشی ادا ہو چکنے کے بعد اپنے محل میں ٹاکی مارتی ہوئی عورت کے ہاتھ سے ٹاکی لے کر خود بھی اس کے ساتھ شامل ہو جایا کرتی ہیں۔ اب ایسی عورتوں پر نہ تو ماضی میں کبھی مضمون لکھے گئے اور نہ آئندہ لکھے جانے کی توقع ہے۔ ایسی عورتیں تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتی ہیں کہ اس کے لمس سے ٹھنڈک کا احساس تو ہوتا ہے مگر خود کہیں نظر نہیں آتا!

میری ماں جو اپنے چچاؤں کی بے حد لاڈلی بھتیجی اور اپنے خاندان کی پہلوٹی کی اولاد ہونے کے رشتے سب کی آنکھ کا تارا تھیں، بہ اختیار خود اور حسب دلخواہ اپنی برتری کو سستے داموں بیچ کر ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھاڑ وٹو کرنے والیوں کے گروہ میں شامل ہوگئی تھیں جن کا اول و آخر، ظاہر و باطن، ملجا و ماویٰ، رنج و غم اور سود و زیاں صرف ان کے بچے ہوتے ہیں۔ اگر میری ماں کے بچے نہ ہوتے تو وہ خود بھی نہ ہوتیں، ادھر کا رخ بھی نہ کرتیں اور زندگی کے اس طول بلد سے تعلق ہی نہ رکھتیں۔ وہ اپنے بچوں کی تخلیق اور انہی کا حوالہ تھیں۔ ان کا صرف ایک ہی فریم ورک تھا: بچے! اور ان کے بچوں کا ایک ہی مقصد تھا خدمت، حضوری، سروس اور بندگی کی طلب گاری۔ جس طرح ہر سمجھ دار بچہ اپنی ماں کو اپنی بچہ شدگی کا تحفہ اور تسلی دے کر اس سے فل سروس لیتا ہے، اسی طرح ہم سب بہن بھائی اپنے ''اولاد پنے'' کا لیٹر آف کریڈٹ کھول کر اماں سے ہر شے درآمد کر لیتے تھے۔ وہ خوشی سے اپنا سب کچھ سپلائی کیے جا رہی تھیں، اپنا سب کچھ نچھاور کیے جاتی تھیں، اور ہم دونوں ہاتھوں سے ہر شے ہنسی خوشی سمیٹے جا رہے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میرے بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو میری ماں دادی بن جانے کے بعد اپنے بیٹوں پوتوں، نواسے، نواسیوں اور بہوؤں کے درمیان کافی مقبول ہوگئی تھیں۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ بے تکلفی کے مظاہرے کر لیتے تھے اور وہ بھی اکثر اوقات بلا جھجک ہماری باتوں کا جواب دے دیا کرتی تھیں۔ لیکن انہی ایام میں بدقسمتی سے ایک موقع ایسا بھی آیا جب اماں ہم سب کی زندگیوں سے مکمل طور پر خارج ہوگئیں۔ ہم نے ان کے احترام میں تو کوئی کمی واقع نہ ہونے دی البتہ ان کے ذہنی طور پر ماؤف ہو جانے کی وجہ سے ان سے بصد ادب قطع تعلق کر لی اور وہ پھر سے گھر میں بالکل اکیلی ہوگئیں۔ میں نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اور درگزر کرنے والے ایک نئے صوفی کی طرح ان سے تھوڑا بہت رابطہ ضرور رکھا لیکن اس رابطے میں پرانی بے تکلفی کو کوئی جگہ نہ دی۔

جس طرح گبن نے رومن ایمپائر کے زوال کے اسباب بڑی وضاحت سے بیان کیے ہیں اور سلطنت مغلیہ کے زوال پر جادو ناتھ سرکار نے روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح اپنی ماں کے زوال پر میری بھی گہری نظر ہے۔ اس کے زوال کی بہت سی وجوہات نہیں بلکہ سارے زوال کا ایک ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باعث ہے۔اس ایک باعث نے ہماری ماں کو جیتے جی ہم سے علیحدہ کر دیا اور ہم نے اختیاری طور پر اس سے اجتناب برتنا شروع کر دیا۔ہم ان کے ادب اور احترام میں کسی کمی کے روادار نہیں تھے لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے بچوں پر اور ہماری آیندہ نسلوں پر ان کی سوچ کا، ان کے رویے کا اور ان کی وضع کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ اماں کی طرز فکر کی پر چھائیں ہماری اولاد پر ضرور پڑیں گی اور وہ اپنی ناروا تاثیر سے ہمارے بچوں کو رجعت پسندی کی طرف ضرور مائل کر دیں گی۔اس خوف کے پیش نظر ہم سب نے اپنے روابط ان سے تقریباً تقریباً ختم کر لئے اور ان کو آسودگی کے ساتھ اکیلے زندگی بسر کرنے پر مائل کر دیا۔

ہوا یہ کہ ایک دن پشاور کے بڈبیر ہوائی اڈے سے ایک امریکی یوٹو طیارہ اونچی پرواز پر اڑا اور اس نے روس کی سرحدوں میں داخل ہو کر فوجی ٹھکانوں کے بہت ہی حساس قسم کے فوٹو اتار لئے۔روس کے ریڈاروں نے چیخ چیخ کر یہ خبر روسی کنٹرول روموں میں نشر کی لیکن جب تک روس کے مدافعتی لڑاکا طیارے اپنی فضاؤں میں بلند ہوتے، امریکی یوٹو جہاز اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس پشاور پہنچ گیا تھا اور تیز نظر کیمروں سے اتاری ہوئی تصویریں پراسس ہونے کے لئے لیبارٹری بھیجی جا چکی تھیں...... روس نے اپنے سارے ریڈیو سٹیشنوں کے دہانے کھول کر پوری دنیا میں یہ بات الم نشرح کر دی کہ چونکہ یہ جہاز پشاور کے امریکی اڈے سے اڑا تھا اس لئے ہم نے اپنے ہر نقشے میں پشاور کے گرد ایک سرخ دائرہ ڈال دیا ہے اور اپنے ہوابازوں کو اس شہر کے طول بلد اور عرض بلد کی جزئیات فراہم کر کے حکم دے دیا ہے کہ اب شہر پشاور کو دنیا کے نقشے سے اور کرہ ارض کے سینے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست نابود کر دیا جائے۔اس شہر کو تباہ کرنے کی تاریخ اور وقت سے ہم جلد ہی دنیا کو آگاہ کر دیں گے۔

جب روس کا یہ اعلان دنیا کے اخباروں میں چھپا تو ہم سب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔روس ایسا ملک نہیں تھا جسے پاؤں پڑ کر منایا جا سکے اور معافی مانگی جا سکے۔پھر ہم سے غلطی بھی اتنے بڑے سٹینڈرڈ کی ہوئی تھی کہ اگر روس کی جگہ کوئی ملک بھی ہوتا تو ہمیں کوشش کے باوجود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاف نہ کر سکتا۔

آکاش وانی نے اس خبر کو لون مرچ لگا کر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں نشر کرنا شروع کر دیا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد بھارت کے دانشوروں کا ایک پینل اپنے ریڈیو پر جمع ہوتا اور اس واقعے کے آئندہ اثرات سے دنیا کو مطلع کرتا۔ پاکستان میں بھی اس حماقت پر شدت کا ردعمل ہوا اور لوگوں نے بیک آواز پشاور سے امریکی اڈے اٹھانے اور امریکی بیس کو بند کرانے کے لئے احتجاج شروع کر دیا۔ اس وقت پاکستان میں شاید ہی کوئی گھر ہو جس میں اس خبر کا اور بعد ازاں اس واقعے کے متوقع ردعمل کا ذکر نہ چلتا ہو۔ اور لوگوں کی طرح اس معاملے میں ہمارا گھرانہ بھی بہت پریشان تھا۔ ہم سب بہن بھائی خوف اور رنج و غم کی اندھی غار میں اتر کر اپنی حکومت کا سیاپا کیا کرتے اور اپنے سربراہوں پر لعنت بھیجا کرتے۔ بھائی جان کو اپنے غیور پٹھانوں کے مرکزی شہر کا آن واحد میں مٹ جانا تاریخ کا سب سے بڑا المیہ نظر آتا تھا۔ میرا ماماز اد بھائی مجید خان، جو میرے بچپن کا یار تھا حال ہی میں صوبہ سرحد کے محکمہ جنگلات میں آفیسر لگا تھا، اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ میری ماں نے اس کی دلہن کے لئے اعلیٰ درجے کے جوڑے تیار کرائے تھے۔ اباجی نے اسکی شادی کے اخراجات کا ایک بینک ڈرافٹ بنوا کر اسے بھجوایا تھا لیکن اب دیکھتے دیکھتے سارا معاملہ الٹ گیا تھا۔ جب پشاور ہی ختم ہو رہا تھا تو بھائی مجید خان کی شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ جب ان کا اور ان کی دلہن کا وجود بھی ختم ہو رہا تھا تو پھر جوڑے سلوانے اور ڈرافٹ بھجوانے کا فائدہ! میری بڑی آپا کو پشاور کے تباہ ہونے کا سب سے زیادہ رنج تھا۔ وہ باڑے سے ہر سال چھ بڑے پیکر سوپ اور تین سٹل مینز کریم کی ڈبیاں منگوایا کرتی تھیں۔ یہ سامان چونکہ چچا عبدالغنی خان کی معرفت پشاور سے آتا تھا اور اب پشاور کے گرد سرخ نشان لگ چکا تھا اس لئے آپا کی سپلائی بھی بند ہو گئی تھی۔ اتوار کے روز چھٹی کے دن جب ہم سب بہن بھائی اپنی حکومت، اپنے ملک اور اپنے بڑوں پر خوب تبرا بھیج رہے تھے اور پشاور کے ختم ہو جانے پر پیشگی مرثیہ پڑھ رہے تھے تو اماں کو یہ بات بہت ہی بری معلوم ہوئی۔ اس نے عین ہمارے سامنے، یقین کی صورت ایستادہ ہو کر، پہلی مرتبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سخت لہجے میں کہا: ''یہ تم کیا ہر وقت پشاور کے بارے میں منحوس باتیں کرتے رہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی'' تو افتخا بھائی نے فضا میں کھلے ہاتھ کی ڈگڈگی بجا کر کہا: ''بگدو بول گیا ہے اماں''۔ ''اب روس پنجابے آوے گا تے سستی کنک وکاوے گا'' اماں نے غصے میں آ کر کہا: ''لعنت ہو تم پر اور تمہارے روس پر......اور ساری دنیا کے کافروں پر۔''

''خبردار اماں'' افتخار بھائی بپھر گئے ''اگر تم نے روس کے خلاف کچھ کہا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا''۔

بڑی آپا نے افتخار بھائی کے لہجے پر ان کی سرزنش کی اور ہم سب نے آپا کا ساتھ دیا۔ بھائی جان نے اماں کو سمجھایا کہ اماں روس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، وہ جب چاہے کسی بھی ملک پر بمباری کر کے اسے تباہ کر سکتا ہے۔ پاکستان تو اس کے لئے ایک معمولی سی بستی ہے۔ بڑی آپا نے کہا: ''اماں جی روس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ پشاور کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''وہ اس پر بمبارمنٹ کرے گا'' اقبال بھائی نے کہا: ''اور اسے سطح زمین کے ساتھ ملا دے گا۔''

''روس کو بمبارمنٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں'' اسحاق بھائی نے بتایا ''روس تو گھر بیٹھے بیٹھے جس شہر کو چاہے تاخت و تاراج کر سکتا ہے۔ اس کے پاس سائنس کی ایسی کلا منتر ہے کہ وہ ہوائی جہاز بھیجے بغیر جس وکٹ کو چاہے اس کی کلی اڑا سکتا ہے۔''

چھوٹی آپا نے ڈر کر کہا کہ اگر پشاور کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو کل لاہور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔

اقبال بھائی نے بڑی رنجوری میں سر ہلا کر کہا: ''افسوس! ابھی کل کی بات ہے پشاور سے کیا اعلیٰ درجے کا خشک میوہ آیا کرتا تھا، اور اب کچھ بھی نہیں۔''

اماں کو غصہ آ گیا۔ اس نے چارپائی کے پائے پر اپنا پاؤں جما کر کہا: ''میرے ڈرپوک اور خوفزدہ بچو، تم کو کیا ہو گیا ہے اور تم کن اونچائیوں سے کیسی گھاٹیوں میں اتر گئے ہو کہ تمہیں اللہ پر کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یقین ہی نہیں رہا۔''

''اللہ پر تو ہمیں پورا یقین ہے اماں'' آپا نے گرہ لگائی ''لیکن ہم سامنے کی صورت حال پر آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہمیں اللہ نے سوچنے سمجھنے کی بھی تو صلاحیت دی ہے۔''

اماں نے کڑک کر کہا: ''یہ تم کب سے صورت حالات کے نجومی بن گئے ہو جو گھر بیٹھے مستقبل کے فتوے جاری کر رہے ہو۔ کیا پتہ کل کو پشاور تو رہ جائے مگر تمہارا روس باقی نہ رہے اور وہ کسی بمباری کے بغیر ہی ختم ہو جائے۔''

اماں کا یہ کہنا تھا کہ ہم بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا اور بغیر کسی لحاظ کے، ادب کی ساری حدوں کو کراس کر کے کہا، آفتاب بھائی، جنہوں نے اماں کے سامنے کبھی اونچی سانس تک نہ لی تھی انہوں نے بھی زچ ہو کر کہا: ''اماں جس بات کا علم نہ ہو اس میں ٹیکڑ نہ مارا کریں۔''

یہ دن اماں کی سلطنت میں ان کے زوال کا پہلا دن تھا اور یہ فقرہ کہ ''کیا پتہ پشاور رہ جائے اور روس نہ رہے'' ان کے تنزل اور انحطاط کا پہلا اور آخری سبب تھا۔

میں ابا جی کے ساتھ والے کمرے میں کوئی پرانی سرنج تلاش کر رہا تھا اور کسی کو علم نہ تھا کہ میں اس ساتھ والی کوٹھڑی میں ہوں کہ میری اماں کی پیشی ہو گئی۔ جو بیان حلفی انہوں نے اپنے خاوند کے روبرو دیا میں اس کا سمعی شاہد ہوں۔

ابا جی نے پوچھا: ''کیا یہ بات سچ ہے سردار بیگم کہ تو نے بچوں سے یہ کہا کہ کیا پتہ پشاور رہ جائے اور روس نہ رہے، اماں نے کہا: ''جی ڈاکٹر صاحب یہ سچ ہے۔ میں نے بالکل یہ کہا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ابا جان نے قدرے تلخ آواز میں پوچھا'' روس جیسا عظیم الشان، طاقتور اور ترقی یافتہ ملک جا سکتا ہے اور پشاور جیسا کمزور، پس ماندہ اور رجعت پسند شہر باقی رہ سکتا ہے۔''

''میں نے یقین سے تو نہیں کہا ڈاکٹر صاحب!'' اماں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ''لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ کے نزدیک کیا مشکل ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

ابا جی نے قدرے غصے میں آ کر تھوڑی سی گرجدار آواز میں کہا: ''اللہ ہمارے جیسا بے اصولا نہیں۔ اس کے کچھ اصول ہیں، ضابطے ہیں، دستور ہیں اور وہ ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کا ایک سسٹم ہے اور وہ اپنے سسٹم سے باہر نہیں جاتا۔ وہ اپنے اصول پر اور اپنے سسٹم پر ہر گھڑی قائم رہتا ہے۔''

اماں کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں پھر جرات کر کے بولیں: ''میں تو یہی سمجھتی ہوں، ڈاکٹر صاحب کہ اللہ قادر مطلق ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔''

ابا جی نے انہیں سمجھانے کے انداز میں قدرے نرمی کے ساتھ کہا: ''دیکھو سردار بیگم جب تک اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، اس کے لئے تدبر اور تفکر نہیں کیا جائے گا، اس کے لئے فہم پیدا نہیں کی جائے گی۔ اس وقت تک ایسی ہی فرسودہ اور روایتی سوچ چلتی رہے گی جیسی تمہاری ہے۔''

اماں نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب! اگر اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے اور اسے صرف مانا جائے تو وہ جلدی سمجھ میں آ جاتا ہے بلکہ......''

اماں کی بات ابا جی کو ناگوار گزری اور انہوں نے دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہا: ''دیکھو سردار بیگم! اس گھر میں ایک ہی حکم چلے گا اور ایک ہی فیصلہ صادر ہوگا کہ آپ کو بچوں سے معافی مانگنی پڑے گی اور اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔''

اماں نے ہنس کر کہا: ''ڈاکٹر صاحب! میں تو انسانوں کی صف کا سب سے کمزور اور بودا شخص ہوں اور مجھے اپنی بات منوانے کی کوئی ضد نہیں ہے۔ یہ بچے تو میرے اپنے ہیں۔ میں تو سارے جہان کے بچوں سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں لیکن مجھ سے اپنے الفاظ واپس نہیں لئے جا سکیں گے۔''

''تو پھر اس گھر میں آپ کا رہنا مشکل ہوگا'' ابا جی نے سنجیدگی سے کہا اور اماں ان کی بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا جواب دیے بغیر باہر آ گئیں۔

اماں نے اپنے بچوں کی خاطر، اپنے گھر کی خوشیوں کے لئے اور اپنی اولاد کے کارن سب سے معافی مانگ لی اور ہر طرح کی معافی مانگ لی۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ بھی واپس لے لئے اور کبھی نہ کہے اور کبھی نہ سوچے ہوئے الفاظ بھی واپس لے لئے۔ ہم نے بھی انہیں معذور اور کم علم جان کر تہہ دل سے معاف کر دیا۔

اماں ذہین تو بہت تھیں لیکن ان میں تعلیم کی کمی تھی۔ انہوں نے پڑھائی شروع تو کی لیکن اسے پورا نہ کر سکیں۔ پھر اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کے باقاعدہ مدرسے بھی نہیں تھے اور لڑکیوں کو تعلیم دینا یوں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر اماں ہماری طرح سے تعلیم یافتہ ہوتیں اور ان کی حالات حاضرہ پر باقاعدہ نظر ہوتی تو وہ ایسا فقرہ کبھی نہ کہتیں جو ان کے زوال کا باعث بنا اور جس نے ان کو ہماری زندگیوں سے بہت ہی دور کر دیا۔

اس واقعے کے دس بارہ سال بعد تک اماں زندہ رہیں لیکن اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی آڑ میں۔ انہوں نے جیتے جی اپنے وجود سے اور اپنی ہویت سے پورے طور پر کنارہ کشی کر لی تھی۔ گھر میں ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر سا تھا۔ کبھی کسی کو ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہوتی بھی تو وہ ہونے نہیں دیتی تھیں۔ کسی پر اماں کا بدنی، روحی، شخصی یا نفسی کسی بھی قسم کا بوجھ باقی نہیں رہا تھا۔ اور جس دن وہ گئی ہیں تو اس روز بھی کسی کو اطلاع دیے بغیر رخصت ہو گئیں۔

ملازمہ نے صبح جا کر جس انہیں جگایا کہ آئیں آ کر چائے پی لیں تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔

اماں کو ہم سب بھائیوں نے اشکبار آنکھوں سے میانی صاحب کی اس سائڈ پر دفن کیا جدھر آگے علم الدین شہید کا مزار ہے۔ ان کی قبر سے تھوڑی دور پرے بیری کا ایک پرانا درخت ہے۔ قریب ہی ایک طرف لوکوشیڈ کے مستری علی محمد کا مزار ہے اور اس کے ساتھ ہاجرہ بی بی کی قبر ہے جس کے لوح مزار پر اس کے تینوں بیٹوں نے اپنے نام بھی لکھوائے ہیں: والدہ شفیع والدہ چراغ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور والدہ شمس، یہیں ہم نے اپنی پیاری اماں کو دفن کر کے ان پر پھولوں کی پانچ چادریں اوپر تلے چڑھائیں۔ شام کے وقت ہم خواتین خانہ کو ان کی قبر دکھانے لے گئے۔ میری دونوں آپائیں، دونوں خالائیں، باجی ضیا، باجی منیر اور میری سب سے چھوٹی بھابھی منزہ کے قافلے میں اماں جیو، ماسی پھجاں، جیونی بہن اور آنٹی صغریٰ بھی شامل تھیں۔ سب نے وہاں جا کر فاتحہ پڑھی اور اپنے اپنے انداز میں اماں کو بہت یاد کیا۔ بڑی آپا کو ان کی آخری آرام گاہ بہت ہی پسند آئی۔ ملازم خواتین نے بیری کی قربت کو نہایت پاکیزہ خیال کیا اور چھوٹی آپا نے کہا: ''چونکہ ہم شریعت کے مطابق اپنی ماں کی قبر کچی رکھیں گے اس لئے ساتھ کی قبروں کے کتبے ہمارے لئے پکی نشانیوں کا کام دیتے رہیں گے''۔ میری چھوٹی خالہ رشیدہ اپنی بہن کو یاد کر کے بہت رو رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔

کوئی ایک سال بعد جب ہم شب برات پر اماں کی قبر پر پھول چڑھانے اور فاتحہ کے لئے گئے تو پھولوں کی ٹوکری، گلاب کی بوتل اور اگربتیوں کے پیکٹ ہمارے ہاتھ میں ویسے کے ویسے رہ گئے۔ وہاں اماں کی قبر ہی موجود نہ تھی! ہم نے ادھر ادھر اسے لاکھ ڈھونڈا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بیری کے حوالے سے اور کتبوں والی قبروں کے فاصلے ناپ کر ہم نے اماں کی قبر کے آثار معلوم کرنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پرانی قبروں کا بلاک جوں کا توں موجود تھا۔ جہاں نشیب تھا وہاں نشیب تھا۔ نشیب کے اندر دو تین جھاڑیاں تھیں۔ وہ اپنی جگہ موجود تھیں۔ ایک پرانی قبر کا تعویز بیٹھ گیا تھا وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے بیری اسی طرح جھکی ہوئی تھی اور اس کے دو ڈالے اور سوکھ گئے تھے۔ لیکن جہاں اماں کی قبر ہونی چاہیے تھی وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس خالی زمین تھی۔ اتنی زمین کہ اس میں آسانی سے ایک قبر کھودی جاسکے۔ لیکن وہ قبر جو ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے وہ کہاں گئی!

فاروق نے کہا: ''چچا جان یہ وہ جگہ ہی نہیں۔ دادی ماں کی قبر اس سے ذرا فاصلے پر تھی۔ رضا نے کہا: ''میں نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں لحد میں اتارا تھا تو اپنا تولیہ اس بیری پر ٹانگ دیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کو یہاں ہونا چاہیے یہیں، اس جگہ۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ منزہ ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی: ''یہی تو ہے ان کی قبر۔ آپ کو یاد نہیں ہم نے شام کے وقت اس پر اگر بتیاں گاڑی تھیں تو ایک ایک بتی ان کی پڑوسی قبروں پر بھی گاڑ دی تھی۔ یہ وہی قبریں ہیں صاف، ان کی پڑوسی قبریں اور یہ ہے ساتھ اماں جی کی قبر!'' اقبال بھائی نے کہا: ''اماں جی کی قبر بیری کی سیدھ میں دائیں ہاتھ تھی اور یہ قبریں بائیں ہاتھ ہیں۔ ان کا تو جغرافیہ ہی دوسرا ہے۔'' کافی دیر تک ہم اماں کی قبر تلاش کرتے رہے افسوس کرتے رہے کہ اگر ہم نے ایک معمولی سا کتبہ بھی ادھر گاڑ دیا ہوتا تو ہم کو یہ الجھن نہ ہوتی۔ اگر بتیاں اور عرق گلاب اسی طرح واپس لے کر اور پھولوں کی پتیاں پانچ چھ دوسری قبروں پر ڈال کر ہم ناکام و نامراد واپس گھر آ گئے۔

اگلے دن ہم نے بھائی شفیع اور ان کی معرفت منگوائے ہوئے پرانے گورکنوں کو ساتھ لے کر ایک سروے ٹیم تیار کی۔ اس میں وہ مولوی صاحب بھی شامل کیے جنھوں نے مٹی دینے کے بعد وہاں قرآن خوانی کی تھی۔ سب کو اماں کے دفنانے کا وقت یاد تھا۔ دن مہینہ اور موسم یاد تھا۔ ان قبروں کا نقشہ یاد تھا جن کے ساتھ اماں کو دفنایا گیا تھا، مگر اس وقت سارے کے سارے اماں کی قبر شناخت کرنے سے قاصر تھے۔ مولوی صاحب نے کہا: ''میری عمر باسٹھ سال ہے اور میں سینکڑوں میتیں دفنا چکا ہوں لیکن ایسا واقعہ میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا، یہ تو حد ہی ہو گئی۔''

اماں کی قبر کے بارے میں سب کا اپنا خیال اور اپنا اپنا گمان ہے لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا صحیح سوچ رہا ہے۔ لیکن میں جو کسی حد تک ان کے مزاج سے واقف اور ان کی نفسیات کا آشنا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی قبر اٹھا کر کہیں اور لے گئی ہیں۔ اصل میں میری ماں کے زمانے کی عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تو غائب غلہ ہو جاتی تھی۔ وہ خودنمائی اور خودستائی کے فن سے ناآشنا تھی۔ اس کو مکٹ سجا کے، پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کاجل لگا کے مہمان خصوصی بننے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ تعریف و توصیف کے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی اور ایسے اوہلے میں چھپ جاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی کہ مدتوں اس کا کوئی آثار نہیں ملتا تھا۔ وہ اپنی ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھتی تھی اور غائب سے غائب تر ہوتی رہتی تھی۔ تخلیق تو کرتی تھی کہ وہی یہ کام کر سکتی تھی لیکن اپنی تخلیق کے چوکھٹے کے اندر کسی کارنر میں اپنا نام اور تاریخ نہیں لکھتی تھی۔ بس اس کا روپ پری کا سا تھا۔ باغ لگا کر، پھول کھلا کر، تخت بچھا کر، راہ سجا کر خود غائب ہو جاتی تھی کہ کسی کو شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرنی پڑے۔ کسی کو تکلیف نہ ہو، الجھن نہ ہو، انتظار نہ کرنا پڑے......

اماں کو معلوم تھا کہ دن تہوار پر، عید، شب برات پر بچے کسی نہ کسی مجبوری کے تحت میری قبر پر ضرور آئیں گے۔ اور پورے اترنے کی کوشش کریں گے۔ وہ معروف لوگ ہیں۔ ان کے کئی بکھیڑے اور بے شمار مشغولے ہیں۔ آئیں گے تو تکلیف ہوگی۔ زحمت کریں گے۔ وقت نکالیں گے۔ انتظار کھینچیں گے۔ مشکل ہوگی۔ کیوں نہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ اماں نے ہم کو پہلے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

دنیا کے عظیم مصنفوں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنی ماؤں پر ایسے پر لطف، خیال انگیز اور گراں بہا مضمون لکھے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ میری بھی بڑی دیر کی خواہش تھی کہ میں بھی اپنی اماں کی زندگی کے بارے میں کچھ کہوں، کچھ لکھوں، کچھ بتاؤں مگر میری والدہ میں میرے حساب سے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی بدولت ان پر کوئی مضمون لکھا جا سکے یا ان کے سوانح حیات کا زبانی ذکر کیا جا سکے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی، گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی چلتی ادھر سے ادھر پہنچ گئیں اور چلتے چلتے ساتھ ساتھ اپنے نقوش پا بھی مٹاتی گئیں۔ ایسے شخص پر کوئی کیا لکھے جو اپنے جانے کے بعد ذرا سا خلا بھی نہ چھوڑ سکے!

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بوٹی کھاساں

طنزومزاح کی سلطنت کے شہنشاہ سید ضمیر جعفری کا نام اُردو ادب میں لافانی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاح کے علاوہ انہوں نے غزلیں، نظمیں اور گیت بھی لکھے۔ جبکہ 50 سے زائد کتب تصنیف کیں۔ خاکہ نگاری اور کالم نگاری میں بھی اُن کا اپنا ایک مقام تھا۔ ان کی نثر میں جو روانی اور شگفتگی ہے وہ پڑھنے والے کو اپنے سحر میں قید رکھتی ہے۔ سید ضمیر جعفری نے فوج میں رہتے ہوئے حکومتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ فوج میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ 1999 میں طویل علالت کے باعث انتقال کر گئے انہوں نے جو کچھ لکھا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ سید ضمیر جعفری نے اپنی والدہ محترمہ کے بے ساختہ تذکرے میں قلم کی جولانی کے جو جوہر دکھائے ہیں اس سے طبیعت خوش تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

••••••••••••••••••••••••••••

ہماری آنکھ آیاؤں کی گود میں نہیں کھلی، ماں کی گود اور ماں کی کمک پر محبت میں اُمڈی ہوئی ماسیوں، چاچیوں، پھوپھیوں اور رشتے کی بڑی بہنوں کی گود میں کھلی۔ یوں بھی بے جی (والدہ محترمہ) کے پاس عورتوں کا گزری میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کچھ تو برادری کی معاصر خواتین ہوتیں جو ایک دوسرے کے گھروں میں باقاعدہ آتی جاتی رہتی تھیں کہ اپنی گائے بھینس کے تذکرے میں اپنی بہو کی بات ملا کر چلم کا تمبا کو اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں، لیکن بڑی تعداد آس پاس کے دیہات کی چرواہوں کی ہوتی جو اپنے ڈھور ڈنگروں کو ہانکتی پھراتی ہمارے گاؤں کے رقبوں میں لے آتیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور پھر کچھ دیر سستانے، لسی پانی پینے، یا یونہی گپ شپ لڑانے کے لئے بستی میں اپنی اپنی ''سیدھ'' (جان پہچان) کے گھروں میں پھیل جاتیں۔ یہ ایک جملہ کہ ''بیوی جی'' دو گھٹ لسی تے پلاؤ'' ہر گھر میں داخلے کا پاسپورٹ تھا۔ گھر گھر گائے بھینسیں، گھر گھر دودھ لسی کی سبیل جو آئے بسم اللہ کا پیالہ پیئے یا دوری...... (بڑا پیالہ)۔ ہمارا مکان ایک تو گاؤں سے باہر اس طور واقع تھا کہ اگر بیرونی دیواریں مضبوط نہ ہوتیں تو کھیتوں کی فصلیں ہمارے صحن میں آکر لہلہانے لگتیں۔ پھر اس کے ساتھ کنواں بھی، پھر ملحق ایک کھلا میدان جس کو ہم ''کھلا'' کہتے ہیں (شاید کھلیان سے) بہر حال ہمارے گھر میں ان سادہ روزگار اور سخت معاش چرواہوں کی ریل پیل کچھ زیادہ ہی لگی رہتی۔

ہمارے گاؤں میں رئیس کوئی بھی نہ تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے بارانی رقبوں کے مالک زراعت ورثہ، مگر ملازمت پیشہ اہل کاروں کی بستی ہے۔ ہمارے کنبے کی آمدنی اگر آج بھی وہی ہوتی تو ہمیں دو وقت کی روٹی مشکل ہو جاتی، لیکن اس زمانے میں ہمارا گھر بستی کے خوشحال گھروں میں شمار ہوتا اور ہماری حویلی اپنے چبارے کی وجہ سے، جو مدت تک گاؤں کا اکلوتا چبارہ رہا، کسی قدر منفرد حیثیت رکھتی تھی، لیکن ہمارے گھر کی جانب اطراف و اکناف کی عورتوں کا رخ ہماری ''آسودہ حالی'' سے زیادہ دراصل بے جی کی دریا دلی کی وجہ سے تھا۔ پیسے تو ان کے پاس ہوتے نہ تھے، البتہ حویلی کی تاریک ترین کوٹھڑی میں رکھی ہوئی لکڑی کی بنی ہوئی ایک اونچی مخروطی ''گہی'' (اجناس کی ذخیرہ دانی) سے گیہوں، باجرے، جوار کے ''ٹوپے اور پڑوپیاں'' (اجناس ماپنے کے پیمانے) بھر بھر کر حاجت مندوں میں تقسیم کرتی رہتیں۔ بے جی کا نام سردار بیگم تھا اور وہ اپنی سخاوت سے تھیں بھی ایک سردار خاتون۔

پیسوں کے ذکر سے یاد آیا کہ بے جی کبھی پیسے گننے لگتیں تو بیس سے اوپر جا کر گویا خلا میں کھو جاتیں۔ رقم کو دس دس کی ڈھیریوں میں بانٹ کر گنتیں۔ زیادہ ریز گاری سے سابقہ پڑ جاتا تو پہروں بیٹھی اپنے ''جنرک فارمولے'' سے حساب جوڑتی رہتیں۔

بے جی ہمیں گود سے اترنے ہی نہ دیتیں۔ گھر کے کام کاج بھی مجھے یا مجھ سے بڑے بھائی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(سید بشیر حسین شاہ صاحب جو پنجاب کی صوبائی سول سروس میں رہے) کو "کچھڑ" (بغل) میں بائے دبائے کرتی رہتیں۔ اس وقت ہم تین بھائی تھے۔ بڑے بھائی کو ہم لوگ "بھائیا، بھاپا" "لالہ" کہتے ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی بھاپا نادر شاہ ہم سے اتنے بڑے تھے یا اتنے بڑے نظر آتے کہ گھر میں اتنے بڑے بھائی کا ہونا کچھ عجیب سا لگتا اور ہم دونوں چھوٹے بھائی اتنے چھوٹے تھے کہ والدین کے اس "مرحلہ عمر" میں اتنے چھوٹے بھائیوں کا مستقلاً موجود ہونا بھی کچھ عجیب سا محسوس ہوتا۔ یوں اگر ہم سب بہن بھائی زندہ ہوتے تو نو دس کی نفری دگڑ دگڑ کرتی۔ بھاپا نادر شاہ اور بھائی بشیر کے درمیان اوپر تلے چھ سات بہنیں متواتر پیدا ہو کر التزام کے ساتھ شیر خوارگی کے ایام میں مرتی رہیں۔ کسی کو چنی اوڑھنے کی مہلت نہ ملی۔ دو بھائی یکمشت یعنی جڑواں پیدا ہوئے اور چوبیس گھنٹے اس دارفانی میں لیٹے رہنے کے بعد جس طرح اکٹھے آئے تھے، اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔

بے جی ہر چند ہمیں "کچھڑ" سے اتارتی نہ تھیں، تاہم "بار برداری" کے لحاظ سے وقت کی کچھ "راشنگ" انہوں نے کر رکھی تھی۔ مثلاً سحر کے وقت جب وہ چکی "جگرتیں" تو بھائی جان ان کی گود میں ہوتے اور ہم بستر میں۔ (ہماری رگ شاعری بیدار کرنے میں چکی کی گھر گھر کا بھی کچھ حصہ ہوگا) دودھ بلونے کے دوران میں، ہم گود میں ہوتے اور بھائی جان پاس پیڑھی پر بیٹھے دہی چاٹتے۔ اسی طرح جب بے جی بھینس دوہنے لگتیں (کبھی کبھی یہ کام بھی کر لیتیں) تو بھینس کے تھنوں سے براہ راست دودھ کی دھاریں بھائی جان پیا کرتے، البتہ نماز فجر کے بعد جب بے جی مصلے پر بیٹھے بیٹھے سلطان العارفین پیر سید محمد شاہ کے عارفانہ ابیات گنگناتیں جن کو وہ "مدح شریف" کہتیں تو سوز و گداز کی ان لہروں کو ہم ان کی گود میں بیٹھ کر اپنی روح میں جذب کرتے (ہمارے دل میں شعر و سخن کی چنگاری ان ابیات سے بھی روشن ہوئی)

بے جی اتنے تڑکے اٹھتیں کہ ہم دونوں بھائی ان کے ساتھ اٹھ کر پھر سو جاتے، پھر اٹھتے پھر سو جاتے، لیکن جب بھی اٹھتے، مطاع عالم پر تاریکی کا پہرہ مسلط ہوتا۔ گھر کے کام کاج ان کو دن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھر سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے۔ آئے گئے والا گھر تھا، ایک گیا دو آ گئے۔ تنور ہر وقت گرم رہتا۔ بارہ بارہ کوس میں وعظ کی مجلس خواہ کسی گاؤں میں جمتی، واعظین کا پڑاؤ ہمارے گھر پر ہوتا۔ ہزاروں لاکھوں مریدوں کے پیر صاحبان اس علاقے میں قدم رنجہ فرماتے تو ارادت مندوں کے جلو میں ایک وقت کی ضیافت ہمارے گھر پر بھی تناول فرماتے۔ خاندان کے متعدد بزرگوں کی سالانہ برسیاں جواب مہینے میں دو دو مرتبہ ہو رہی تھیں، مزید برآں تھیں، چنانچہ صحن میں چاول کے "دیگ برے" (بڑے دیگچے) اور آلو گوشت کے "کٹورے" (مٹی کی بڑی بڑی ہانڈیاں) چولہوں پر چڑھے رہتے۔ (اللہ بخشے چاندی کمہار اور اللہ سلامت رکھے) بابا الف دین حجام نے اتنا آٹا اور سالن اپنے گھروں میں نہیں کھایا جتنا ہمارے گھر میں کھایا۔ عام دنوں میں ہانڈی ایک وقت شام ہی کو پکتی، دوپہر کے وقت تنور کی گرما گرم گھی مکھن سے چپڑی ہوئی روٹی کے ساتھ چٹنی، اچار اور لسی کی دوری۔ ہماری روٹی پر بے جی چٹکی سے گڑھے ڈال کر ان میں گھی کی اچھی خاصی جھیل کھڑی کر دیتیں۔ بے جی خود سارے ٹبر کو کھانا کھلانے کے بعد کھاتیں۔ دو چار لقمے کٹوری سے پونچھ پونچھ کر حلق سے اتارے اور الحمد للہ کہہ کر نماز عشاء کے لئے کھڑی ہو گئیں یا کسی کام دھندے میں لگ گئیں۔

بے جی گھر بار کے کسی کام کو اپنے ہاتھوں کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتیں۔ سے کی معاشرت ہی ایسی تھی۔ بھینسیں دوہنا تو عورتوں کے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، ہم نے انہیں ایک دو مرتبہ راج مستریوں سے کرنڈی چھین کر چھت کی لپائی کرتے بھی دیکھا۔

ہانڈی پکانے سے چھت کی لپائی تک کسی دوسرے کا کیا ہوا کام انہیں مشکل ہی سے کبھی پسند آتا۔ آج تک ہم دونوں بھائیوں کی جتنی چخ چخ اپنی بیویوں کے ساتھ بینگن کے بھرتے پر ہوئی ہے، اس نے زندگی کا بھرتہ کر رکھا ہے۔ سہ پہروں کو بے جی چادر کی "ڈوہنگی بکل" مار کر سر پر گیہوں کی بھری "پناتر" (دانوں سے بھری چنگیر یا صحنک) اٹھائے برادری کے گھروں میں "بیمار پرسی" اور مبارک بادی کے مشن پر نکل پڑتیں۔ اگر خود نہ نکلتیں تو گاؤں کی چار چھ بیبیاں یا کمیری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورتیں ان کے پاس آجاتیں۔ بیچ میں گڑگڑاتی ہوئی چلم اور نیم دائرے میں پیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی بیبیاں۔

''کس کے گھر کیا پیدا ہوا...... بیٹا، بیٹی، کٹا، کٹی؟'' ''قائم حوالدار جبل پور چھاؤنی سے چھٹی پر آیا ہے تو بہن کے لئے بھی کچھ لایا ہے یا نہیں؟''...... زبیدہ پھر میکے آبیٹھی، ماں اس کو بسنے نہ دے گی......'' ''رسول بی بی کے نئے گوکھرو دیکھنے کے لائق ہیں۔'' بس اس رخ اور سطح کی باتیں یا کہیں کہیں بیچ میں سرگوشی۔ سرگوشی میں کوئی ایسی بات کہ سب بیبیاں یکبارگی کھلکھلا کر ہنس پڑتیں یا توبہ استغفار کے ہاتھ کانوں پر رکھتی ہوئی ایک دوسرے سے کہتیں: ''یا اللہ، کیسا کلجگ آگیا ہے۔ قرب قیامت کی نشانی ہے۔'' (بڑی بہن، آپا، باجی)...... دیدوں کا پانی مر گیا میں خیر سے چھ بچوں کی ماں ہوں، مگر قسم لے لو جو آج تک کبھی جیٹھ کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی کی ہو، حالانکہ ماے کا بیٹا ہے۔''

اکثر عورتوں کی طبیعت لگائی بجھائی کی طرف زیادہ کھلتی تھی۔ خاندانوں میں رخنہ ڈالنے کا کوئی نہ کوئی شگوفہ کہیں نہ کہیں سے نکال لاتیں، مگر سبھی ایسی نہ تھیں۔ صلح کل طبیعت کی بعض عورتیں نفاق کی آگ بجھانے کے لئے ''فائر بریگیڈ'' کا کام کرتیں جس گھر سے نفاق کی بو آتی وہاں ہاتھ ملتی ہوئی پہنچ جاتیں اور منت ترلے سے مفاہمت کی راہ نکالتی رہتیں۔ اس ضمن میں برادری کی چند اہم معمر خواتین کے علاوہ ماسی نکی کمہاری اور (اس زمانے میں) اسی نوے سالہ بابا منگ سنگھ کی اتنی ہی بوڑھی دھرم پتنی کا مولادی کا رول ''تمغہ امتیاز'' کے لائق تھا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتیں تو ہمارے گاؤں کی ''ہنری کسنجر'' سمجھی جاتیں۔

دوسرے تیسرے دن بے جی چرخے میں پونی ڈال دیتیں۔ گھر کے کھیس، چادریں، دوہتیاں، سوسنیاں، دسترخوان اور نہ جانے کیا کیا دوسرے پارچات انہیں کے کاتے ہوئے سوت سے بنے جاتے۔ بے جی کے کام کرنے کی لگن اور ہمت کی کوئی حد نہ تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں تھوڑی دیر کے لئے ماسی نکی کے ہاتھوں میں چھوڑ کر کچھ بیان شاہ جی (والد صاحب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبلہ) کا ہو جائے کہ ان کو سمجھے بغیر بے جی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ شاہ جی کی طبیعت کا رخ ابتدا ہی دنیا سے زیادہ دین کی طرف رہا، مگر جب ہماری ہوش کی آنکھیں کھلیں تو ہم نے ان کو دنیا کی طرف سے قریب قریب فارغ یا کم از کم خالی الذہن پایا۔ درویش منش، گوشہ نشین، عابد شب زندہ دار اور بے نیاز۔

ارکان شرعیہ کے پابند، سبزہ خط جیسا نمودار ہوا تھا، عمر کے ساتھ ساتھ سیاہ سے ملگجا اور بلکے سے سفید ہوتا چلا گیا۔ ڈاڑھی کم، مونچھیں زیادہ ترشواتے۔ آخری عمری میں ڈاڑھی کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی جو نور کا ایک مقدس ہالہ بن کر ان کی شخصیت کا ایک جزو بن گئی۔ ان کا بیشتر وقت عبادت، مطالعہ کتب دینی میں یا حضور نبی اکرمؐ کی سیرت پاک کی مجلسوں کی حاضری میں گزرتا۔ ہر ماہ نصف کے قریب آمدنی کتب و رسائل کی خریداری یا دینی اداروں کے چندوں پر اٹھ جاتی۔

(والد صاحب قبلہ و کعبہ کا اسم گرامی سید حیدر شاہ تھا۔ **10** فروری **1943**ء کو انتقال ہوا۔ ہمارے گاؤں کے سادات والد صاحب کو ''شاہ جی'' کہتے ہیں جو کثرت استعمال سے ''شاجی'' رہ گیا ہے)

صبح و شام دو وقت کھیتوں میں دور دور تک گھومنا بھی ان کا معمول تھا۔ راست گو تھے، لہذا کم گو تھے۔ لباس میں موٹے چھوٹے کپڑے کا محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کرنے والا تہبند اور کرتا، سر پر سرکنڈے کی سبک ٹوپی جو کبھی تیز ہوا میں اڑ جاتی تو دوسرے گاؤں سے پکڑ کر لائی جاتی، شانوں پر تولیہ۔ محکمہ آبکاری میں انسپکٹری کے زمانے میں اتنا سا تکلف اختیار کر رکھا تھا کہ شلوار پر لمبا کوٹ پہن لیتے اور سر پر پگڑی رکھ لیتے۔ اب بھی سہ ماہی کی سہ ماہی ضلع کچہری میں پنشن لینے جاتے تو شلوار اور پگڑی نکلوا لیتے۔ پگڑی جو سرکنڈے کی کلاہ پر بندھی رہتی، چھ چھ پنشن وصول کرنے کے بعد کہیں کھلتی۔ بخل اور مزاحمت کا جذبہ جیسے ان کی طبیعت میں تھا ہی نہیں، البتہ انسانی ہمدردی کا دودھ چھلک چھلک پڑتا، اپنی ذات پر ایک پیسہ خرچ کرتے ہوئے دس مرتبہ سوچتے، مگر مشائخ، صوفیا اور علما و فضلا کی خاطر تواضع میں کسر نہ چھوڑتے۔ اپنے والد صاحب کی برسی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقریب پر سیرت النبیؐ کے جلسے کا اہتمام کرتے اور مساکین کو کھانا کھلاتے۔ (ہمارے دادا کا اسم گرامی حضرت سید احمد شاہ صاحب تھا۔ آپ کا انتقال 25 فروری 1914ء کو ہوا۔) اپنے والد کی برسی کے علاوہ خاندان کے چند "معلق" بزرگوں کی برسیاں منانے کا بیڑا بھی آپ ہی نے اٹھا رکھا تھا، کیونکہ ان کے براہ راست ورثا یا تو اب باقی نہ تھے یا وہ خود مساکین کی صف میں پہنچ گئے تھے۔

رات کو کھانے پر بیٹھنے سے پہلے اطمینان کر لیتے کہ مسجد میں شب بسری کے لئے کوئی مسافر تو موجود نہیں۔ قصبے سے پھیری والے قصاب، کنجڑے، اساطی بساطی سودا لاتے...... تو وہ پہلے انہی کے پاس آتے اور آپ کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتے جس پر بے جی بڑبڑاتیں کہ جب کر یلے گھر میں لگے ہوئے ہیں، تو آپ نے کیوں خرید لئے؟ اس پر کہتے: "اوہ نیک بخت! وہ اتنا بوجھ اتنی دور سے اٹھا کر لایا تو کیا ہم اتنا بھی نہ کریں؟" مکتب میں دسویں تک پڑھے تھے، لیکن فارسی عربی پر وسیع نظر رکھتے۔ انگریزی میں بھی جبر ملازمت کے ہاتھوں خاصی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ ہماری شاعری کا کچھ کچھ چرچا ان کی زندگی میں چل نکلا تھا۔ ہم تو خیر یہ جگرا کہاں سے لاتے کہ اپنے نوجوانی کے ارمانوں میں شور بور رومانی شعروں کو، کہ ایک ایک شعر سے دو دو لڑکیاں جھانکتی تھیں، ان کو سناتے، لیکن اخبارات اور جرائد میں ہماری نظمیں ان کی نظر سے گزرتی ہوں گی۔ انہوں نے برملا کبھی خوشنودی کا اظہار فرمایا نہ اس جذبے کو کچلنے کے لئے مارشل لا نافذ کیا۔ ایک مرتبہ صرف اس قدر فرمایا: "تم یہ غزلیں وزلیں کیا لکھتے رہتے ہو، کبھی حضور نبی اکرمؐ کی نعت بھی لکھا کرو۔"

شاہ جی مجھ کو لاڈ سے "وردی میجر" کہا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ جوان ہو کر ہم نے فوج ہی کی وردی پہنی اور میجر کے رینک تک ہی جا سکے۔ بعض اوقات اب بھی شاہ جی سے روٹھنے کو جی چاہتا ہے کہ انہوں نے اس وقت "وردی جنرل" کیوں نہ کہہ دیا، مگر شاید وہ بیٹے کی صلاحیتوں کا بھی اندازہ رکھتے تھے۔

ہمارے شجرہ نسب کی اونچی ٹہنیوں میں بعض بزرگوں کے ناموں پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ علوم و فنون سے تمسک رکھتے ہوں گے، مگر انیسویں صدی میں ہمارے خندان میں علمی روایت کی پہلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اینٹ سید احمد شاہ صاحبؒ ہی نے رکھی اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مجھے ذوق سلیم کی کچھ چاندنی ملی تو ددھیال کی طرف سے اس کا سرچشمہ حضرت ہی کی ذات گرامی تھی۔

اب پھر بے جی کی قدم بوسی کو جی چاہتا ہے۔ ماں کے ذکر سے سیری کہاں؟ ہمیں یاد نہیں کہ شاہ جی کے کسی قول یا فعل سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع ملا ہو، مگر بے جی ہر وقت ان کے خلاف شکایات کا دفتر کھولے رکھتیں جو کچھ اس نوع کی ہوتیں:

''بکری آپ کے سامنے بوری میں سے کنک کھاتی رہی، مگر آپ سے ہشت بھی نہ ہو سکی۔''

''نورماہی، ترکھان آیا تو آپ کو خیال نہ آیا کہ گھر میں ٹوٹی چارپائیاں بھی پڑی ہیں۔''

''میں نے کہا تھا چھم والی زمین میں سرسوں دیکھ آؤ۔ آپ غوث شاہ کے پاس جا کر بیٹھ رہے۔ جیسے آپ، ویسا وہ۔''

خبردار! جو آئندہ برسی پر مولوی قطبی کو بلائیں۔ آٹھ سیر گوشت اکیلے کو چاہیے ''شنا'' (مشک بھرنے کے لئے۔''

شاہ جی یہ باتیں خاموشی سے سنتے رہتے۔ درمیان میں اگر جواب بھی دیتے تو (غالباً لطف لینے کے لئے) کچھ اس قسم کا خطاب ہوتا...... ''حادثات، مادہ، عناصر، اجسام، ہیئت، یہ سب قدرت کے اسرار ہیں نیک بخت!'' اس قسم کا آفاقی جواب سن کر، بے جی اور بھی مشتعل ہو کر، مولوی قطبی کے خلاف نئے سرے سے محاذ کھول لیتیں۔

بے جی کے میکے کا گاؤں کھنیارہ شریف، ضلع میرپور (ریاست جموں و کشمیر) ڈوڈیال کے مشہور قصبے کے قریب واقع تھا۔ اب یہ بستی منگلا جھیل میں ڈوب چکی ہے۔ پیر ہجویر حضرت داتا گنج بخشؒ کا قول ہے کہ انسان اپنے ماحول میں دھنسا رہتا ہے اور اس پردے سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتا، جو اس کے اوپر تنا ہوا ہے۔ بے جی اپنے میکے سے عملی کھیتی باڑی کی بڑی محکم روایت ترکے اور طبیعت میں لائی تھیں، مگر سسرال والوں نے کچھ مدت سے ''ہل پنجابی'' توڑ تاڑ کر اپنی زمینیں ''پھکے'' (بٹائی) پر مزارعوں کے سپرد کر رکھی تھیں۔ بے جی کو ''بابوانہ'' زندگی کا یہ اسلوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک آنکھ نہ بھاتا۔ان کی دلی خواہش تھی جیسے ان کے میکے کی تمام تر معاشرت زمین سے اگی ہوئی تھی اور ان کے بھائی، بھتیجے، مامے، چاچے، تائے وغیرہ گھر سے زیادہ کھیتوں میں بود و باش رکھتے تھے اور پھر جیسے ان کی حویلیوں میں انسان اپنے بیلوں، بھینسوں، گھوڑوں، اونٹوں، بکریوں وغیرہ سے یگانگت کا قرب اور ان کے گلے میں پڑی حمیلوں کے گھنگھروؤں کی ٹن ٹن پر ایک دلی خوشی محسوس کرتا تھا...... زندگی کا وہی چلن سسرال کی حویلی میں بھی قائم ہونا چاہیے، مگر وہ نقشہ یہاں کیونکر جمتا؟ میکے کا گاؤں دو طرف سے پہاڑوں اور دو طرف سے دریاؤں نے دنیا سے کاٹ رکھا تھا۔مثل ہے کہ دور کون جو دریا پار، لیکن سسرال کے گاؤں سے ریل کی پٹڑی اور جرنیلی سڑک دوڑھائی میل کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ ہم لوگ رفتہ رفتہ ملازمت پیشہ زمیندار بن گئے تھے۔ بے جی اس صورت حال سے مطمئن نہ تھیں۔عورت، دال اسی طرح بگھارتی ہے جیسے اس کی ماں دال بگھارتی ہے۔ بے جی نے دو ایک مرتبہ حویلی میں ''ہل پنجابی'' کے احیا اور بیلوں کی آؤ بھگت کا اہتمام کیا، لیکن کبھی بیل بھاگ نکلے، اور کبھی ''ہالی'' ''ہل پنجابی'' چھوڑ کر، بلوچ رجمنٹ میں بھرتی ہو گئے۔آخر کار بے جی نے گھر میں کاشتکارانہ ماحول کی افزائش و پرورش کی یہ ترکیب نکالی کہ فصل کے پکنے پر، بعض نادہندہ مزارعوں سے کھڑی فصل کھیت سے کٹوا کر، کچھ کھلیان میں اور کچھ حویلی میں لا کر انبار کر دیتیں۔ یہ ٹانڈے جب کھیت میں ہوتے تو یوں لگتا کہ پہنائے دو عالم میں نہ سمائیں گے۔شاہ جی کو یہ کھڑاک ناپسند تھا۔وہ اس موقع پر، ازراہ تفنن گھر کے باقی لوگوں سے کہا کرتے: ''آؤ ہم لوگ چن (شاہ جی اپنے چھوٹے بھائی سید چنن شاہ صاحب کو چن کہا کرتے۔ ان کا انتقال دسمبر 1954ء میں ہوا) کے گھر چلے چلیں۔ ہمارے گھر میں تو تمہاری والدہ کے ٹانڈے آ رہے ہیں۔'' لیکن جب ٹانڈے، ٹے اور پھلیاں گھر میں انبار ہو جاتے تو پھر یہ احساس ہوتا کہ حویلی میں ہر چیز کے لئے جگہ موجود تھی اور جیسے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہی تو رکھی ہوئی تھی۔

حویلی میں بھی کھلیان کا نقشہ جم گیا تو اب چھان پھٹک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیجئے مہینوں چھان کھڑکتے اور منگلیاں بجتی رہیں۔ چھتر کا ایک رستم زمان ''چٹو'' جو سال بھر گھر کے کسی کونے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اونگھتا رہتا تھا، اس رت میں ''حاضر نوکری'' پر طلب کر لیا جاتا۔ یہ ''چٹو'' خاندانی ورثے کے طور پر، نہ جانے کتنی منگلیاں کھاتا ہوا اب ہم تک آ پہنچا تھا۔ اس کا خمیر تو سنگ سفید سے اٹھایا گیا تھا، مگر مرور ایام نے سیاہ کر دیا تھا۔ اپنے حلقہ نیابت میں موصوف کو ''چٹو کونڈا، یا لنگرا'' کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

دادا جان کی وفات پر، باقی تمام منقولہ وغیرہ منقولہ جائداد تو مع رسدی پانچ بھائیوں میں تقسیم ہوگئی، مگر ''چٹو'' کو ایک ناقابل تقسیم ثقافتی یونٹ سمجھ کر، سب سے بڑے بھائی، یعنی ہمارے والد صاحب کی سپرد داری میں رکھ دیا گیا۔ جیسے مجلس اقوام متحدہ کسی ملک کو، کسی دوسرے کے انتداب میں رکھ دیتی ہے۔ چٹو کا مستقل سیکرٹریٹ، ہر چند ہمارے گھر میں تھا، مگر اس کا ''جلوس'' اکثر چلتا پھرتا نظر آتا۔ کبھی ایک چچا کے ہاں کبھی دوسرے کے گھر۔ چار پانچ نفر اس کو اٹھانے کے لئے درکار ہوتے!

شادات کا ''لنگرا'' ہے ذرا دھوم سے نکلے:

''کونڈے'' کی افادیت بے شک مسلم تھی۔ منگلیوں کی ٹھک ٹھک سے جو کام ہفتوں میں نہ ہو سکتا تھا ''کونڈا'' دنوں بلکہ گھنٹوں میں کر ڈالتا۔

ہاں، ایک قباحت تھی کہ چٹو ایک تھا اور براہ راست سلب میں سے نکلے ہوئے پتی دار پانچ تھے۔ علاوہ ازیں پندرہ بیس مستحقین وہ بھی جو رشتے داروں کے نظام شمسی میں دائیں بائیں گھومتے رہتے۔ اس ''چٹو'' کی ''الاٹمنٹ'' ہر چند، پاکستان زرعی بنک کے ٹریکٹروں کی الاٹمنٹ کے طریق کار پر...... پہلے آؤ، پہلے پاؤ...... کے اصول پر کی جاتی، تاہم اختلافات کے پہلو اکثر نکلتے رہتے اور چھٹائی کے موسم میں تو نندوں، جٹھانیوں، دیورانیوں اور دوسری رانیوں کے درمیان ایسی ایسی نزاعیں پیدا ہوتیں کہ ''چٹو'' کو کسی دوسرے ''چٹو'' میں رکھ کر سرمہ کر دینے کو جی چاہتا۔ ''کونڈے اور ڈنڈنے'' کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، لیکن ہمارے ''کونڈے'' کا ''ڈنڈا'' مدت سے وفات پا چکا تھا، لہٰذا ڈنڈا جسے موسل بھی کہتے تھے، تمام متوسلین نے اپنا اپنا بنوا رکھا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب اسے اتفاق سمجھے کہ جب سے خاندان کا مشترکہ ڈنڈا ٹوٹا تھا، خاندان کا سنگھٹن بھی کمزور پڑ گیا تھا اور مشترکہ بیٹھک بھی ٹوٹ گئی تھی۔

ایک اور منظر یادوں کے پردے پر ابھر آیا۔ بڑے بھائی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج گجرات میں تھے اور میں گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم میں نویں دسویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ اتنا ''پٹھور'' ہو چکا ہوں کہ کبھی کبھی لنگوٹ باندھ کر تیل کی مالش کر کے کبڈی کے اکھاڑوں میں اتر جاتا ہوں۔ حسینوں کے مکھڑوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی حس بھی بیدار ہو چکی ہے۔ جاڑے کے دن ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے اتوار کی چھٹی گزارنے گھر آیا ہوں۔ پیر کی صبح کو ''دینا'' ریلوے اسٹیشن سے چھ بجے کی گاڑی سے جہلم جانا ہے۔ گھر میں الارم والی گھڑی موجود ہے، مگر بے جی اس پر بھی بھروسہ نہیں کرتیں۔ کیا معلوم بجے نہ بجے۔ رات کو ان کے سونے جاگنے کا انحصار ''دب اکبر'' کی نقل و حرکت پر ہوتا جس کو عرف عام میں ''ترنگڑ '' کہتے ہیں۔ ''ترنگڑ '' مدو کالس کے کنویں پر ہوتے تو وہ سو جاتیں اور دو میل آگے جب موضع خانہ بوکی کی منڈیروں پر ہوتے تو آپ اٹھ جاتیں مگر آج بمشکل ایک فرلانگ چلے ہوں گے کہ بے جی اٹھ بیٹھیں۔ پہلے کتنی دیر چکی پیستی رہیں۔ پھر دو وقتوں کا بارہ چودہ سیر دودھ بلویا۔ پھر وضو کر کے مصلے پر بیٹھ گئیں اور کافی دیر تک باواجی کے یہ ابیات۔

الاپ کر چولہے میں آگ روشن کی اور دو ایسے جبر جنگ پراٹھے پکائے کہ ہر پراٹھے کے پانچ پانچ پرت اور ہر پرت میں ایک ایک چھٹانک گھی۔

اب کبھی تلوے، کبھی ماتھا چھو کر ہمیں جگایا۔ ہم جاگے تو منہ ہاتھ دھلایا، کپڑے لا کر دیے، ''پھر ادھ رڑکے دودھ'' کے ساتھ ایک پراٹھا ہمیں کھلایا۔ دوسرا ساتھ میں رکھ دیا کہ بورڈنگ ہاؤس میں کام آئے گا، اب میں گھر سے نکل آیا ہوں۔ افق بھی تاریک ہے، بستی سوئی ہوئی ہے، کتے بھونک رہے ہیں۔ جب ہم چلے تھے تو شاہ جی اپنے لمبے وظیفے کے بعد خدا حافظی کی دو پھونکیں ہمارے چہرے پر بکھیر گئے تھے۔ اولاد سے ان کی محبت کا اظہار، صبح و شام کی انہی دو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھونکوں سے ہوتا۔ ہم ''کھلا '' عبور کر کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ہو لئے۔ بے جی ساتھ ساتھ نا ہیں۔ میں بار بار کہتا ہوں بے جی لوٹ جاؤ، میں کوئی بچہ نہیں۔ میں کوئی لالہ موسیٰ تو نہیں جا رہا، مگر وہ برابر چلی آ رہی ہیں، یہاں تک کہ وہ گرانڈیل سلیٹی پتھر آ گیا جس کو ہم لوگ ''تہرڈا'' کہتے ہیں جو ہمارے گاؤں چک عبدالخالق اور دوسرے دو مواضعات ہڈالی اور ڈھوک کھوکھر کی سرحد پر شاید 1860ء کے جرنیلی بندوبست میں نصب کیا گیا تھا۔ یہاں بے جی میرے ماتھے اور دونوں رخساروں کو باری باری چوم کر لوٹ جاتی ہیں کہ اب پو پھٹ رہی تھی۔ کسان گھروں سے نکل رہے تھے۔ قصبہ سامنے نظر آ رہا تھا، بلکہ جب تک میں وہاں پہنچوں قصبے کے کھتری اور سکھ دکاندار اور ان کی آدھی جاگتی، آدھی سوئی ہوئی کھترانیوں اور سکھنیوں کے غول کے غول، منہ میں پھلائی کے داتن دبائے، ہاتھوں میں پتیل کی گڑویاں اٹھائے، کھیتوں کی طرف آتے، کیرتی کرتے، شبدالاپتے ملیں گے۔

لیکن الوادعی پیار کے بعد بے جی واپس کہاں گئی ہیں؟ جب تک کھیت میں کھڑی، باجرے یا گیہوں کی فصلوں یا کچی سڑک کے دورویہ ایستادہ بوڑھے شیشم کے درختوں نے مجھے اوجھل نہیں کر دیا۔ وہ ''تہرڈے'' کے ساتھ لگی کھڑی ہاتھ ہلا رہی ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ جب وہ اسی طرح ہاتھ ہلاتی ہیں، تو ساتھ ساتھ منہ سے یہ لفظ بھی کہتی جاتی ہیں:

''ماں گھمائی صدقے جائے۔'' (اماں قربان جائے)۔

''اللہ تے اللہ دا رسولؐ تیرا راکھا ہوئے۔''

ہمارے سب سے بڑے بھائی بھاپا نادر شاہ جو پہلوٹھی کی اولاد تھے، یوں تو چوڑے چکلے ہاڑ کے، دو تین منزلہ، تگڑے تنومند آدمی تھے، مگر ان کا سر، شاہ دولہ کے چوہوں کی طرح تھا جیسے لبوترا سا خربوزہ ہو۔

بچپن میں ان کو دیکھ کر ڈر لگتا، ہنسی بھی آتی کہ بھاپا کے سر کو یک لخت یہ کیا ہو گیا۔

ہمیں کچھ عقل آئی تو معلوم ہوا کہ بھاپا کا سر جتنا پتلا تھا، عقل اتنی ہی موٹی تھی، بلکہ باقاعدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاگل پن کے دورے پڑتے تھے جن کا کوئی ٹائم ٹیبل مقرر نہ تھا۔ اچھے بھلے بیٹھے ہوتے کہ وقعتہً چنگھاڑنے لگتے۔ اسی عالم میں اونچی اونچی آواز میں نادیدنی پیکروں (بلکہ پری پیکروں) کو گالیاں دیتے اور ان پیکروں کی طرف لپکتے۔ جوانی کے ساتھ ساتھ یہ جنون بھی جوان ہوتا چلا گیا۔ یوں عام نارمل حالت میں بھی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں کچھ تلاش کرتے رہتے۔

جنون کی کیفیت میں جو سامنے آجاتا، دھول دھپہ بھی کر بیٹھتے گالیاں دیتے، البتہ شاہ جی کا اس حالت میں بھی لحاظ کرتے۔ وہ سانے آجاتے تو بھاپا ان کا ہلکا سامنہ چڑا کر، کترا کر نکل جاتے یا پھر چچا چمن شاہ صاحب سے کتراتے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بھاپا کی خوب مرمت کی تھی کہ اس نے بے جی پر کیوں ہاتھ اٹھایا تھا، مگر بے جی اس واقعے پر مہینوں اپنے دیور سے روٹھی رہی تھیں کہ اس نے میرے لخت جگر کو کیوں مارا۔ بھاپا سب سے زیادہ پیار بے جی سے کرتے۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو انہیں سے کرتے۔ بولتے بھی انہیں کے بلائے سے تھے۔ مار کٹائی بھی زیادہ انہیں کی ہوتی۔ جو بولے سو کنڈی کھولے...... یہ تو تھا تصویر کا وہ رخ جو ہم دیکھتے تھے، لیکن اگر بھاپا نادر سے پوچھتے اور اگر جذبہ گرفتار گریباں ہو پاتا تو شاید یہ شعر ان کی قلبی کیفیات کی کچھ ترجمانی کر سکتا۔

کچھ اپنوں کے نام بھی ہوں گے، ناحق کی رسوائی ہوگی
دیوانہ یہ کیسے بتائے، کس نے، کس نے مارے پتھر

بھنا ہوا گوشت بھاپا کا مرغوب کھاجا تھا۔ بے جی، ہانڈی بھوننے لگتیں تو آکر ان کے ''کوڈے'' (گھٹنے) سے لگ کر بیٹھ جاتے اور چیخ چیخ کر اپنا کھاجا مانگتے:

''بے بے بوٹی کھاساں ، بے بے بوٹی کھاساں''

(امی بوٹی کھاؤں گا۔ بھاپا، والدہ کو بے بے کہتے، جبکہ ہم بے، یا بے جی کہتے۔)

اور ''بے بے'' ہانڈی سے بھنی ہوئی بوٹیاں نکال نکال کر انہیں کھلاتی جاتیں اور ساتھ ساتھ نرم نرم چاہتوں کی باتیں بھی بیٹے سے کرتی جاتیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نادر، ہوں ہاں کرتا جاتا کہ یہی چند ساعتیں ان کے ''نزمانے'' کی ہوتی تھیں، لیکن باہمی خیر سگالی کی یہ پینگ اکثر بدمزگی پر ٹوٹتی۔ وہ یوں کہ جہاں بے جی نے بوٹی دینے سے ہاتھ روکا تا کہ باقی ٹبر کے واسطے دو چار بوٹیاں بچا کر رکھ سکیں تو بھاپا آگ بگولہ ہو جاتے۔ ہانڈی اٹھا کر ''چنو'' پر دے مارتے یا ہانڈی سمیت گلی میں نکل جاتے۔

(ہمارے جدامجد حضرت سید محمد عبدالخالق شاہ رحمتہ اللہ علیہ کو ہم لوگ ''میاں صاحب'' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ہمارا گاؤں انہی کے نام پر چک عبدالخالق کہلاتا ہے) آس پاس کے دیہات کے لوگ ان کو سائیں نادر کہتے اور لحاظ اور درگزر سے پیش آتے یعنی گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوتے۔ لحاظ کی ایک وجہ تو شاہ جی کا لحاظ تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ۔

دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیے؟

لیکن بہنوں کے دل میں یہ خیال بھی جاگزیں تھا، مبادا مجذوب ولی ہوں۔ خاص کر کے اکثر عورتیں تو ان کو سائیں نادر شاہ بادشاہ کہتی تھیں۔ بھاپا جس گھر میں چلے جاتے، گھر کے سب سے اونچے پلنگ پر سب سے بڑھیا کھیس بچھ جاتا، تکیہ لگ جاتا، دودھ بالائی، حریرے، حلوے کے کٹورے دوڑنے لگتے، عورتیں زمین پر سامنے بیٹھ جاتیں:

''سائیں جی دعا کرو، بھینس کٹی دے۔''

''شاہ جی دعا کرو میرا اللہ دتہ حوالدار بن جائے۔''

''شاہ جی یہ بتاؤ میری نتھ اور ہنسلی کس نے چرائی ہے؟''

بھاپا ان باتوں پر ''جلی'' (عالم جذب میں زور سے چلانا) مارتے ہوئے جو بے ربط جملے بھی کہتے، زود اعتقاد عورتیں اپنی طرف سے ان میں معنی پیدا کرتیں رہتیں ...... سائیں باشاہ کی اپنی فرمائش بس ایک ہوتی: ''بوٹی کھاساں۔''

نوجوان عورتوں کے جھرمٹ میں بھاپا خصوصاً نہال ہوتے۔ کسی گھر میں شادی بیاہ کی بھنک پڑ جاتی تو اڑ کر وہاں پہنچتے۔ مایوں سے لے کر ولیمے تک وہیں پڑے رہتے۔ ناچتے، گاتے گلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ڈھول ڈال کر بجاتے۔نوشہ کا ایک شہ بالا قبیلے سے ہوتا، دوسرا شہ بالا سائیں نادر شاہ بادشاہ ......گھوڑی پر خواہ نوشہ کے لئے بھی گنجائش ہو یا نہ ہو، آپ ضرور سواری کرتے ہوئے دلہن والوں کے گھر پہنچتے......جیسا سہرا دولہا کا، عین مین ویسا ان کا ہوتا۔دو تین روز بعد گھر آتے تو جیب سلامی کی دونیوں، چونیوں، اٹھنیوں سے بھری ہوتی۔وہ یہ ریز گاری لا کر بے جی کے دوپٹے کے پلو سے باندھ دیتے جس پر ماں ایک ہلکی سی پیار بھری چپت بھاپا کے گالوں پر لگاتے ہوئے کہتی:

''نادرا، اڑیا ہن تیرا ویاہ کر دیے۔'' (نادر، اب تری شادی کر دی جائے)

اور بھاپا جواب میں نعرہ لگاتا: ''بے بے بوٹی کھاساں۔''

بھاپا، بعض اوقات تین تین، چار چار مہینے......گھر سے غائب رہتے۔ریلوے کے مسافر خانوں اور گاڑیوں کو چھانا جاتا، دریاؤں میں بانس ڈالے جاتے، مگر تلاش کرنے سے وہ کبھی نہ ملتے۔ہاں کسی روز خود ہی واپس آجاتے۔کبھی گز گز سر کے بال بڑے ہوتے، کپڑے تار تار...... برے حال بانکے دہاڑے۔کبھی نیا جوڑا زیب تن کیے۔گلاب کی طرح تر و تازہ۔جیب چونیوں، اٹھنیوں، روپوں سے بھری ہوتی۔شاہ جی جن دنوں انبالے میں ملازم تھے، بھاپا بھاگ کر گاؤں آجاتے......شاہ جی گاؤں میں اٹھ آئے تو بھاپا بھاگ کر انبالے کا رخ کرنے لگے جہاں کے ایک حلوائی لالہ گوجرل کا ''بھگا'' ان کو بے حد مرغوب تھا، مگر گوجرل کا نام تو یاد تھا، لیکن انبالے کی سمت بھول چکے تھے......گھر واپس پہنچتے تو ڈیوڑھی سے صدا لگاتے:

''بھگا، گوجرل دا۔'' اور ''بے بے بوٹی کھاساں۔''

اور آدھی ہنستی اور آدھی روتی ''بے بے'' اپنے چوہے پتر سے لپٹ جاتی اور اس کے چہرے پر پڑی گرد چاٹ لیتی۔ایک مرتبہ دو چار مہینے کی جہاں گردی کے بعد آپ واپس آئے تو ران پر چھ سات انچ لمبا، دو ڈھائی انچ گہرا شگاف تھا۔سر پر بھی زخم تھا جو اگرچہ چھوٹا تھا، مگر ان کی سر کے لئے وہ بھی بہت بڑا تھا۔مرغی کے لئے تکلے کا زخم بھی بہت ہوتا ہے......بے جی مہینوں ان کی پیپ دھوتی اور ان سے گالیاں سنتی رہیں۔بھنے ہوئے گوشت کے علاوہ ان کی دوسری ترنگ یہ تھی کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کپڑے بدل بدل کر پہنتے رہیں۔ راہ چلتے کسی آدمی کے تہبند کا رنگ پسند آ جاتا تو وہیں اپنا تہبند اس کے تہبند سے تبدیل کر لیتے۔ اپنے گاؤں میں اعجاز علی جازو (جوانی میں وفات پائی) ایک خوش پوش نوجوان کے ریشمی لاچے اور تریزوں والے کرتے اکثر بھاپا کے کام آتے۔ ایک مرتبہ ایک نواحی گاؤں مدوکالس کے ایک چودھری صاحب جو کلکتہ پولیس میں انسپکٹر تھے، چھٹی پر وطن آئے اور برجس پہن کر چچا چمن شاہ صاحب کی بیٹھک میں آ گئے تو بھاپا برجس پر مچل پڑے اور اگلے روز انسپکٹر صاحب کی برجس، بھاپا نے ڈانٹ رکھی تھی۔ صرف برجس ہی نہیں، ان کی پولیس انسپکٹری کا ڈنڈا بھی ہاتھ میں گھماتے ہوئے نادیدہ پری پیکروں پر جھپٹ رہے تھے کہ..... ''ادھر آؤ تہاڈی.....''

شاہ جی کا بہت لحاظ کرتے، لیکن اگر ان کو کبھی کوٹ پہنے ہوئے دیکھ لیتے تو بے اختیار نعرہ لگاتے: ''شاہ جی کوٹ پاساں!''

غربت کے حق میں صرف ایک دلیل دی جا سکتی ہے کہ غریب آدمی آزاد آدمی ہوتا ہے، مگر سب سے زیادہ آزاد مستوار ملنگ ہوتا ہے۔ یہ شاید 1928ء یا 1929ء کی بات ہے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ بھاپا اچانک گھر سے غائب ہو گئے اور آج تک نہیں لوٹے۔ شاہ جی نے تو خیر اپنی ذات ہی کو درمیان سے نکال رکھا تھا۔ یوں بھی غم روزگار کو وہ رازی و رومی کے تانے بانے میں تحلیل کیے رکھتے، مگر بھاپا کی لمبی گم شدگی پر بے جی کی آنتیں ان کے بقول ''ڈھنگروں'' (کانٹوں) سے الجھ گئی تھیں۔ ہمیں ایسا کوئی دن یاد نہیں جب بے جی نے اپنے نادر کو یاد نہ کیا ہو ..... اس کے لئے روئی نہ ہوں، اس کے لئے دعا نہ کی ہو، اس کے نام کی روٹی نہ نکالی ہو..... گاؤں میں اتفاقاً کوئی شاہ دولے کا ''چوہا'' بھیک مانگتا آ نکلتا تو بے جی اس کو بڑے پیار سے دیکھتیں، اسے گھر کے اندر بلا کر چوکے میں اپنے پاس بٹھا کر بھنی ہوئی بوٹیاں کھلاتیں۔ خود جب بھی لقمہ توڑتیں، آہ بھر کر کہتیں اللہ جانے، میرے نادر کو بھی روٹی ملی یا نہیں ملی۔

نادر، گھر سے نکل گیا تھا، مگر نادرا گھر میں موجود تھا۔ بے جی کا انتقال 19 مئی 1973ء کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تقریباً سو برس کی عمر میں ہوا۔ اپنی آخری سانس تک ان کو یہ آس بندھی رہی کہ نادر زندہ ہے، انبالے گیا ہوا ہے، فقط راستہ بھول گیا ہے۔ دیکھنا کسی روز اچانک ڈیوڑھی سے آواز دے گا:

''بے بے بوٹی کھاساں''

اور اب

ما، نامہ بہ برگ گل نوشتیم
شاید کہ صبا بہ او رساند

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری عظیم ماں

لالہ صحرائی کا ''نعت'' میں ایک بلند مقام ہے۔ لیکن اسلام سے سچی محبت اور روشن خیال تحریریں پڑھنے والے قارئین کیلئے بھی وہ ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ساری زندگی اپنے قریبی دوستوں محمد صلاح الدین اور الطاف حسین قریشی کے ساتھ ملکر پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ لالہ صحرائی کا اصل نام محمد صادق تھا اور وہ ضلع خانیوال کی ایک چھوٹی سی تحصیل جہانیاں کے رہائشی تھے۔ انہوں نے کئی بین لاقوامی فورموں پر پاکستان کی نمائندگی کی۔ ''نعت'' لکھنے کے حوالے سے انہوں نے اپنی علیحدہ شناخت بنائی۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کا روشن کردار پیش کیا ہے۔

••••••••••••••••••••••••••

قارئین! میرے نزدیک، قادر مطلق نے آج تک کوئی ایسی ماں پیدا نہیں کی جو عظیم نہ ہو۔ جس طرح بعض حضرات محض اپنے عہدے کی بنا پر کسی ادارے کی مجلس منظمہ کے آپ سے آپ رکن قرار پا جاتے ہیں، بعینہ جو خاتون بھی ماں کے عہدے پر فائز ہو جائے، وہ آپ سے آپ بنی نوع انسان کے عظیم افراد کی مجلس کی رکن بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کوئی خاتون ماں بنتے ہی عظمت کے دربار میں کرسی پالیتی ہے۔ معاشرے کے حفظ وبقا اور ترقی وفروغ کی خاطر قرآن کریم نے مردوں کو خواتین پر ضرور فوقیت دی ہے، لیکن دوسری طرف قرآن ناطق یعنی رسول اکرم ﷺ نے اولاد (مرد وزن دونوں) کے لئے باپ کے مقابلے میں ماں کو اطاعت واحترام تین درجوں کا تفوق بخشا ہے۔ یہاں مجھے ایک سچا واقعہ یاد آ گیا، آپ بھی سن لیجئے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دستور کے مطابق احباب واعزہ ان کے ہاں بغرض تعزیت گئے۔ صف ماتم ان کے گھر کے لان میں بچھی تھی۔ فاتحہ خوانی اور دعائے مغفرت کے بعد اپنے اپنے طور پر سب نے ان سے اظہار افسوس کیا اور صبر کی تلقین کی۔ سو گوار بیٹے نے تعزیت کرنے والوں کا جواباً شکریہ ادا کیا، پھر بولے: ”حضرات! میں نے تو الحمدللہ اپنے صدمے پر کچھ قابو پالیا ہے، لیکن میرے چھوٹے بھائی نے عجب مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ ائیر فورس میں پائلٹ ہے، لیکن وہ نوکری سے فوری استعفا دینے کی ضد کر رہا ہے۔ جبکہ اس کی ریٹائرمنٹ میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے ظاہر ہے اس وقت استعفا دینے کی صورت میں وہ پنشن کی بعض مراعات سے محروم ہو جائے گا۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا ہے، مگر وہ مان نہیں رہا، برابر یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ والدہ کی وفات کے بعد میں اب نوکری نہیں کروں گا۔ وہ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے، خدارا آپ اسے سمجھائیں بجھائیں کہ وہ اس حال میں اپنی نوکری نہ چھوڑے۔“

یہ سن کر تعزیت کرنے والے چند اصحاب نے ڈرائنگ روم کا روخ کیا جہاں ایک صوفے کے کونے میں مرحومہ کا چھوٹا بیٹا ایک ممی کی صورت میں گم سم بیٹھا تھا۔ علیک سلیک کے بعد جب آنے والوں کی طرف سے فاتحہ خوانی اور تعزیت کا اظہار ہو چکا تو ایک صاحب نے دھیمے سے پوچھا: ”آپ کی چھٹی کتنی باقی رہ گئی ہے؟“ بیٹے نے سوال کا اصل مطلب بھانپ کر فوراً جواب دیا: ”غالباً آپ کو بھائی جان نے یہ بتا دیا ہوگا کہ میں نوکری پر واپس نہ جاؤں گا“۔

”نہیں بھائی، ایسا نہ کیجئے ایک اور صاحب نے دلاسے سے کہا ”صدمہ واقعی سخت ہے، لیکن یوں حوصلہ نہ ہاریئے“۔

”بھائی جان نے اگر میری نوکری چھوڑنے کی اصل وجہ آپ کو نہیں بتائی تو مجھ سے سن لیجئے“ نوجوان نے مستعدی سے کہا: ”دیکھئے میں اپنے اسکواڈرن میں ایک دلیر پائلٹ مشہور ہوں، خطرناک سے خطرناک فلائٹ میرے لئے بچوں کا کھیل بن جاتی تھی، صرف اس وجہ سے کہ ہر ایسی فلائٹ کے دوران یہ احساس مجھے نڈر بنا دیتا تھا کہ پیچھے گھر میں میری والدہ مصلا بچھائے بیٹھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور میری سلامتی کے لئے دعائیں کر رہی ہیں جو کبھی اکارت نہیں جا سکتیں، لیکن اب جب میں ان دعاؤں سے محروم ہو گیا ہوں تو میرا حوصلہ چھن گیا ہے، میں اب سرے سے جہاز ہی نہیں اڑا سکوں گا، اہم فلائٹیں تو کجا!''

''لیکن آپ کی سلامتی کے لئے دعائیں کرنے والے ماشاء اللہ آپ کے دوسرے بہن بھائی تو اب بھی موجود ہیں'' ایک صاحب نے حوصلہ دلایا۔

''ضرور موجود ہیں یہ لوگ'' ترت جواب آیا'' خدا ان کی زندگی دراز کرے، لیکن جناب! جو سچا اور کھرا خلوص ماں کی دعا میں ہوتا ہے، وہ کسی اور کی دعا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ماں کی دعا سیدھی جا کر اللہ کی رحمت سے لپٹ جاتی ہے اور پھر اسے گدگدا کر اپنی بات منوا ہی لیتی ہے...... نہیں نہیں، میں اس دعا کی ڈھال سے محروم ہو کر کسی خطرے سے پنجہ نہیں لڑا سکتا، میں اب کسی صورت پائلٹ کی نوکری نہیں کر سکتا'' ۔نوجوان نے بھیگی آنکھوں اور لرزتی آواز کے ساتھ اپنا فیصلہ اس وثوق کے ساتھ سنا دیا کہ تعزیت کرنے والوں کے لئے وہاں سے اٹھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مائل بہ کرم کرنے والی ماں کی دعا کا خود مجھے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔ میری عمر آٹھ دس برس ہو گی جب مجھے ایک مہلک مرض نے آلیا جو حکیموں کے نزدیک لاعلاج قرار پایا۔ مرض کی شدت سے میں دن بھر بے چین رہتا البتہ رات کو کچھ دیر کے لئے میری آنکھ لگ جاتی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہر شب نماز عشاء کے بعد میری والدہ میری چارپائی کے بازو کے ساتھ اپنا مصلا بچھا لیتیں اور بعض اوقات رات بھر نوافل اور دعاؤں میں مشغول رہتیں۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ چہرے پر قدرے حرارت محسوس ہونے پر جب سوتے میں میری آنکھ کھلتی تو میں دیکھتا کہ میری پیشانی پر والدہ کے ہونٹ پیوست ہیں اور ان کے آنسوؤں کی گرم گرم پھوار میری آنکھوں کے پیمانے لبریز کر رہی ہے۔ والدہ کی ان دعاؤں کی معجز نمائی دیکھئے کہ عزیزوں اور معالجین کے اندیشوں کے باوجود میں نے دو ماہ کی جاں گسل تکلیف کے بعد اپنے مہلک مرض سے مکمل شفا پائی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری والدہ مرحومہ ان پڑھ تھیں، تاہم انہوں نے ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے ان کے ایام وفات تک، میں نے ان کی صبح کی تلاوت قرآن مجید میں کبھی ناغہ نہ پایا۔ عمر ڈھلنے سے پہلے ایک عرصے تک ان کا یہ معمول رہا کہ سردی ہو یا گرمی، وہ رات کے پچھلے پہر اٹھ جاتیں، پھر تہجد کے نوافل کے بعد ہتھ چکی پر بیٹھ جاتیں اور روزانہ ضرورت کے مطابق آٹا پیسنا شروع کر دیتیں جس کے ساتھ ہی وہ سورہ رحمٰن کی تلاوت کا آغاز بھی کر دیتی جو انہوں نے زبانی یاد کر رکھی تھی۔ وہ ماشاء اللہ بہت خوش الحان تھیں میں آخر شب کے سناٹے میں جب چکی کی گھمر گھمر کے ساتھ سورہ رحمٰن کا ملکوتی آہنگ ان کی خوش آوازی میں ڈھلتا تو بعض اوقات میری آنکھ کھل جاتی۔ بے اختیار ہو کر میں ان کی سمت دیکھتا تو یوں لگتا جیسے آٹا پس پس کر چکی کے حلقے میں ایک نورانی آبشار کی صورت میں گر رہا ہے۔ (قارئین! ملوں کی آتشیں پسائی سے جھلسے ہوئے آٹے کے اس دور میں اس نورانی آٹے کا تصور کس قدر دلدوز ہے!)

مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے مزید تعلیم کے لئے گھر سے بیس میل دور شہر کے ہائی اسکول اور اس کے ہوسٹل میں داخلہ لینا پڑا۔ ہفتہ وار تعطیل کے دن جب میں ٹرین پر گھر آتا عموماً والدہ کو باہر کے دروازے کے پاس پیڑھی ڈالے اپنا منتظر پاتا۔ میں قریب آکر سلام کرتا اور وہ میرے بالوں کی مانگ کو بچاتے ہوئے ہولے سے میرے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتیں، اور پھر اندر جا کر میری خاطر بنائی ہوئی تازہ مٹھائی یا شیرینی میرے سامنے لا کر رکھ دیتیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہائی اسکول کی دو سالہ بیرونی تعلیم کے دوران ان کا ہمیشہ یہی معمول رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جب مجھے روزگار کی خاطر فوج میں بھرتی ہو کر گھر سے سینکڑوں میل دور لکھنو جانا پڑا تو دم رخصت ان کی پلکیں ضرور نم ہوئیں، لیکن والدہ نے مجھے گھر سے طویل دوری کی اداسی سے بچانے کی خاطر، آنسو بہائے نہ گلے سے لگا کر پیار کیا؛ جیسے میں پھر ایک مرتبہ اپنے ہائی اسکول والے شہر ہی جا رہا ہوں۔ لکھنو میں میرے قیام کے دوران وہ بہت باقاعدگی کے ساتھ مجھے خط لکھواتیں جو بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتمل ہوتے، لیکن ان کے اندر ممتا کی بہت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑی دنیا آباد ہوتی، مثلاً ایک خط میں انہوں نے لکھوایا کہ تمہارے لیدر شوز کا تلا ربڑ کا ہے جس کی وجہ سے تمہارے پاؤں گرمیوں میں گرم رہتے ہونگے اور سردیوں میں سرد، لہٰذا یہ جوتے کسی ضرورت مند کو دے دو اور اپنے لئے چمڑے کے تلے والے جوتے جلد خرید لو۔ گھر میں خدا کے فضل سے مجھ سے محبت کرنے والے اور بھی کئی افراد تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا خیال ایک ماں ہی کو آ سکتا تھا!

یہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میں فوج کی مختصر مدت کی نوکری ترک کر کے گھر واپس آیا تو رات آنے پر والدہ نے میرے لئے ایک مکمل نیا نویلا بستر بچھایا اور کہا کہ اس بستر کی ہر چیز میں نے خود پیسے جوڑ جوڑ کر خریدی ہے اور اپنے ہاتھ سے سب کچھ سیا اور تیار کیا ہے، پھر ہنس کر بولیں: "جگراتوں کے ساتھ"...... قارئین! بات بہت چھوٹی سی ہے، لیکن کیا کروں کہ لاتعداد موجود آسائشوں کے باوجود میں اس کھدر کے لحاف اور تکیے کی مخملیں آسائش کو نہیں بھلا سکتا جس کے بخیوں میں ایک ماں کے ملکوتی ہاتھوں کا لمس شامل تھا۔

بیٹوں کی شادیوں کے بعد ماں کو ایک نئے رول سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس میں ساس بہو کی لڑائی کا وہ عالمی فیچر بھی اپنا رنگ دکھاتا ہے جو بعض اوقات پہلے ان بن، پھر کھٹ پٹ اور آخر میں چخ چخ کی صورت اختیار کر کے ہمسایوں کے لئے لطف اندوزی کا باعث ہو جاتا ہے، تاہم اسے والدہ مرحومہ کی شرینی طبع کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا کہ ان کی وفات تک اگرچہ ہم دو بھائیوں کی شادیوں پر کم و بیش تیس پینتیس برس گزر چکے تھے، لیکن اڑوس پڑوس والوں کا ہمارے گھر کے بارے میں ہمیشہ یہی تاثر رہا کہ یہاں ہماری والدہ دو بہوؤں کے بجائے دو بیٹیوں کے ساتھ بس رہی ہے۔

اپنی وفات سے ڈھائی تین ماہ پہلے والدہ کو جگر کے سرطان کا تکلیف دہ مرض لاحق ہو گیا۔ بیماری کی شدت میں اضافہ ہوا تو وہ چارپائی سے لگ کر رہ گئیں۔ سرطان کے درد سے اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے، یہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے، تاہم میں نے اذیت کی انتہا کے باوجود، دم آخر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک، والدہ کے منہ سے کبھی ہلکی سی کراہ بھی نہ سنی۔ درد کی زیادتی کے دوران ان کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگتے، انگلی آسمان کی طرف اٹھ جاتی، اور وہ شفقت کے عالم میں پاس بیٹھے عزیزوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگتیں یا ان کے گال سہلانے لگتیں۔

ایسے میں کئی مرتبہ میں نے فرطِ غم سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو ان کے ہاتھوں پر ملنا چاہا، لیکن وہ اس کا موقع ہی نہ دیتیں، بس تیزی کے ساتھ اپنا سر بالیں سے اٹھاتیں اور میرا ماتھا چوم لیتیں۔

بیماری کی شدت کے دوران بھی وہ کسی کو اپنی خدمت کی زحمت نہ دیتیں۔ اپنی وفات سے دو ہفتے پہلے ان کے لئے نقل و حرکت دوبھر ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار رات کو جب انہیں رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوتی تو گھر کے کسی فرد کو آواز دے کر جگانے کے بجائے، وہ خوشی کے ساتھ جوں توں کر کے چارپائی سے اترتیں اور پھر دوزانو ہو کر گھسٹتی ہوئی انچ انچ کر کے باتھ روم تک پہنچتیں۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کے ڈھنگ نرالے ہیں، عین ان دنوں جب والدہ کی علالت شدت اختیار کر چکی تھی، خود میں بھی سخت بیمار ہوگیا، حتیٰ کہ مقامی ڈاکٹروں نے مجھے فوراً نشتر ہسپتال ملتان میں داخلے کی ہدایت کی۔ والدہ کو اس حال میں چھوڑ کر گھر جانے کا احساس میرے لئے سوہانِ روح تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے یہ کڑی آخر کار اٹھانا پڑی۔ والدہ محترمہ کی خدمت میں الوداعی سلام عرض کر کے، اور ان کے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح لرزتے ہاتھوں کا پیار سر پر لے کر جب میں گھر سے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھنے کو تھا تو یکا یک گھر کا بیرونی دروازہ کھٹاک سے کھلا، اور اس میں سے والدہ بھاگتی ہوئی برآمد ہوئیں اور پھر اس طرح مجھ سے لپٹ گئیں کہ روتی جاتی تھیں اور میری صحت کے لئے دعائیں کرتی جاتی تھیں۔ یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر میرے علاوہ تمام حاضرین کی آنکھیں بھیگ گئیں، گاڑی چلی تو میرے ہمراہی عزیز بولے: ''حیرت ہے، تقریباً دو ہفتے سے خالہ کے لئے ایک قدم تک اٹھانا محال تھا، اور کہاں یہ عالم کہ بیس تیس گز تک وہ بھاگتی چلی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئیں، نہ معلوم آج یہ طاقت ان کے بدن میں کہاں سے آ گئی!''

''یہ بدن کی نہیں، مامتا کی طاقت ہے بھائی صاحب!'' میرے ایک اور عزیز نے جواب دیا۔

''طاقت یا نعمت؟'' میں نے اندر ہی اندر اپنے دل سے پوچھا۔ اور پھر دل کا جواب آنسوؤں کے سیلاب کی صورت میں امڈ آیا۔

ہسپتال میں دو ہفتے مسلسل علاج کے باوجود میرے مرض پر قابو نہ پایا جا سکا۔ ادھر گھر سے مجھے اطلاع ملی کہ والدہ کی حالت نازک ہو گئی ہے، چنانچہ میں ڈاکٹروں کی رائے کے برعکس گھر واپس چلا آیا۔ والدہ پر اب سخت نقاہت کا عالم طاری تھا، تاہم ان کے لبوں کی خموش حرکت، یعنی اپنے خالق کے ساتھ رابطے کا تسلسل قائم تھا۔ وہ شب ہم نے جاگ کر گزاری۔ صبح ہوئی تو ان کی طبیعت یکا یک سنبھل گئی۔ اس پر گھر کے تمام افراد کو انہوں نے فرداً فرداً تسلی دی۔ دو روز کے فاقے کے بعد دودھ کی چند چمچیاں بھی نوش کیں جس پر سب کو مزید اطمینان ہو گیا۔ ایک میں ہی تھا جس کے دل میں ایک خوف سنسنا رہا تھا کہ یہ شمع کی آخری ٹمٹماہٹ ہے، عصر کے بعد یہ ٹمٹماہٹ مدہم پڑنا شروع ہو گئی۔ مجھے پاس بلا کر فرمایا کہ میری ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے۔ میں نے اپنی چیخ کا گلا گھونٹ کر بھائی بہنوں کو آواز دی، ہم میں کسی نے آنسوؤں سے لبریز آواز میں پوچھا:

''کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟''

''یہاں اپنے پاس اپنے اعمال کو دیکھ رہی ہوں'' والدہ نے نہایت توانا آواز میں جواب دیا۔

''کہاں ہیں آپ کے اعمال؟'' میں نے تیزی سے سوال کیا۔

''ارے یہ میرے دائیں ہاتھ تو کھڑے ہیں، کیا تمہیں نظر نہیں آ رہے؟''

''سبحان اللہ!'' میرے منہ سے سسکی کے ساتھ بے ساختہ نکلا: ''بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد ان کے چہرے پر عجیب تازگی آ گئی، جیسے شبنم سے دھلا ہوا نوشگفتہ پھول...... ایک طویل سانس، جسم کا ہلکا سا ارتعاش، لبوں پر ذرا سا تبسم، آنکھیں آپ سے آپ بند...... ہماری ہچکیاں اور سسکیاں...... اور میرا اگر یہ بے اختیاری کے ساتھ ان کی پائنتی کے پائے سے لپٹ جانا ...... یہ تھا میری جنت کے لٹ جانے کا منظر!

غسل اور کفن دینے کے بعد ان کی میت کو گھر کے صحن میں رکھا گیا۔ کسی نے آخری دیدار کے لئے چہرے سے کفن کی چادر سرکائی تو چہرے کے گرد تقدس کا ہالہ دیکھ کر حاضرین نے شور ماتم کے بجائے بلند آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے، لیکن میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ آنسو صدمے کے ہیں یا اس احساس مسرت کے، کہ میں ایک عظیم ماں کا بیٹا ہوں! بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں میت کی پائنتی کی طرف جا کر والدہ کے تلوے چوم لوں، لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا۔

کیوں مرے لب سے ہوں جنت کے نشاں آلودہ!

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوشبو خوشبوان کا مقام

بشریٰ رحمٰن کا نام اُردو ناول نگاری کی پہچان بنا۔ تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی والدہ نے بشریٰ رحمٰن کی تربیت ہی اس انداز میں کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی شعبے میں نام پیدا کرے۔ بشریٰ رحمٰن نے اپنی والدہ کی دعاؤں کے سہارے ترقی کی بہت سی منازل طے کیں۔ وہ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ کالم نگاری میں نام کمایا اور پھر ناول نگاری ان کی پہچان بنی۔ ان تمام کامیابیوں کا کریڈٹ وہ اپنی والدہ کو دیتی ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ان کی دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

• •

''دارالعرفان'' بہاولپور کے ایک منقش کمرے میں ایک خوبصورت اور دلکش خاتون پلنگ پر سوگوار بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک پیاری سی نومولود بچی تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی، مگر چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ گو وہ بڑی متوکل خاتون تھی اور کفران نعمت بھی نہ کرنا چاہتی تھی، مگر یونہی دل کو ذرا دوسوں نے گھیر لیا تھا۔ وہی عورتوں والی خلش ...... کہ اس بار پھر ایک لڑکی آ گئی۔ اس سے پیشتر دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا بھی جو آٹھ ماہ کا ہو کر فوت ہو گیا۔ جب پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی تو اسے ذرا بھی ملال نہ آیا تھا۔ دونوں میاں بیوی مسرور ہو اٹھے تھے۔ اور خوش ہو کر کہا تھا: یہ ہماری روح کی فرحت ہے..... تو اس کا نام فرحت رکھ دیا گیا۔

دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا: یہ ہماری زندگی کی مسرت ہے..... تب اس کا نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسرت پڑ گیا۔

اور جب تیسری بیٹی آ گئی۔ تو ماں ذرا سی ملول ہو گئی۔ اس ملک میں بیٹیوں کے بوجھ وزنی ہوتے ہیں اور پھر یہ تو پیدا ہوتے ہی جدائی کی نوید سناتی ہیں۔ یہ کلیجے کے پیارے پیارے ٹکڑے کیسے جدا کیے جائیں گے؟

ابھی وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ باہر سے اس کے شوہر اٹھ کر اندر آ گئے۔ بیوی کو گم صم دیکھا تو حیران ہوئے۔ بولے: ''بیٹی کی آمد پر افسردہ ہو رہی ہو؟'' بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک آنسو مژگاں ڈھلک آیا۔ شوہر ہنس کر بولے: ''پگلی کہیں کی! بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ مجھے دیکھو، میں کتنا خوش ہوں۔ اور بچی کی طرف دیکھو کتنی پیاری ہے۔ یہ بچی بہت نصیبوں والی ہو گی۔ یہ دنیا میں تمہارا نام روشن کرے گی۔ میری یہ بات یاد رکھنا۔ اس کا نام بشریٰ رکھیں گے۔ بشریٰ کا مطلب ہے خوش خبری۔ اور یہ بچی ہمارے گھر میں خوش خبری کی پیغامبر بن کر آئی ہے۔ اس کے بعد تمہارے ہاں بیٹے آئیں گے۔''

تیسری بیٹی کا نام بشریٰ رکھ دیا گیا جس کی پیدائش کے بعد تین بیٹے اوپر تلے پیدا ہوئے۔ ہارون الرشید، آصف محمود اور احمد غزالی۔

چھ بچوں کی وہ دلنشین، حسین و جمیل ماں بیگم نصرت رشید تھیں۔ اور ان کے شوہر ابوالعرفان حکیم عبدالرشید جو بہاولپور کی مقتدر شخصیتوں میں سے تھے، عالم دین تھے، وقت کے نباض، فلسفہ اور تصوف کے ماہر، شاہی طبیب اور اللہ والے بزرگ تھے۔

نصرت رشید سے پہلے وہ نصرت رعنا تھیں اور رعنائی کا پیکر تھیں۔ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ 1930ء میں یہیں سے میٹرک کیا۔ اور 1931ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم کا امتحان پاس کیا اور 1932ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ پنجاب کی ہواؤں نے انہیں حسن کے پیمانے پر تول تول کر سنوارا تھا...... شہابی رنگت، کتابی چہرہ، خوبصورت ذہین آنکھیں، شہزادیوں ایسی کشادہ پیشانی، کھڑی ناک، بھرے بھرے گداز ہونٹ کہ شعر ان پر ٹھیک بیٹھے۔ لمبے لمبے سنہری بال،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درمیانہ قد، چال میں وقار، گفتار میں سحر...... بات بات میں ہنسنا، دوسروں کو ہنسانا...... جہاں بیٹھتیں وہیں پھول اٹھتے...... جہاں سے اٹھ جاتا اپنی شخصیت کی خوشبو چھوڑ جانا۔

مگر قسمت ان کو بہاولپور کے ریگزاروں میں لے آئی۔ یہاں ایک درویش صفت شہنشاہ رہتا تھا۔ اس کی پہلی بیوی بھی تھی اور تین بچے بھی تھے۔ ان کے بیاہ کی کہانی بھی عجیب ہے۔

حکیم صاحب بہاولپور میں رہتے تھے۔ نواب آف بہاولپور کے دربار شاہی سے منسلک تھے۔ انہوں نے وہیں بیاہ رچا لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی بیگم ڈولی ہی سے ایک ایسا مرض لائی ہیں جو لاعلاج ہے۔ کافی عرصے تک خود حکیم صاحب ان کا علاج کرتے رہے۔ ان سے نباہ کرتے رہے۔ اس عرصے میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

اس کے بعد اس نیک خاتون نے حکیم صاحب کو دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ اس کو اپنے بچنے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور اتنا بڑا گھر سنبھالنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

حکیم صاحب اس مقصد کے لئے لاہور تشریف لے گئے...... وہ اپنے خوابوں کی پری ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ان کا قیام ہمیشہ حضرت داتا گنج بخش ؒ کے آستانہ عالیہ پر ہوا کرتا۔ وہاں انہوں نے استخارہ کیا۔ خواب میں انہیں ایک محلے کا ایک گھر دکھایا گیا جس میں ایک خوبصورت دوشیزہ کی جھلک دکھائی گئی۔

سو حکیم صاحب نے اس گھر تک رسائی حاصل کی...... اور نجیب الطرفین دوشیزہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس وقت حکیم صاحب اور اس دوشیزہ کی عمر میں تقریباً پچیس برس کا فرق تھا، لیکن مقدر کے لکھے نے انہیں نصرت رعنا سے نصرت رشید بنا دیا۔

نصرت رشید کو ادب و شاعری سے گہرا ربط تھا۔ ان کے گھر کا ماحول ادیبانہ اور صوفیانہ تھا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری میں دلچسپی لیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنا شروع کر دیے۔ نوعمری کے شعر ان کی دلی کیفیات کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان میں مجازی رنگ اور رومانوی عنصر زیادہ تھا۔ ان کی آواز بہت دلکش تھی اور گانے کی شوق بہت تھا۔ کہیں شادی بیاہ ہو...... ڈھولک بجاتیں، شعر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سناتیں، آواز کا جادو جگاتیں۔ خوبصورت اور قیمتی لباس پہننے کا بہت سلیقہ تھا۔

مگر جب بیاہ کر پیا کے گھر آئیں تو صرف بیوی بن کر رہ گئیں۔ بہاولپور میں ان کی آمد نے ہر حلقے کو چونکا دیا۔ اکثر تو ان کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ پھر حکیم صاحب ان کو اپنے آبائی گاؤں لے گئے، جو بہاولپور سے تیس میل آگے ہے۔ گاؤں کی سادہ لوح عورتیں تو انہیں انسانی پیکر ماننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ بڑی جلدی مشہور ہو گیا کہ شہر سے حکیم صاحب ایک پری لائے ہیں۔ بقول ان کے...... ''کئی عورتیں مجھے ہاتھ سے چھو کر دیکھا کرتیں، آیا میں سچ مچ کی عورت ہوں...... ''واہ! پانی پیتی ہے تو گردن سے صاف نظر آتا ہے۔'' یہ ان کے ریمارکس ہوا کرتے تھے۔

اب سب باتوں کے ساتھ ایک اور بات بھی زیر بحث آتی کہ عمر کا اتنا فرق ہے، نباہ کیسے ہو گا؟ میں نے اس وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ مقدر کا اشارہ خدا کا اشارہ ہے۔ عقبیٰ میں مقام بنانے کے لئے شوہر کے قدموں میں جگہ بنانی ہو گی۔ زندگی ایثار اور قربانی کا نام ہے۔ دوسروں کے لئے جینا اور دوسروں کے کام آنا ہی زندگی کی معراج ہے۔''

پہلے دن جو شوہر کے سامنے انہوں نے سر جھکایا تو پھر مرتے دم تک نہ اٹھایا۔ خاوند کی خدمت ہی نہیں کی بلکہ ان کی پہلی بیوی جو اب بستر مرگ پر تھیں، ان کی بھی دن رات خدمت کی...... یہ مثال ہے کہ انہوں نے اپنی سوتن کی خون آلود الٹیاں اپنے ہاتھوں پر تھامیں۔ یہی وجہ تھی کہ مرتے وقت اس نے نصرت کو بلایا اور اپنے تینوں بچے جو جوان تھے، نصرت کے سپرد کئے اور کہا: ''آج سے تم ان کی ماں ہو اور تمہی کو ان کے لئے سب کچھ کرنا ہے۔''

نصرت رشید نے اپنا یہ وعدہ آخری دم تک نبھایا۔ اپنے سوتیلے بچوں کو پڑھایا، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا، پھر ان تینوں کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو گئی۔ بڑی بیٹی منظور شاہین سات سال بعد بیوہ ہو کر آ گئی تو اس کو کلیجے سے لگایا، پھر اپنی ممتا میں چھپا لیا، مرتے دم تک اسے اپنے ساتھ رکھا۔

آج وہ روتی ہے اور کہتی ہے: ''مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ میری ماں، میرا باپ اور میرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شوہر سب ایک ساتھ مرے ہیں۔ اب میں یتیم اور بیوہ ہوئی ہوں۔ پہلے یہ احساس کبھی نہ ہوتا تھا۔"

ان کا سوتیلا بیٹا خورشید احمد ان کی فوتیدگی سے پانچ سال پہلے اچانک فوت ہوگیا تھا۔ اس کا اتنا غم کیا کہ پورا سال اس پر نظمیں لکھتی رہیں۔ پھر ان کی بیوہ اور بچوں کے سر پر اپنا دست شفقت رکھ دیا۔ کیا نہیں کیا ان کے لئے انہوں نے...... قلم بیان نہیں کرسکتا...... سوائے اس کے کہ آج وہ بیوہ اور اس کے بچے چلا چلا کر روتے ہیں اور کہتے ہیں آج ہمارے ابا جی مرے ہیں۔ دادی اماں کی صورت میں ہمیں سب کچھ مل رہا تھا۔"

نصرت رشید کی تمام زندگی ایک مجاہدانہ زندگی ہے۔ جلد ہی انہوں نے بچپن کو الوداع کہہ دیا اور بہت سی وزنی ذمہ داریاں اٹھالیں۔ شوہر کے گھر میں بے شمار ذمہ داریاں بھی تھیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہاں انہیں ایک خوبصورت سا ادبی اور صوفیانہ ماحول بھی ملا۔ حکیم صاحب بڑے متقی، خوش کلام، صاحب ذوق اور مرتبے والے آدمی تھے۔ بہاولپور کی ادبی و مذہبی مجلسوں میں ان کے نام کی گونج تھی۔ بہت سے اخبار و رسائل ان سے مستفید ہوتے تھے۔ جب نصرت رشید کا نام اس گھرانے سے نکلا تو تمام سماجی و ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کی غزلیں نظمیں باقاعدہ چھپنے لگیں۔

سلوک وطریقت کی تمام منزلیں انہوں نے اپنے شوہر سے طے کیں۔ شوہر نے انہیں فلسفہ و منطق پڑھایا، حدیث وقرآن کے درس دیے، اور وظائف سے مالا مال کیا اور کئی چلے کروائے حتیٰ کہ ان کو جوانی میں حج بھی کروادیا۔ حج کرنے کے بعد جب آئیں تو ان کی دلی کیفیات ہی بدل چکی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے نعتیہ کلام لکھنا شروع کردیا۔

اپنے بخت نارسا کو آزمانے کے لئے
دل تڑپتا ہے بہت یثرب کو جانے کے لئے
قافلے والے تو خوش خوش چل دیے سوئے حجاز
رہ گئی مہجور میں آنسو بہانے کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کا نعتیہ کلام ان کا توشہ آخرت ہے۔ان کے دنوں اوران کی راتوں کا گداز اس میں شامل ہے۔وہ عشق کے سچے جذبوں سے سرشار تھیں۔ڈوب کر لکھتی تھیں اور لکھتے وقت باقاعدہ روتی تھیں۔اور جب اپنا نعتیہ کلام محفل میں پڑھ کر سناتیں تو عجز وانکسار کی مکمل تصویر بن جاتیں۔ یوں باادب دوزانو ہو جاتیں جیسے خود ان کی بارگاہ میں ہیں۔رقت طاری ہو جاتی جیسے انہیں اپنی کم مائیگی کا بڑا احساس ہے۔خود بھی روتیں اور ساری محفل کو بھی رلاتیں:

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''دعائے نیم شبی'' کے نام سے چھپ چکا ہے اور دوسرا نعتیہ مجموعہ ''آہ سحر گاہی'' کے نام سے چھپا ہے۔اس کے علاوہ تین اور مجموعے انہوں نے خود ہی ترتیب دے کر رکھے ہیں۔غزلیات کا مجموعہ ''یادیں اور فریادیں'' پنجابی، پوربی اور سرائیکی زبان میں کلام ''راز و نیاز'' اور قطعات ورباعیات کا مجموعہ ''دھڑکن دھڑکن'' انشاء اللہ چھپ کر ایک روز منظر عام پر آجائیں گے۔

بیگم نصرت رشید نے نوجوانی ہی میں اپنے آپ کو شوہر کے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔اگر وہ دن کو دن کہتے تو یہ بھی وہی کہتیں۔ان کا فر ن، ان کی خواہش، ان کی خدمت ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔اس طرح ان کی پیروی تیں جس طرح مرشد کی کی جاتی ہے۔حکیم صاحب نے انہیں طب بھی پڑھائی تھی۔خصوصاً امراض نسواں کے علاج میں ماہر کر دیا تھا۔ان کی وفات کے بعد تک وہ طبابت کرتی رہی تھیں۔

بچوں کے ساتھ انہیں والہانہ عشق تھا۔کسی کو بھی آنکھ سے اوجھل نہیں کر سکتی تھیں، مگر جب ان کے مستقبل کا سوال اٹھا تو سب بچوں کو باری باری لاہور کے ہوسٹلوں میں رکھنے پر آمادہ ہو گئیں۔ دونوں میاں بیوی کو اس بات کا بہت شوق تھا کہ بچے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں اور ایسے کام کریں جن سے انسانیت کو فائدہ پہنچے......اور اس بات کے لئے کوشاں رہتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی بڑی لڑکی فرحت تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ابھری۔یہی نہیں کہ وہ بہت خوبصورت شعر کہتی ہے بلکہ اس نے فردوس گوش آواز بھی اپنی ماں سے پائی ہے......ان کا ہر بچہ کسی نہ کسی فن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے وابستگی رکھتا ہے۔ کسی نے افسانہ نگاری میں نام پایا۔ کسی نے مصوری، تو کسی نے فن خطابت میں۔

ان کا ایک بیٹا آصف محمود پاک فوج میں ہے۔ اس بات پر خوش ہوا کرتی تھیں کہ میں مجاہد کی ماں ہوں اور یہی میری بخشش کے لئے کافی ہے، مگر زندگی بھر جو کچھ خود انہوں نے کیا، وہ ان کی سات پشتوں کی بخشش کو کافی ہوگا۔ بے ریا زندگی پاک ومطہر کردار، بے غرض خلوص، صاف ستھرا باطن، بے ضرر وجود، کانٹوں سے پاک زبان، انتھک جذبہ خدمت...... خدمت اپنوں کی، غیروں کی...... دشمنوں کی، دوستوں کی۔ اور زندگی بھر کی عبادت!...... عبادت میں ان کو سکھ ملتا تھا۔ شادی کے فوراً بعد وہ عبادت گزار بن گئی تھیں۔ صوم وصلوۃ کے علاوہ رات کو اٹھ کر تہجد بھی پڑھا کرتیں۔ مہمان داری اور مہمان نوازی فطرت ثانیہ تھی۔ غریبوں مسکینوں کے لئے گھر میں لنگر کھلے رہتے۔ ایسے میں جب تھک ہار کر سوتیں تو فوراً ہی جیسے کوئی تہجد کے لئے جگا دیتا۔

''امی! آپ کبھی سوتی بھی ہیں۔ جب بھی رات کو آنکھ کھلتی ہے۔ آپ کچھ نہ کچھ کر رہی ہوتی ہیں'' ان کے بچے اکثر حیران ہو کر پوچھا کرتے۔

بہاولپور کی سماجی محفلوں میں اپنے حسن وذوق اور حسن وسیرت کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھیں۔ سماجی فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ دوست نواز تھیں اور بہت جلدی گھل مل جاتیں۔ اسی لئے ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا بلکہ روز بروز بڑھتا رہتا تھا۔

1960 ء میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اور اسی سانحے نے ان کی زندگی کو پلٹ دیا...... اس قدر چاہنے والے، اتنے عظیم اور شفیق شوہر کی جدائی نے انہیں دنیا سے بے نیاز کر دیا۔ خاصا عرصہ بیمار رہیں بلکہ ان کی فوتیدگی کے بعد ہی انہوں نے مسلسل بیمار رہنا شروع کر دیا تھا۔ اس سانحے کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا جس نے ایک حزنیہ انداز اختیار کر لیا بلکہ ہر غزل ہجر وفراق کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے...... لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا کیونکہ اب انہیں میر کارواں بننا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی فرحت ہی بیاہی ہوئی تھی۔ باقی سارے بچے زیر تعلیم تھے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کو منزل پر پہنچانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔

گو دل کی دنیا تاراج ہو چکی تھی مگر انہوں نے کبھی بچوں کو یہ احساس نہ ہونے دیا، البتہ روح کی تنہائی کا گھاؤ بھرنے کے لئے انہوں نے ایک اللہ والے بزرگ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور سلسلہ چشتیہ و نظامیہ سے منسلک ہو گئیں۔ پھر ان کے لیل و نہار ہی بدل گئے۔ دنیاوی پیراہن انہوں نے اتار پھینکا اور اکثر گیروے رنگ کا لبادہ پہنے رہتیں۔ استقامت ان کا خاصہ تھا اور خلوص ان کی فطرت۔ کسی کام میں بد دیانتی انہیں کبھی پسند نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ بد دیانتی اور ریا کاری کرنے کی اہلیت ہی سے محروم تھیں جیسے اللہ نے ان کے وجود کو ان عناصر سے پاک رکھا ہو۔ یوں زندگی کے کڑے کوس طے کرتے کرتے وہ آخری منزل تک آ پہنچیں! یہ آخری امتحان تھا...... آخری آزمائش جس پر انہوں نے لبیک کہا اور چل دیں۔ ان کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ جسم کا روح سے ناتا ٹوٹنے والا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے وہ اس آنے والی گھڑی کی منتظر تھیں۔ طریقے سلیقے سے اپنے بچوں سے کہتی رہتی تھیں تاکہ وہ ذہنی طور پر اس حادثے کے لئے تیار رہیں۔

انہوں نے اپنے سب لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کر دی تھی۔ سوائے چھوٹے بیٹے احمد غزالی کے۔ اس کے بیاہ کا انہیں بڑا ارمان تھا۔ چاہتی تھیں کہ جلدی سے اس کی شادی ہو جائے، مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا، اس لئے یہ فرض انہوں نے اپنی بیٹیوں کو سونپا...... اور اللہ اللہ کس طرح جانے کے لئے تیار ہو بیٹھیں۔

10 اگست کو بہاولپور سے لاہور آئیں، دل کی تکلیف تھی اور چھوٹا بیٹا غزالی انہیں یہاں لے آیا۔ کیونکہ ان کے سارے معالج بھی یہاں تھے اور بیٹیاں بھی یہیں تھیں، لیکن انہوں نے آتے ہی کہا: ''میں علاج کی غرض سے نہیں آئی۔ میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ چند ضروری باتیں کہنے آئی ہوں۔'' پھر انہوں نے بڑے سلیقے سے ایک ایک کو نصیحت کی۔ چار دن لاہور میں رہیں اور چاروں دن عزیز و اقارب کو بلا بلا کر ملتی رہیں۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو گاہے گاہے کوئی وصیت کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتیں۔

بیٹیاں پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر آ رہا تھا ایک جا رہا تھا...... لیکن وہ برابر کہے جاتیں: ''اب وقت ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتے۔''

13 اگست کی شب کو ایک بجے انہیں دل کا زبردست دورہ پڑا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہی طبیعت بگڑ گئی۔ انسانی مساعی جو کچھ کر سکتی تھیں، کیا مگر وقت واقعی پورا ہو چکا تھا۔ 14 اگست کا سارا دن انہوں نے اس طرح گزارا جس طرح لمبے سفر پر جانے والا مسافر تیاری میں گزارتا ہے۔ دل میں اتنا درد تھا کہ سانس لینا دوبھر ہوا جاتا تھا، مگر وہ بالکل ہائے وائے نہیں کر رہی تھیں۔ گو چہرے سے لگتا تھا کہ ضبط کر رہی ہیں۔ گاہے گاہے مسکرا مسکرا کر اپنے بھائی اور بچوں سے بات کر لیتیں۔ کچھ یاد آ جاتا تو کہہ ڈالتیں۔ پھر خاموش ہو جاتیں۔ ڈاکٹر آیا تو اس کے ساتھ خوب باتیں کیں۔

طبیعت میں ایک اضطراب سا آ رہا تھا اور وہ اپنی پل پل کی کیفیت اپنی بیٹیوں کو بتاتی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اب میری ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد کہا: ''اب بازو بھی بے جان ہو گئے ہیں۔'' پھر بھی دیکھنے میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک معلوم ہو رہی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے پانی پیتیں اور خود چل کر غسل خانے میں جاتیں۔

اس وقت بھی خوبصورت الفاظ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھیں۔ انہیں پتہ چل رہا تھا کہ یہ قیدی پرندہ پنجرے سے رہا ہوا چاہتا ہے۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی کوئی نعت گنگناتیں۔ پھر یوں اللہ سے مخاطب ہوتیں جیسے اس کے روبرو کھڑی ہوں۔ حضورؐ سے یوں ہم کلام ہوتیں جیسے اپنے وعدے یاد دلا رہی ہوں...... ڈر، خوف، بے چارگی کچھ بھی تو ان کے چہرے پر نہ تھا۔

انہوں نے بہت پہلے کہہ دیا تھا: ''مجھے ہسپتال مت لے کے جانا۔ میں وہاں سے مر کر آؤں گی۔'' مگر جب ڈاکٹروں نے یہی آخری امید دلائی تو انہیں ہسپتال لے گئے۔ اس وقت انہوں نے بچوں کا دل توڑنا مناسب نہ جانا کہ کہیں ان کے دل میں یہ خلش نہ رہ جائے۔ خاموشی سے اٹھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر چل دیں، مگر چلنے سے پہلے انہوں نے گھر کے سب نوکروں کو خدا حافظ کہا، در و دیوار کو الوداع کہا جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ پھر یہاں نہیں آئیں گی۔ ہسپتال میں وہ اپنے بچوں کو بہت پیار کرنا چاہتی تھیں، مگر زیادہ اظہار نہ کیا۔ وہ اپنی زندگی میں انہیں بلکتا ہوا نہ دیکھ سکتی تھیں۔ ان کی ایک بیٹی مسرت کئی سال سے کینیڈا میں ہے، اسے برابر یاد کرتی اور اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اتنا زادراہ تھا کہ انہیں سفر کی کلفتوں کا ذرہ بھر بھی احساس نہ تھا۔

5 اگست کی صبح اس زعم کے ساتھ طلوع ہوئی کہ وہ اللہ کی ایک پاک امانت کی امین بن رہی ہے۔ اور چپکے سے وہ گھڑی آن پہنچی...... فاصلوں کی گھڑی، جدائی کی گھڑی، فانی جہان سے عدم کو جانے والی گھڑی، اٹل اور سنگدل گھڑی...... اللہ اللہ وہ ان کا جانا...... کتنی خوش دلی سے لے جانے والوں کا استقبال کیا۔ نام بنام انہیں پکارا۔ پیشوائی کو زخمی دل پیش کیا...... دل سے آواز آئی۔

صبا مدینے اگر تو جائے تو لے کے جانا پیام میرا
شہ دو عالم کے آستاں پر ادب سے کہنا سلام میرا

مقدس پنجرہ خالی ہو گیا۔ نور سے معمور پیشانی پر سجدوں کے داغ زندہ تھے۔ پنجرے میں طائر روح کو نہ پا کر بچوں نے ماں ماں پکارا، چلائے، چیخے...... ماں نے بچوں سے ناتا توڑ لیا تھا۔ دنیاوی رشتوں سے منہ موڑ کر وہ اپنی ابدی دنیا میں چلی جا رہی تھی...... جہاں جہاں سے خوشبوؤں کی یہ پالکی گزری، فضاؤں نے پھول برسائے۔

ان کی وصیت کے مطابق انہیں بہاولپور لے جایا گیا جہاں وہ اپنے شوہر کے پہلو میں مدفون ہوئیں...... بہاولپور میں جب عیسائی مشنریوں نے اپنی تبلیغ کے لئے ایک گرجا گھر بنایا تھا تو وہیں اس کے پہلو میں حکیم عبدالرشید نے ایک عظیم الشان مسجد اور درس گاہ بنانی شروع کر دی تھی تاکہ عیسائیت کے غلبے کو اسلام کی برتری اور فضیلت سے روکا جا سکے۔ اس مسجد کو مسجد رشیدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اسی مسجد کے پہلو میں دو چاہنے والے عظیم دل، اللہ کے دو نیک بندے، انسانیت کے علم بردار، وفا کے پیکر، عشق الٰہی کے مبلغ، پہلو بہ پہلو آرام فرما ہے اور دن رات،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نمازیوں کی دعائیں، اللہ کی رحمتیں اور اذان کی آوازیں ان پر نچھاور ہوتی ہیں۔

ایک آیت شریف میں ہے کہ "اگر دنیا کے تمام درخت قلم بن جائیں، اور دنیا کے سارے سمندر سیاہی میں ڈھل جائیں تو بھی باری تعالیٰ کی صفات لکھنے کے لئے ناکافی ہوں گے۔" اسی طرح میں محسوس کرتی ہوں کہ والدین، خصوصاً ماں کے احسانات اور انعام واکرام اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ اگر اولاد اپنی ساری زندگی ان کا شکرادا کرنے پر لگا دے تو بھی کبھی حق ادائی نہیں ہو سکتی۔

اور پھر زخم ابھی تازہ ہے۔ ہر نئی بات پر آنکھ نم ہوئی جاتی ہے۔ بہر حال جانے والوں کی خوبصورت یادیں ہی دل کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ میری امی کی زندگی کے اتنے پہلو ہیں کہ سمجھ نہیں آتا کس پہلو پر لکھوں اور کونسا چھوڑوں۔ وہ اپنی ساری زندگی قندیلیں ہی روشن کرتی رہیں۔ ان قندیلوں کی روشنی نہ صرف ہم تک پہنچی بلکہ خلق خدا بھی ان سے فیضیاب ہوئی۔

اپنی ماں تو ہر نیک انسان کو اللہ کی طرح بے عیب نظر آتی ہے، مگر میرا فلسفہ کچھ یوں ہے کہ باری تعالیٰ نے ہر انسان کا خمیر خیر اور شر سے اٹھایا ہے۔ اور پھر اسے دنیا کی پر خار وادی میں بھیجا جاتا ہے، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ خیر اور شر میں سے کس پر خود حاوی ہو جاتا ہے اور کون اسے مغلوب کر لیتا ہے۔ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے اور یہی کشمکش انسانی کہانی کا طرز تماشا، یعنی۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!

اسی مکر وریا اور نیکی بدی کی دنیا میں وہ ایسے انسان بھیجتا رہتا ہے جو فرشتوں سے بہترین بن کر دکھاتے ہیں کیونکہ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُضِلُّ مَنْ تَشَآءُ کے تحت، وہ جسے چاہتا ہے نور بصیرت عطا کر کے اس دلدل سے باہر نکال لاتا ہے۔

زندگی گزارنے کا صحیح راستہ یہی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر، اس کے بکھیڑوں میں الجھ کر انسان اللہ کے احکام کی پیروی کرے اور دنیا و نفس کے خلاف جہاد کرتا رہے۔ یہی میری امی کا مسلک تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدرت نے انہیں عورت کے پیکر میں ڈھالا تھا۔ عورت بنیادی طور پر ماں ہوتی ہے...... اور ماں ایک ایسی طاقت ہے جو اپنے بچوں کی خاطر زندگی کا ہر اصول قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن ہماری امی چونکہ دیندار عورت تھیں، اس لئے انہوں نے ہماری تربیت ان اصولوں پر کی کہ انہیں مایوس نہ ہونا پڑے۔ وہ شروع دن سے عبادت گزار تھیں حتیٰ کہ حمل کے دوران وہ بہت زیادہ عبادت کرتیں، روزے رکھتیں اور بڑے بڑے چلے کرتیں تاکہ شکم مادر ہی میں بچے پر ان عبادات کا اثر ہو وہ عبادت کو احسان بنا کر نہیں کرتی تھیں نہ لوگوں پر ظاہر کرتیں۔ دُنیا کا کوئی کام عبادت میں حائل نہ ہوتا اور نہ کسی فرض کے راستے میں عبادت حائل ہوتی۔ ویسے بھی ہمارے گھر کا ماحول بڑا مذہبی تھی۔ امی اور ابا جی پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے تھے اور صبح تلاوت کلام پاک کرتے۔ ہمیں وہ پھٹکار کر کبھی نمازیں پڑھنے پر آمادہ نہیں کرتے تھے، بس اتنا کہہ دیتے: ''فجر کی نماز ضرور پڑھا کرو۔ اس وقت لیٹنا ٹھیک نہیں۔ ویسے تو مسلمان گھرانے کا دستور ہی یہ ہونا چاہیے کہ اذان سنتے ہی نماز کی طرف دوڑیں۔'' بس ان کا اتنا کہنا ہی کافی ہوتا تھا۔ نماز پڑھنے والے بچے کی وہ بڑی حوصلہ افزائی کرتے اور اس طرح کرتے کہ دوسرے دن باقی بچے اس کی صف میں شامل ہونا چاہتے...... میرا تجربہ یہ ہے کہ بچے نصیحت اور پھٹکار سے کوئی کام نہیں سیکھتے۔ ہاں اگر ان کو کر کے دکھایا جائے تو وہ فوراً نقل کرتے ہیں۔ اگر والدین نماز پڑھتے ہوں تو بچے خود بخود نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔

ہماری امی کا فلسفہ یہ تھا کہ عبادت وغیرہ انسان کے ذاتی فعل ہیں اور ان کا معاملہ اللہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف دنیا میں رہنے کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ ان کو باقاعدہ ادا کرنا چاہیے۔ رات کو تہجد کے لئے اٹھتیں، نماز پنجگانہ ادا کرتیں اور وظائف بھی پڑھتیں، مگر گھر میں بہت ٹھاٹھ سے رہتی تھیں۔ لیڈیز کلب کی ممبر تھیں، مشاعرے کرواتی تھیں، جلسوں میں تقریریں کرتی تھیں، نفیس و اعلیٰ لباس پہنتی تھیں، بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور ایک بھرپور زندگی بسر کرتی تھیں...... دنیا سے ان کا جی ابا جی کی وفات کے بعد اچاٹ ہو گیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جتنی زیادہ وہ عبادت کرتی تھیں، اتنا ہی حقوق العباد کا خیال رکھتیں۔ان کا کہنا تھا کہ اگر انسانوں کے حقوق ادا نہ کیے جائیں تو ساری عبادت ضائع ہو جاتی ہے۔ان کے سوتیلے بچے ان کے ساتھ رہتے۔ ہمیشہ کوشش میں رہتیں کہ ان کا کوئی حق رہ نہ جائے۔اس سے بڑی اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ہمیں کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہمارے سوتیلے بہن بھائی ہیں۔بات کسی کے سامنے کہی نہ کبھی ان کی شکایت کی۔آج تک ہم سب بہن بھائی اسی طرح شیر و شکر رہتے ہیں۔کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ سگے یا سوتیلے ہیں۔سوتیلے رشتوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرنا ایک عام عورت کے بس کی بات نہیں۔یہ کوئی بہت دل والی اور اللہ والی خاتون ہی کر سکتی ہے ...... پھر اباجی کی وفات کے بعد انہوں نے فوراً ہی جائیداد تقسیم کر دی۔گھر بار میں سے بھی سب بچوں کو شریعت کے مطابق حصہ دے دیا اور بارہا ہر ایک سے پوچھا آیا وہ خوش ہیں۔ان کو کوئی شکایت تو نہیں؟

اس کے علاوہ بھی وہ غریب رشتے داروں اور ہمسایوں کا بہت خیال رکھتیں۔محلے کے غربا پر نظر رکھتیں۔زکوٰۃ وغیرہ خود ان کے گھروں میں جا کر دیتیں۔ضرورت مند کو کبھی خالی واپس نہ کرتیں۔مسافروں کو کھانا کھلاتیں۔

بیمار کی عیادت کو خود جاتیں۔کہیں فوتیدگی ہو جاتی تو چاہے واقفیت نہ ہو پرسہ دینے ضرور جاتیں۔اور کہتیں کسی کا دل رکھنا بھی ثواب ہے...... کسی کا دکھ سننا، اس کے ساتھ آنسو بہانا، قرض دے دینا، آسرا دے دینا (خواہ خود نقصان اٹھانا) کسی کے لئے سفارش کرنا، کسی کو نوکری دلوا دینا وغیرہ...... ان سب باتوں کو وہ حقوق العباد میں شامل کرتی تھیں اور ہمیشہ ہمیں تلقین کرتیں کہ ان سے غافل نہ رہنا...... سب نیکیاں ضائع چلی جائیں گی۔

انہوں نے ہمیشہ اللہ کی بندگی کی اور اطاعت اپنے شوہر کی...... شوہر کو وہ صحیح معنوں میں مجازی خدا سمجھتی تھیں اور کہتی تھیں اللہ صرف عبادت ہی نہیں دیکھتا، یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے فرمان کو پورا کیا ہے یا نہیں۔اباجی خاصے زبردست آدمی تھے۔تمام تر محبت و شفقت کے باوجود وہ اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات منوانے کے عادی تھے اور امی نے کبھی ان کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ بس ہم تو یہ دیکھتے تھے کہ اباجی کے سامنے وہ یوں ان کا ہر حکم بجالاتیں جیسے انکار یا احتجاج کا لفظ ان کی لغت میں نہیں۔

ہم سب بہنوں کی شادیوں میں بھی انہوں نے ہمیں یہ نصیحت کی ...... ''میں نے تمہیں زیور علم سے آراستہ کیا ہے جس قدر ممکن تھی تعلیم دلوائی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خودسر بن جاؤ۔ شوہر کے دل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے اس کا مطیع ہونا پڑتا ہے۔ اس سے نہ صرف تمہاری عاقبت سنور جائے گی بلکہ خدا اور اس کا رسول بھی خوش ہوں گے۔'' وہ شوہر کی شکایت کرنے کو بھی برا جانتی تھیں۔ اگر کوئی عورت ان کے گھر آ کر ایسا کرتی تو اسے نصیحت کرتیں کہ ''یوں اپنے آپ کو گناہ گار نہ کرو۔ شوہر کا پردہ رکھو کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی بندوں کو پسند کرتا ہے۔''

وہ ہمیشہ نصیحت کرتی تھیں کہ تمام عزیز و اقارب کا حسب مراتب احترام کرنا چاہیے، خصوصاً ساس اور سسر کا...... بلکہ ہم سے کہا کرتی تھیں کہ اب وہی تمہارے ماں باپ ہیں، مجھے خوشی تب ہو گی جب میں ان کے منہ سے تمہاری تعریف سنوں گی۔

کینہ، بغض، عداوت، غیبت سے کوئی خاکی انسان مستثنیٰ نہیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ضرور ملتا ہے۔ کینہ اور بغض وہ دل میں رکھ ہی نہ سکتی تھیں۔ برا کہنے والوں سے انہیں کبھی کوئی شکوہ نہ تھا اور جواب میں وہ برائی اس لئے نہیں کرتی تھیں کہ اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ ہر بات کو بڑے صبر کے ساتھ سہ جاتی تھیں۔ ان کو غیبت کی بھی عادت نہ تھی۔ میں نے بہت سی مائیں دیکھی ہیں جو اپنے بچوں کو پاس بٹھا کر اپنے شوہر یا ساس نند کے مظالم کے قصے سناتی ہیں اور بچوں کو ان رشتوں سے متنفر کر دیتی ہیں...... ہماری امی نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہوش سنبھال کر کسی بھی رشتے کو برا نہیں جانا...... البتہ رفتہ رفتہ پتہ چلتا گیا کہ کون کیا ہے اور کتنے پانی میں ہے؟ اس پر بھی کبھی ہم نے زبان کھولی تو انہوں نے کہا: ''تم ابھی بچے ہو، اس معاملے میں دخل نہ دو۔''

وہ سچی مومن عورت تھیں، اس لئے ان کے دل میں کبھی میل نہ رہتا تھا۔ خفگی کو بھول جاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھیں۔ جلدی معاف کر دیتیں۔ تعصب نہیں رکھتی تھیں اور نہ انہیں منافقت آتی تھی کہ دل میں غصہ رکھ کے کسی سے ملیں۔ جب بھی ملتیں، خندہ پیشانی سے ملتیں۔

اس دنیا کا ہر فرد حسد کا شکار ہے، مگر میں نے صرف امی ہی دیکھی تھی جنہیں کبھی کسی سے حسد نہیں ہوا تھا۔ حسد کیا ہوتا ہے وہ جانتی ہی نہ تھیں...... ''حسد انتہائی فاسد جذبہ ہے جو انسان کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا......'' وہ لوگوں کو سمجھایا کرتیں...... حالانکہ وہ ایک سوتن والے گھر میں آئیں۔ عمر بھر سوتیلے بچے ساتھ رہے، مگر مجھے کبھی کسی بات سے پتہ نہ چلا کہ امی کو کسی سے حسد ہوا ہے۔ اس بات سے میں نے یہ جانا ہے کہ جو شخص حسد جیسے جذبے پر غالب آجاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ قناعت جیسی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ پھر ساری دنیا اس کے آگے ہیچ ہو جاتی ہے۔ حسن، دولت، اقتدار، ہوس، آسائشیں، وہ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے، جیسے میری امی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس شخص کو دینی خوبصورتیوں سے نوازتا ہے۔

زمانہ سازی، افترا، امی کو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ جب کسی کے ایسے حربوں سے گھائل ہوتیں تو دکھ سے کہا کرتیں: ''میں اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے لوگوں کی سمجھ نہیں آتی۔ اچھا، میرا اللہ تو جانتا ہے۔''

سخاوت ان پر ختم تھی۔ کوئی اگر تن کے کپڑے بھی مانگتا تو فوراً دے دیتیں۔ ضرورت مندوں کا ان کے گرد ہجوم رہتا۔ کئی غریبوں اور یتیموں کے ماہانے مقرر کر رکھے تھے۔ جمعرات کا دن عام فقیروں کے لئے وقف تھا۔ اللہ کی راہ میں خیرات کر کے انہیں بہت خوشی ہوتی تھی...... عبادت کی طرح سخاوت کرتیں اور لوگوں کو بہت زیادہ تحفے تحائف دیتیں۔

''کر تواضع کہ ہو تسخیر یہ عالم سارا'' یہ ان کا مطمح نظر تھا۔ مہمانوں کی آمد سے بہت خوش ہوتیں۔ بہت زیادہ خاطر تواضع کرتیں بلکہ خود ہی بھاگ دوڑ کرنے لگ جاتیں۔ آخری عمر میں جب بہت لاغر ہو گئی تھیں۔ بھاگ بھاگ کر آؤ بھگت کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ جو بھی گھر میں آتا، اسے کھانا کھلائے بغیر نہ بھیجتیں۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتیں، ہنس ہنس کر باتیں کرتیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

......ہلکی پھلکی اور مزاح سے بھرپور باتیں۔ بیچ بیچ میں بڑے پتے کی بات کہتی جاتیں۔ روایتی عورتوں کی طرح وہ گھریلو تنازعات، الجھنوں اور انجشوں کا ذکر لے کر کبھی نہ بیٹھی تھیں۔ زیادہ تر ادبی یا پھر مذہبی قسم کی گفتگو کرتیں ورنہ اپنے شعر سناتیں اور ہمیشہ گا کر سناتی تھیں۔ جس طرح دل سے لکھتی تھیں، اسی طرح سوز سے پڑھا کرتیں۔

رحم دل بہت تھیں۔ جلد ہی کسی پر ترس آجاتا، آنسو نکل آتے۔ جلد ہی کسی کو بیٹا یا بیٹی بنا لیتیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی تھی۔ کبھی کسی کو حقارت سے مخاطب کیا نہ کسی دنیاوی بات پر غرور کیا۔ ہمیشہ عجز و انکسار سے ملتیں حتیٰ کہ اپنے بچوں سے بھی بڑے انکسار سے پیش آتیں۔

ان میں صبر و تحمل بہت تھا۔ اپنی ذات پر جبر کرنا خوب جانتی تھیں۔ ضبط ایسا تھا کہ ہم نے آج تک کسی میں دیکھا نہ سنا، گویا نفس کشی کی ہر منزل سے آشنا تھیں، اسی لئے ان کے پیش نظر کبھی اپنی ذات نہ ہوتی تھی، ہمیشہ دوسرے یا دوسروں کی فلاح و بہبود!

اللہ اللہ کیا تھیں وہ ہستیاں بھی جو محض دوسروں کے لئے زندہ رہنے کو آئیں......جنہوں نے صرف اتنا کھایا جو زندہ رہنے کے لئے ضروری تھا۔ کبھی کسی کی حق تلفی نہ کی۔ کبھی اپنی زبان سے کسی کو دکھ نہ دیا۔ کبھی کسی پر الزام نہ دھرا۔ کبھی کسی کا عیب نہ اچھالا۔ کبھی خود غرضی سے پیش نہ آئیں۔

''ای انسان کو کبھی کبھی ضرور خود غرضی سے کام لینا چاہیے۔'' ہم سمجھاتے اور وہ کہتیں: ''میں اس کی اہل نہیں بیٹا! میں اپنی کسی غرض کا غلام نہیں۔ میرا دل ہی سب کرنے کو نہیں چاہتا۔''

میں سوچتی ہوں اللہ نے انہیں کس خمیر سے بنایا تھا۔ کتنی جلدی سے انہوں نے یہ ساری منزلیں طے کرلیں۔ تزکیہ نفس کی منزلیں......اتنا عرفان، اتنی آگہی......خداوندا! کیا ہم کبھی ان کے قدموں کی خاک کے برابر ہوسکیں گے؟ ایثار ان پر ختم تھا۔ زندگی میں ہر ایک کے لئے انہوں نے ایثار کیا، لیکن خود دکھ اٹھائے حتیٰ کہ بیماری میں بھی یہ ظاہر نہ کرتی تھیں کہ وہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر کی ہزار تاکیدوں کے باوجود اٹھ کر بیٹھ جاتیں......اور نہیں تو لکھنے کا کام شروع کردیتیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیٹھنے اور لیٹنے سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھیں: ''ساری عمر قبر ہی میں لیٹنا ہے...... آرام وہاں ملنا چاہیے۔ اپنے ہاتھ سے کام کر کے انہیں راحت ملتی تھی۔ کسی کام کو بھی معیوب نہیں سمجھتی تھیں۔

ہر رمضان المبارک میں وہ اعتکاف میں بیٹھا کرتی تھیں۔ ادھر عید کا چاند نظر آتا، ادھر ہم ان کی زیارت کو لپکتے۔ اس بار وہ کیسے معتکف ہوتیں کہ رمضان سے دو دن پہلے پردہ کر لیا اور پھر چاند نکلا، عید آئی...... وہ رخ انور نہ دیکھا۔ تشنہ آنکھیں ہنوز آسمان کو دیکھتی ہیں۔ کتنے چاند نکلیں گے، کتنی عیدیں آئیں گی؟...... دم آخر تک یہ آنکھیں اس چاند کو ڈھونڈیں گی جو پردے میں ہو گیا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ماں!...... میری عظیم ماں!...... مجھے معاف کر دینا۔ تیرے نام پر میری آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ لمحے مجھے ڈسنے لگتے ہیں...... ماں! میری آنکھیں ہمیشہ باوضو ہو کر تجھے یاد کرنا چاہتی ہیں۔ لوگ آ کر مجھے احساس دلاتے ہیں کہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہے...... تو تو ہماری دھڑکنوں میں ہے، رگ رگ کی حرارت میں، تنفس کی ڈوری میں ہے...... اگر آنکھ سے اوجھل ہو گئی تو کیا۔

یہ مری نظر کا قصور ہے کہ تو پاس رہ کے بھی دور ہے
یہ مرا ہی شوق ہے درمیاں تجھے احتیاط نقاب کیا

میں اپنی بہنوں سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں...... بہنوں ہی سے نہیں بلکہ بھائیوں اور بچوں سے بھی...... جن جن کی نظر سے بھی یہ مضمون گزرے...... کہ والدین اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ اگر آپ اتنے خوش قسمت ہیں کہ ان دونوں کا سایہ نصیب ہے تو جی بھر کے ان کی خدمت کیجئے اور اگر ان میں سے ایک سلامت ہے تو اس کی خوشنودی اپنا ایمان بنا لیجئے...... اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر کوئی بدنصیب دونوں سے محروم ہے تو وہ اپنی ساس، سسر یا کسی بھی بزرگ پر احسان کرے۔

یاد رکھیں دنیا میں پھلنے پھولنے کے لئے والدین کی دعا بہت ضروری ہے۔ والدین کی یا بزرگوں کی دعا ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کا کوئی مول نہیں۔ اس سے بڑا کوئی مسیحا نہیں، کوئی دوا نہیں، کوئی توڑ نہیں...... یہ دعا ایک ایسی چھایا ہے جو آپ کو دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کر دیتی ہے بلکہ قیامت تک آپ پر ایک سائبان بن کر چھائی رہتی ہے...... اگر آپ دنیا میں عزت و مرتبہ چاہتے ہیں تو وہ والدین کے قدموں میں تلاش کریں!

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چراغ آخر شب

یونس جاوید اُردو افسانے اور ڈرامے میں ایک بلند مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ انہوں نے ''اندھیرا اجالا'' ڈرامہ لکھ کر خوب شہرت پائی۔ اس ڈرامے کے بعد ان پر عزت اور شہرت کے تمام دروازے بیک وقت کھل گئے۔ اندھیرا اجالا کے علاوہ بھی انہوں نے کئی لازوال ڈرامے تحریر کیے۔ جنہیں بے حد پسند کیا گیا۔ اُردو افسانے کو انہوں نے ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ یونس جاوید کا کہنا ہے کہ اگر ماں کا دیا ہوا حوصلہ نہ ہوتا تو میں کسی بند گلی میں منجمد ہوتا۔ اپنی والدہ ماجدہ پر لکھے ان کے اس مضمون نے ان کے مقام کو مزید رفعت عطا کی ہے۔

••••••••••••••••••••••••

انہوں نے من بھر کا گٹھڑ میرے سامنے لڑھکایا اور تیزی سے بولیں: ''اٹھاؤ، پہنچاؤ۔''

''میں...... اکیلا؟'' رک کر میں نے کہا: ''اٹھالوں گا میں؟''

''ایسے وقت میں آدمی پہاڑ اٹھالیتا ہے۔ تجھے احساس ہی نہیں اس وقت کا...... اٹھا!''

''اماں......!'' میں منمنایا

''خبردار جو ایک لفظ بھی کہا! آگے بڑھو۔'' مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔ ''گھر میں آگ لگی ہو تو کمسن جوان، اور جوان نوجوان ہو جاتے ہیں، اور ہو رہے ہیں۔ تم کس مٹی کے بنے ہو کہ جہاد نے تمہارے اندر جھرجھری تک پیدا نہیں کی؟ بائیسویں میں جا رہے ہو۔ تمہیں تو......''

میں نے پورا زور لگا کر گٹھڑا اٹھایا تو اماں رک گئیں مگر جب گٹھڑ کندھوں تک پہنچایا تو وہ گر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑا۔ تب انہوں نے بات بدل دی...... ''اچھا...... یوں کرتے ہیں ایک کے دو بنا لیتے ہیں......'' وہ جلدی جلدی پرانے کپڑوں اور کچھ نئی چیزوں کے پیکٹوں کو آدھا آدھا کر کے دو گٹھڑیوں میں باندھنے لگیں، مگر ان کی زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

بولیں: ''تمہارے دادا انچاس برس کے تھے کہ دنیا چھوڑ گئے...... ریلوے کے بڑے افسر ...... ساتھ زمینداری بھی تھی، اسی لئے حلال کھا کر جائیداد بنائی، عزت کمائی، مگر خدمت کو عظمت سمجھا۔ مسجد مبارک میں جمعہ کا خطبہ بھی دیتے تھے، افسری بھی کرتے تھے۔ اور لوگوں کے لئے ان کے پاس سبھی کچھ تھا۔ وقت بھی، پیسہ بھی۔

''اماں! وہ خطبہ مسجد میں دیتے تھے اور افسر بھی تھے؟'' مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

''ان دنوں یہی رواج تھا۔ شرفا فخر سے اپنے محلے کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ ہمارا گھر بھی تو مسجد مبارک کے پاس تھا نا......'' وہ کچھ سوچ کر بولیں...... ''جیسے غلام رسول میر ہمارے محلے کی مسجد احمد علی میں امامت کراتے تھے۔ اے جی آفس کے سب سے بڑے افسر نہ سہی مگر دوسرے نمبر پر ضرور آتے تھے۔ یا پھر......'' انہوں نے کئی شرفا کے نام گنوا دیے۔

''پتہ نہیں...... میں تو نانا کو جانتا ہوں...... جو یہ سب کرتے رہے ہیں۔'' میں نے بڑ بڑاہٹ کے انداز میں کہا۔

جلدی جلدی انہوں نے دو گٹھڑ بنا لیے۔ تب سائرن ہو گیا اور وہ مجھے کھینچ کر چوکھٹ کے بالکل نیچے لے گئیں۔ یہ ستمبر 1965ء تھا۔ سائرن کلیئر ہوا تو دوبارہ کھینچ کر باہر لے آئیں اور بولیں ''ہندو سے پالا پڑا ہے بچے! ذرا سی سستی الٹ پلٹ کر سکتی ہے۔ پتہ ہے تمہارے نانا نے تحصیلداری چھوڑ دی تھی۔ شملے میں تھے، ہندو افسر سے لڑ پڑے کہ اس نے مسلمانوں کے نام پر پھبتی کس دی تھی۔ بس عمر بھر کے لئے لوٹ آئے۔ مفت بچے پڑھائے، مگر نوکری کو غلامی سمجھا کہ ہندو تھا یا انگریز۔ چلو فی الحال تم یہ گٹھڑیاں پہنچاؤ...... میرے پاس وقت کم ہے۔''

یہ کپڑے پرانے تھے جو لاہور کے سرحدی دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے تھے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نئی اشیاء کے پیکٹ محاذ پر لڑنے فوجیوں کے لئے۔ آج 9 ستمبر تھا۔ ان کے لئے عید کی سی گھما گھمی تھی۔ سائرن ہوتا تو مجھے اور بہن کو کھینچ کر کسی نہ کسی دروازے کے عین نیچے کھڑا ہونے کی ہدایت کرتیں اور کہتیں: ''جان بچانا جہاد ہی کا حصہ ہے۔ خبریں سنتیں، ترانے پر سر دھنتیں، مجاہدوں اور فتح کے لئے دعائیں مانگتیں، اور آسمان پر ہوائی جہازوں میں (ایک مرتبہ) ہوتی ہوئی جنگ کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ حکم دیا کہ آیندہ تم باہر نہ نکلنا مگر خود دیکھنے کے لئے چھت پر جا پہنچیں۔ ان کے لئے یہ معمولی تھا۔ بقول ان کے، انہوں نے انگریزوں اور جرمنوں کی جنگ دیکھی سی تھی۔ کہنے لگیں: ''میں تو یہ دیکھتی ہوں کیا سچ مچ ہندو لڑنے آجاتا ہے۔ ضرور ان میں سکھ اور ڈوگرے زیادہ ہوں گے۔'' پھر کسی نے انہیں 1947ء کا ذکر کر کے یہ باور کرا دیا کہ اگر خدانخواستہ یہ حملہ آور شہر میں داخل ہو گئے تو بالکل 47ء کی طرح جوان لڑکیوں کی خیر نہیں...... اس بات سے فکرمند ہو گئیں۔

10 ستمبر کو مجھے اور والد صاحب کو چھوڑا، رخت سفر باندھا۔ اور جن جن گھروں میں کوئی لڑکی جوان تھی اس کی ماں سمیت سب کو تیار کیا اور اپنی بیٹی سمیت ملتان چلی گئیں، مگر پھر خود بیٹی کے ساتھ تیسرے چوتھے دن لوٹ آئیں۔ بولیں: ''مجھے یقین ہے وہ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے اور پھر ملتان اور لاہور بلکہ دنیا اور کائنات کا خدا ایک ہے...... تو پھر ڈریں کیوں؟ بفرض محال اگر قبضہ ہونا ہی ہے لاہور پر...... میرے منہ میں خاک...... تو میں اپنی جان کا اچار ڈالوں گی! سب اکٹھے قربان کیوں نہ ہوں؟ کیا خبر شہادت کا درجہ مل جائے اس قربانی کو؟''

جنگ زوروں پر تھی۔ سارے محلے کے بچے، بوڑھے، جوان ایک مخصوص بیٹھک میں سر شام جمع ہو جاتے۔ پھر کرفیو اور بلیک آؤٹ میں لہو گرمانے والے قصے دہراتے، باتیں باتیں...... بیچ میں ریڈیو جس پر گہرا سبز کپڑا اڈالا ہوتا تاکہ روشنی کی کوئی کرن باہر نہ نکل سکے۔ اماں بار بار چائے کے پتیلے بجھواتیں، ساتھ میں کچھ نمکین یا میٹھا...... گرما گرم چائے سے اس مورچے کو زندہ کر دیتیں۔ یوں لگتا ہم محاذ پر ہیں اور وہ ہماری معاونت کر رہی ہیں۔ اونچ نیچ ختم ہو چکی تھی، نورانی سٹریٹ کے چوکیدار سے اعلیٰ ترین آفیسر تک سب یہاں جمع تھے۔ میں نے یہ منظر زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(اور شاید آخری مرتبہ بھی)۔ اتنا اتفاق، اتنی یگانگت، اتنا اتحاد، اس قدر مروت...... اور پھر جوش جہاد، جذبہ، عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں...... ایک یہاں دوسرا وہاں...... محاذ پر...... اسی محاذ کے قصے، واقعات، خبریں، ترانے، تبصرے دل کی رگ رگ میں سما کر جان ہو ہو جاتے تھے۔ بارہ ایک بجے کے بعد سب گھروں کو لوٹتے، اکثر اماں جانماز پر دعا مانگ رہی ہوتیں۔ کہنا یہ تھا کہ جہاد میں جو کر سکتی ہوں وہ تو کرنا چاہیے نا!

میری ماں چٹی ان پڑھ تھیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس قدر مقولے میں نے ان سے سنے شاید ہی کسی سے سنے ہوں، فارسی، پنجابی، اردو...... ہر طرح کا مقولہ...... جو میرے بہت کام آئے، اب تک آ رہے ہیں۔ ہاں یاد آیا وہ ''صرفہ '' بہ معنی ''بچت'' اکثر پنجابی میں استعمال کرتی تھیں۔ ایک روز غالب کے ہاں صرفہ بہ معنی بچت، اور وہ بھی شعر میں، ملا تو مجھے بڑا مزہ آیا۔

اس سے بہت پہلے اصل مزہ تو اسی دن آیا جب مجھے سینٹ فرانس اسکول سے دوسری جماعت سے اٹھا لیا گیا۔ ماں سمجھی کہ اب میں اچھرہ کے کسی اسکول میں پڑھوں گا اور زیادہ وقت ان ہی کے پاس رہوں گا، (سینٹ فرانس میں پڑھنے کی وجہ سے چھٹی کے بعد تمام دن ابا کے ساتھ دکان پر رہتا جو انارکلی ہی میں تھی اور سکول سے بے حد قریب بھی) وہ اس بات پر خوش تھیں، مگر جب مجھے قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے چینیاں والی مسجد (اندرون شہر) میں ڈال دیا گیا تو ماں نے سخت احتجاج کیا۔ ابا بہت سخت تھے، مگر اس دن وہ بول پڑیں۔ کہنے لگیں: ''دنیا اور دین دونوں کا علم ساتھ ساتھ ہونا چاہیے کہ آدمی کاروبار حیات کو چلا سکے، پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔''

''بس'' ابا نے بات روک دی...... ''یہ عاقبت کا مسئلہ ہے اس میں مت بول......''

''سچ کہنا بھی تو فرض ہے'' وہ بولیں۔

ابا نے جنت کے درجات بتائے، حافظ قرآن اور اس کے والدین کے لئے سونے کے تاجوں کا ذکر کیا جن میں لگے ہیروں کی چمک کوسوں دور جائے گی، اپنا شجرہ نسب بتایا جس کی لڑی میں ایک نہ ایک حافظ چلا آتا تھا، مگر وہ ذرا بھی نہ جھکیں۔ بولیں...... ''موذن یا زیادہ سے زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محلے کی مسجد کا امام بنا دینا زیادتی ہے......"

ابا کا شوق جنون کی حد پھلانگ چکا تھا۔ انہوں نے پھر دلیل دی کہ میرے (ان کے) پردادا حافظ، دادا حافظ، والد حافظ، بھائی حافظ...... تمام پیڑھی میں تسلسل کے ساتھ حافظ چلے آ رہے ہیں۔ حافظ عبدالغنی (تایا) نے دروازہ بند کر دیا ہے کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو ادھر نہیں بھجوایا...... اگر میں نے بھی یہ نہ کیا تو تسلسل ٹوٹ جائے گا۔" سلسلے کو جاری و ساری رکھنے کا جنون ہی دلیل تھا...... مگر ماں ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔ "محض رٹوا دینے سے کیا ہو گا جب بامعنی باترجمہ نہ پڑھا تو......"

ابا زیر ہوتے ہوتے بچے۔ فوراً کہا: "پھر اسے جامعہ الازہر (مصر) بھجوا دیتے ہیں تاکہ عالم دین بن کر آئے۔ اکور......"

"نہیں نہیں...... مسجد چینیاں والی ہی ٹھیک ہے۔" اماں نے فوراً ہار مان لی...... دور دراز جا کر بچھڑ جانے کے خوف سے۔ ان کے پاس میری کمزور صحت، اکلوتا بیٹا، آنے جانے کے مسائل، سو دلائل تھے، مگر مصر بھجوانے کے خوف نے سب چاٹ لئے۔ انہوں نے بات بڑھائی: "لاہور بہتر ہے۔ آپ کے سامنے رہے گا، مجھ سے بھی روز ملے گا۔"

(یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب والد صاحب نے ڈرانے کی خاطر کیا تھا ورنہ جامعہ الازہر مجھے اس عمر میں کیسے بھجوایا جا سکتا تھا؟)

پھر جب میں حافظ ہو گیا تو والد نے پہلے رمضان کے لئے مسجد مبارک کا انتخاب کیا کہ میرے دادا جی نے وہاں رمضان میں تراویح پڑھائی تھیں ہمیشہ۔ (مسجد مبارک کے حوالے سے بہت سی باتیں مجھے مولانا حنیف ندوی صاحب مرحوم نے بتائیں جو میری بے حد عزت، محض اس لئے کرتے تھے کہ میں حافظ محمد حسن کا پوتا ہوں۔ وہ خود کو محمد حسن صاحب کا جونیئر کہتے تھے اور ان سے سیکھنے سمجھنے کی باتیں بھی کرتے تھے جو طوالت کے باعث چھوڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ندوی صاحب کی مغفرت کرے) سو ایسا ہی ہوا، پھر نیلا گنبد مسجد سنہری مسجد کے شنے، چینیاں والی مسجد کے شسنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

.....مسجد احمد علی کی تراویح (یہ سلسلہ بہت طویل ہے)۔

اس دوران میں اسکول کی پڑھائی گھر ہی پر ہوتی رہی۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ماں جی نے جوڑ جوڑ کر ایک تھیلی بنائی ہے جو میرے لئے ہے۔ اس میں آٹھ سو روپے نکلے تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں آٹھ سو جمع کر لئے جب اتنے روپوں میں ایک اچھا خاصا کمرہ بن سکتا تھا۔ مجھ سے کہا: ''ابا کے پاس رکھوا دو یا میرے پاس۔ یہ سارا روپیہ دنیا کی تعلیم کے لئے ہے، کسی اسکول میں داخلہ لے کر پڑھو باقاعدگی سے۔'' یہ بھی کہا: ''وقت ایسا دریا ہے جو کبھی الٹ نہیں بہہ سکتا۔ جو سانس گیا سو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے آدمی منجمد ہو جاتا ہے کہ اتنا وقت، اتنا سونا ضائع ہو گیا۔ لہٰذا تیز.....تر چلو'' .....لہٰذا میں نے تیز چلنے کی کوشش کی.....ہمیشہ۔

حفظ کرنے سے ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا کہ جو چاہتا منٹوں میں یاد ہو جاتا۔ لہٰذا برسوں کا کام چند مہینوں میں نمٹ گیا اور میں باقاعدگی سے میٹرک کا نصاب پڑھنے لگا.....اور کچھ زیادہ ہی شوق سے.....یہ میری ماں کی محبت، نگرانی، شدید خواہش.....کا اثر تھا۔ اور ان کی طرف سے مجھ پر ایسا بے جبر اصرار تھا جس کے سامنے میرے شوق کو سوا تو ہونا ہی تھا کہ بے جبر اصرار، جو صرف علم کے حصول کے لئے تھا، دل میں کھب کر مجھے ضمیر کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا.....کہ بچوں کی طرح کھیل کود بھاگ دوڑ اور ضد شد چھوڑ.....میرا خود بخود پڑھنے اور محنت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اور میں نے یہ سب کیا.....کہ وہ خود بھی محنت اور صبر کی مثال تھیں۔ اسی لئے جب میں نے اپنی ایک کتاب ان کے نام معنون کی تو اس کے انتساب میں لکھا: ''محنت اور صبر کی ایک مثال.....اپنی ماں کے نام.....''

وہ عورت جس کے شوہر نے لاکھوں کمائے ہوں اور لوگوں کے اچھے کاموں میں لگائے ہوں، اپنے بیٹے کے لئے جوڑ جوڑ کر جمع کرے اور اسے پڑھنے پر اکسائے، عجیب ہی تو ہے۔ دونوں میں اکثر بحث ہو جاتی۔ ابا جی کا کہنا تھا: ''انار کلی میں کاروبار ہے اور ہے بھی اسٹیشنری کا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ پڑھے لکھوں اور عالموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت ہے پڑھنے اور پھر ملازمت کرنے کی؟''

تاں جی کا کہنا تھا: ''علم ضروری ہے۔ اللہ کا حکم ہے، رسول کا فرمان ہے۔ دینا کے بغیر دین نامکمل ہے اور دین کے بغیر دنیا۔''

دینی معاملات میں ابا نے لاجواب ہونا سیکھا ہی نہ تھا خواہ اس کے لئے انہیں زندگی بھر کی دوستی کو خیر باد کہنا پڑا ہو یا رشتہ داری سے انکار۔ انہوں نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا۔ جملہ معترضہ کے طور پر ان کے انتہائی قریبی اور عزیز ترین دوست سیٹھ محمد سعید اور حکیم محمد خاں صاحب تھے۔ سیٹھ سعید صاحب کو میں تایا جی اور حکیم محمد خاں صاحب کو چچا جی کہتا تھا۔ اگر کبھی دونوں سے ناراضی ہوئی تو صرف اس بات پر کہ وہ اپنی والدہ کے سامنے اونچا بول گئے تھے۔ خیر ان باتوں کے علاوہ ابا جی کا جوش جہاد بھی جنون کی حد تک تھا۔ یہ جنون انہوں نے ایک ایسے شخص سے لیا جو غازی تھا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں میں چھوٹا ہی تھا اور ابھی قرآن پاک ہی حفظ کر رہا تھا۔ ایک روز میں اپنی دکان کے اس شوکیس کے پاس کھڑا تھا جس میں اعلیٰ ترین قلم ہوتے تھے۔ شوق کے باعث مجھے ان کے نام اب تک یاد ہیں۔ مثلاً پیلیکن، شیفرز، لائف ٹائم گارنٹی والا، پارکر ڈوفولڈ، پارکر وی ایس، پارکر 51، پارکر 61، ایورشارپ، سوان، بلیک برڈ اور مرنٹ بلانک۔ انہیں قلموں کے قریب ابا جی کھڑے تھے۔ ہم چونکہ ایسے قلموں کے امپورٹر تھے اس لئے بڑھئی کا بچہ گلی ڈنڈا تو سمجھے گا ہی۔ مجھے ان سب قلموں کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ وہاں اس شوکیس کے قریب ایک شخص خاکی وردی میں ابا جی سے بہت دھیمے لہجے میں باتیں کر رہا تھا، کچھ اس محویت سے کہ قلم رکھے کے رکھے رہ گئے۔ باتیں جہاد کی تھیں، کشمیر کی محاذوں کی لڑائی اور فرائض کی۔ کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا۔

غازی صاحب ابا کے دوستوں میں سے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ اسی خاکی وردی میں، میں نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ چھوٹے قد کے گٹھے ہوئے مضبوط آدمی تھے، مگر اس دھیمے طریقے سے بولتے تھے کہ بات دل میں اتر جاتی تھی۔ ابا گرم مزاج تھے اور جوش جہاد میں اونچا بولتے بھی تھے، مگر غازی صاحب نرم گفتار تھے، ابا ان سے متاثر ہوئے اور یہی جذبہ انارکلی کے تاجروں میں پھیلایا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان دنوں کشمیر میں کچھ نہ کچھ ہوتا تھا اور یہ مصرع عام تھا...... کشمیر میں جنت بکتی ہے، اور جان کے بدلے سستی ہے...... جبھی تو سلے سلائے کپڑوں کے ٹرک آزاد کشمیر جانے لگے جو تمام انارکلی کے سوداگران کی طرف سے تھے کہ مجاہدین کے لئے جو بھی تھا حاضر تھا۔ ابا کا کام انہیں اکٹھا کرنا، حساب رکھنا اور پھر جب قرعہ فال ان لوگوں کا نکلا جنہیں لے کر محاذ تک جانا تھا تو ان میں ابا جی بھی تھے اور انہوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ اور مندرجہ بالا مصرعہ بار بار پڑھا...... کشمیر میں جنت بکتی ہے سامان لے کر جانے والوں کی فہرست میں ابا جی (میاں عبدالحمید)، امین سپورٹس کے محمد امین صاحب اور عبدالعزیز صاحب تھے جو نیلا گنبد مسجد کے دروازے کے بالکل ساتھ ایک دکان چھوڑ کر دکان کرتے تھے۔ (فی الحال یہی یاد ہے) یہ سب لوگ دن رات سفر کرتے اور ثواب کماتے تھے۔

ابا جی کو تمباکو کے پان کھانے کی عادت تھی۔ دن میں درجنوں پان کھاتے تھے۔ کشمیر جانا ہوتا تو سو دو سو پان بندھوا کر ساتھ لے جانے لگے۔ پھر ایک دن اچانک پان کھانے ترک کر دیے کہ فرائض میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان کے پرانے تمباکو خور دہلوی، لکھنوی دوست حیرت زدہ تھے کہ یہ کیسے چھٹ گئے۔ ابا جی کہتے اللہ کے حکم سے...... واقعی یہ جذبے کی بات تھی، عزم کی بات تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ راہ خدا کے کاموں میں رکاوٹ بننے والی کسی شے کو وہ برداشت ہی نہ کرتے تھے، لہذا چھوڑ دیے۔ بہت بعد، جب میں کمسنی سے لڑکپن میں آ چکا تھا وہی صاحب ہمارے پڑوس میں اترے جنہوں نے ابا کے دل میں جذبہ جہاد دو چند کیا تھا۔ معلوم ہوا ان کا نام غازی خدا بخش ہے اور یہ بھی کہ جہاد میں اوجھل ہونے والے کو شہید اور کامران لوٹنے والے کو غازی کہتے ہیں۔ اور غازی خدا بخش صاحب چونکہ کامران لوٹے تھے، لہٰذا غازی کہلاتے تھے۔

ماں جی کو کسی بات پر اعتراض نہ تھا، مگر وہ دونوں علوم اپنے بچے میں دیکھنا چاہتی تھیں کہ معاشرے میں اگر کوئی اس ایک سے محروم ہوگا تو وہ معذور ہوگا، لہٰذا انہوں نے میرے دنیاوی علوم سیکھنے کے سلسلے میں بہت لڑائیاں لڑی تھیں جنہیں ہم دلائل کی جنگ کہہ سکتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہاں، ایک بات اور ابا جی نے جوش جہاد میں پریڈ بھی سیکھی۔ خود وردی سلوائی۔ مجھے بھی چھوٹی سی وردی پہنائی۔ میں بھی اچھرہ تھانے کے سامنے والی گراؤنڈ میں ان کے ساتھ پریڈ سیکھنے جانے لگا۔ اس ضرورت سے ابا نے اپنے اوپر تقریباً حرام پتلون خود بھی پہنی، مجھے بھی پہنائی۔ ان دنوں میں نے اور بھی بہت سے بزرگوں کو دیکھا کہ نیچے شلوار پہنتے تھے، اوپر پتلون پہن لیتے.... مجبوری تھی۔ مگر مجھے پتلون پہننے کی آزادی مل گئی...... میں نے ابا سے تقاضا کیا۔ انہوں نے پتلون خرید کر دکان میں رکھ لی۔ اور کوٹ کا ناپ دلوا دیا اس سے پہلے کہ میرا کوٹ سل جاتا ابا جی سے کوئی خان صاحب ملنے آئے۔ معلوم ہوا کشمیر میں جہاد کر چکے ہیں۔ ابا واری صدقے ہونے لگے۔ انہیں چائے وغیرہ پلائی۔ خان صاحب کا نام بھی ابا کو بے حد پسند آیا...... ''خونی خان۔''

وہ بار بار ''خونی خان'' ''خونی خان'' کہتے اور جہاد کے لئے اس نام کو نہایت موزوں قرار دیتے۔ ابا جی نے خونی خان کی جو خدمت کی سو کی، میری پہلی اور بار بار تقاضے سے خریدی ہوئی پتلون بھی ان کی نذر کر دی کہ ان کے بچے بھی تھے اور انہوں نے اس کے لئے فرمائش بھی کی تھی۔ میں ہر چند چھوٹا تھا، مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا، مگر میں ان کے سامنے احتجاج نہ کر سکتا تھا۔ ابا اپنے حسن سلوک سے بے حد خوش تھے۔ ان کا فرمانا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی خدمت کرنے سے دنیا اور آخرت میں انسان کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔

لیکن میرے اندر جو طوفان تھا وہ مجھے اندر ہی اندر جلائے جا رہا تھا۔ جب میں رات کو امی کے پاس گھر آیا تو انہوں نے میرے چہرے سے کسی غیر معمولی واقعے کو بھانپ کر مجھ سے پوچھا۔ کچھ کہنے کے بجائے میں رو پڑا تو ابا نے مجھے ڈانٹا اور امی کو بتا دیا...... امی نے ایک مرتبہ پھر احتجاج کیا، مگر ابا اپنے فیصلے کو ہمیشہ درست سمجھتے تھے۔ ابا جی نماز کے لئے گئے تو ماں نے مجھے اپنی گرم آغوش میں سمیٹ کر کچھ ایسا تسلی آمیز پیار دیا کہ میرا بے حد بوجھل دل بہت حد تک ہلکا ہو گیا۔ انہوں نے اسی وقت بہن کو بلا کر اپنا صندوقچہ منگوایا، کوٹ پتلون کا حساب لگوایا اور پھر جمع شدہ رقم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گننے لگیں..... لگ بھگ دوسو دس روپے ہوئے جن سے دوسرے ہی دن گرے رنگ کی پتلون اور ٹویڈ (چیک) کے کوٹ کا کپڑا خرید کر درزی کے ہاں سلنے کو دے دیا گیا۔ سارے واقعے کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ زندگی میں پہلا کوٹ پتلون ماں ہی نے مجھے بنوا کر دیا اور پہنایا..... آپ شاید یقین نہ کریں مگر اس دن ان کی آغوش کی حرارت ہر لمحہ میرے اندر اترتی رہی۔ اس کے بعد سے آج تک بیسیوں سوٹ سلوائے، پہنے مگر وہ لطف، وہ سرور نہیں ملا۔ یہ محض جذباتی بات نہیں۔ بلکہ ان کی، دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی شفقت نے اوروں کو بھی یہ حرارت بخشی لیکن کبھی جتایا نہ یاد رکھا کہ بقول ان کے احسانات کا ذکر نیکیوں کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔

میں آج جو کچھ بھی ہوں انہی کی بدولت ہوں۔ اس طرح بھی کہ جب کہ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ پائے کے نجومی نے (میٹرک کے بعد) میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تم جو کچھ پڑھ چکے ہو بس یہی ہے...... آگے راستہ بند ہے۔

''میں تلملایا، پریشان ہوا تو ہمیشہ کی طرح ماں جی نے مجھ سے پوچھ لیا۔ میرے بتانے پر کہنے لگیں: ''وہ بکواس کرتا ہے۔ تم اگر خدا اور اپنے آپ پر بھروسا کرتے ہو تو اس کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لو۔'' واقعی میں نے اسے چیلنج سمجھ لیا اور جب تک ایم اے (دوسری پوزیشن میں) پاس نہیں کر لیا، چین نہیں آیا۔ تھوڑا بہت لکھا پڑھا بھی۔ اگر وہ مجھے ہر وقت حوصلہ نہ دیتیں تو شاید میں نجومی کی بات کو اوڑھ کر سو رہتا اور آج اسی بند گلی میں منجمد ہوتا۔

کہتے ہیں کہ ہر بڑی شخصیت کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر آپ ''بڑی شخصیت'' کو منہا کر دیں تو کم از کم مجھ ناچیز کے پیچھے تو ایک ماں ہی کھڑی ہے۔ یہ مقولہ ہونا ہی یوں چاہیے کہ ''...... پیچھے کسی نہ کسی ماں کا ہاتھ ہوتا ہے۔'' عورت کا لفظ یورپ والوں نے لکھا ہے، حالانکہ عورت کا سب سے افضل اور اعلیٰ مقام اسی تخلیقی عورت کا ہے جو ماں ہے، مگر اس معاشرے نے ماں کو تقدس نہیں دیا، صرف عورت کو قبول کیا...... بیوی، بیٹی، بہن، ماں کے حوالے سے کم، محبوبہ کے حوالے سے زیادہ!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑی شخصیت کے پیچھے اس کی تخلیق کار کھڑی ہے، تہذیب کار کھڑی ہے یعنی پہلا اسکول آف آرٹس موجود ہے...... سو ماں کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ وہ سدا محبت ہی محبت ہے، ایثار ہی ایثار ہے۔ دکھوں اور غموں کو اپنے دل کی چھلنی سے گزار کر خالص ممتا بھرا سلوک بانٹتے رہنا اس کی فضیلت ہے جو خدا داد تو ہے، مگر تابندہ ستاروں کی طرح روشن اور ہر دم تازہ ہوا کی بو باس لئے ہوتی ہے۔

مجھے افسوس ہے میں چند سطریں لکھنے بیٹھا تھا اور تحریر طویل ہو گئی، لیکن سچ کو زیادہ دیر چھپا کر نہیں رکھنا چاہیے، نہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور اب تو یہ چراغ بجھنے ہی کو ہے۔ میں اپنے آپ کو اس تاریکی کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کر رہا ہوں جو ان کے بعد میرے چاروں اور پھیل جائے گی کہ دیا اب بجھنے ہی والا ہے۔ وہ محبت، وہ ہنستی ہوئی آنکھیں اور مروت سے بھرا بھرا دل ..... وہ حوصلہ آمیز، کان میں کہی ہوئی بات، وہ سینے سے لگا کر ماتھا چوم کر دن بھر کی کلفتوں کو لمحے بھر میں دور کر دینے والی ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائے گی کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے..... ضد کی طرح ..... اور کوئی دلیل کسی ضد کو نہیں کاٹ سکتی۔ سب کچھ فانی ہے،..... ہاں۔

دائم آباد رہے گی دنیا ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوشبو کی ہجرت

پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ شیخ منظور الٰہی بیسویں صدی کی ایک علمی تہذیبی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ وزیراعلیٰ ہونے کے باوجود ان کا طرۂ امتیاز کمال دیانت داری اور بے مثل سادگی رہا جو ہمارے حکمران طبقوں اور اعلیٰ افسروں کی زندگیوں سے غائب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ تین ماہ کے لئے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے نگران وزیراعلیٰ مقرر ہوئے اور انہوں نے یہ مختصر سا عرصہ اس احتیاط اور اس انکسار کے ساتھ گزارا کہ ان کی شخصیت کا اصل جوہر کھل کر سامنے آ گیا اور اسلاف کی یاد تازہ ہو گئی۔ اقبال کے اس قدر شیدائی کہ ان کی اپنی زندگی جذب و عشق اور بے خودی و سرمستی کی ایک عظیم تحریک بن گئی۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی کامیابیوں کا ذمہ دار اپنی والدہ محترمہ کو ٹھہرایا ہے۔

• •

امی کی اولین یاد رواں صدی کی دوسری دہائی کی ہے۔ ستلج ویلی پراجیکٹ کی تکمیل سے پہلے ابا فیروز پور میں غیر دوامی نہروں کے مہتمم تھے۔ وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے ایک عظیم قوس کی شکل میں جامن کے تیس چالیس گھنے پیڑوں کی چھتناری تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں پرندے پھل کترنے کے لئے آتے تو ہنکارے ہاہا کر کے انہیں اڑا دیتے۔ پچھلے صحن کے گرد پردے کے لئے بچی پکی دیوار تھی۔ امی کی کم و بیش وہی کائنات تھی۔ گھر کا انتظام و انصرام، کبھی کبھار کسی سہیلی کے ہاں چلے جانا یا عورتوں کو چائے پر بلا لینا۔ گھر میں کوئی پارٹی ہوتی تو امی کا ہاتھ بٹانے کے لئے دور دراز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قامت خوشرو پارسی لڑکیاں آجایا کرتیں اور میں ہمیشہ امی سے پوچھتا: ''یہ پریاں کہاں سے آتی ہیں؟'' جواب دینے کے بجائے امی مسکرا دیتیں۔

امی نرم خو تھیں۔ انہیں غصہ بہت کم آتا تھا۔ یاد نہیں پڑتا انہوں نے کسی بچے پر کبھی ہاتھ اٹھایا ہو۔ ہاں بچپن میں ایک بار ایک ہمجولی کے گھر سے پستول نما کھلونا اور پٹاخوں کا سرخ فیتہ چپکے سے اٹھا لایا تھا۔ ''یہ کہاں سے لائے ہو؟'' امی نے پوچھا۔ میرے خاموش رہنے پر زناٹے کا ایک تھپڑ مارا اور دونوں چیزیں ملازم کے حوالے کیں کہ واپس کر آئے۔ اس روز سے ذہن پر نقش ہو گیا کہ ایسا کرنا بہت بری بات ہو گی۔

میں پہلے روز اسکول گیا تو اور بچوں کی طرح مجھے بھی میلے ٹاٹ پر بٹھا دیا گیا۔ جابجا روشنائی کے دھبے اور چکنائی کے داغ۔ گھر آ کر ذکر کیا تو امی نے کھجور کی چٹائی بچھوا دی جس پر میرے علاوہ دو تین دوسرے ہم جماعت بھی بیٹھ جاتے۔ بس ناز برداری اسی حد تک تھی۔ امی کی سفارش پر چند برس بعد سائیکل خریدنے کی اجازت ملی تھی۔

انہی دنوں گھر کا کام کاج کرنے کے لئے بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بہاولپور سے آیا۔ چراغ، قد کاٹھ کا تگڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے کام سنبھال لیا۔ امی کو بھی چراغ سے انس ہو گیا۔ وہ ہمارے کھیل میں برابر کا شریک تھا۔ ہمارے ہاں آتے ہی اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ پانی کے ایک دو گلاس پی کر گھڑونچی پر دھرے ہوئے گھڑے کو منہ لگا لیا کہ سیر ہو کر پانی پی لے۔ پھر اس نے امی سے کہا تھا: ''بی بی جی! آپ نے گھڑے میں گڑ ڈال رکھا ہے۔'' ...... برسوں بعد میری تعیناتی بہاول پور ہوئی تو چولستان کی صحرائی آبادیوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ چراغ کو گھڑے کا پانی میٹھا کیوں معلوم ہوا تھا۔ چولستان میں آبادی کے نزدیک کھارے پانی کے جوہڑ ہیں۔ میٹھے پانی سے محروم وہاں کے باسی اسی پر گزر اوقات کرتے ہیں......

چراغ کو ہمارے ہاں کام کرتے بمشکل ایک برس ہوا ہو گا کہ امی کا زیور چوری ہو گیا۔ تھانے میں اطلاع دی گئی تو ملازموں سے باز پرس کے لئے پولیس گھر آ گئی۔ دھمکانے کی خاطر تھانیدار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ٹکٹکی نصب کر دی۔ جب تیل میں بھگویا کوڑا ہوا میں لہرانا شروع کیا تو چراغ پھوٹ پڑا کہ جمعدار کی شہ پر زیورات کا ڈبہ چرا کے کوارٹر میں چھپا دیا ہے۔ امی کو برابر اطلاع مل رہی تھی کہ چراغ کی مار پیٹ کا انتظام ہو رہا ہے۔ وہ قرآن کریم کھولے بیٹھی تھیں اور آنسوؤں کا تار بندھا تھا، مصحف کے صفحے بھیگ رہے تھے۔ چراغ کو سزا ملنے کا خیال ان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ وقتی طور پر وہ اپنا زیور بھول گئی تھیں۔ اتنے میں ابا مسکراتے ہوئے اندر آئے۔ ہاتھ میں وہی ڈبہ تھا۔ کھولا تو زیورات جوں کے توں تھے۔ کاغذ کا ایک پرزہ ساتھ دھرا تھا جس پر تحریر تھا: ''زیور کی زکواۃ ادا کر دی گئی ہے!''

بچوں کے لئے امی کا ایک تحفہ مطالعے کا شوق تھا۔ جب فرصت ملتی، کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیتیں۔ مصورِ غم راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی کتابیں، مسدس حالی، چکنے دبیز کاغذ پہ مرغوب ایجنسی کی شائع کردہ اقبال کی طویل نظمیں، شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، خضر راہ...... جب بار بار پڑھنے سے یہ نظمیں مجھے ازبر ہو گئیں تو کچھ انعام بھی دیا۔ اچھی کتابوں کی طرف ہمارا میلان طبع دیکھ کر وہ خوش ہوتیں بلکہ ہر صحت مندانہ رجحان کی حوصلہ افزائی کرتیں۔

فیروز پور میں آٹھ دس برس گزارنے کے بعد ابا لائل پور تبدیل ہو گئے۔ پھر وہیں کے ہو رہے۔ تیسری دہائی کا لائل پور بہت مصفا شہر تھا۔ زرعی کالج اسٹیٹ تو بالخصوص بہت ہری بھری تھی۔ آم، شیشم، گول موہر اور املتاس کے پرانے قد آور درخت، حد نظر تک پھیلے ہوئے زرعی فارم کے کھیت۔ سرِ شام ہم وہاں سے نکل کھڑے ہوتے، سیدھی سڑکیں عبور کرتے ہوئے کمپنی باغ کی گلگشت کرتے، کارونیشن لائبریری پہ ضرور پڑاؤ ہوتا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران فرنگی حکمرانوں نے ضلع کے زمینداروں سے کئی لاکھ روپے کا چندہ جمع کیا تھا۔ خلاف توقع جنگ جلد ختم ہو گئی اور اس مد میں استعمال کی نوبت نہ آئی۔ کسی نیک دل افسر نے ایک حصے سے ڈسٹرکٹ بورڈ ہال اور دفاتر کی عمارات بنوا دیں۔ کلہ گفٹ فنڈ کا دوسرا حصہ دیہی علاقے کے مستحق طلبہ کے وظائف کے کام آیا اور وہ منبعِ خیر آج تک جاری ہے اور تیسرا کارونیشن لائبریری کی تعمیر اور دیکھ بھال کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختص کر دیا گیا (انہی دنوں شاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کی سالگرہ منائی گئی ہوگی جس پر لائبریری کو یہ نام ملا ہوگا)۔

خوبصورت باغیچے میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی کارونیشن لائبریری میں روزناموں کے علاوہ انگریزی اور اردو کے رسالے بالترتیب دھرے ہوتے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کا زمانہ تھا۔ دارالمطالعہ میں کامل سکوت ہوتا۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام کی کیفیت ہوتی۔ انگریزی کے رسائل میں سے لندن نیوز اور السٹرلڈ ویکلی آف انڈیا یاد رہ گئے ہیں۔ انگریزی کی شد بد بہت کم تھی، مگر تصاویر کی اپنی دلکشی ہوتی...... پس منظر سمجھنے کے لئے تصویر کے نیچے لکھی ہوئی عبارت پڑھنا پڑتی۔ اس سے انگریزی زبان کے ساتھ بھی کچھ وابستگی پیدا ہوئی۔ حکیم یوسف حسین خاں کا ''نیرنگ خیال'' دیا نگمنارائن کا ''زمانہ'' مولانا تاجور نجیب آبادی کا ''ادبی دنیا'' اور میاں بشیر احمد کا ''ہمایوں''......ان کے تازہ شمارے ایک مخصوص جگہ پر ہوتے۔ شروع مہینے میں ان رسالوں کا انتظار رہتا تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات میں ہم نے افسانے اور ناول پر یلغار کی۔ منشی پریم چند کی پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول فلورا فلورنڈا، ملک العزیز ورجنا، حسن بن صباح وغیرہ ہم، امتیاز علی تاج کا شاہکار ڈرامہ ''انارکلی'' اور خوبصورت ترجمہ ''لیلیٰ'' یا ''محاصرہ غرناطہ۔'' سفید پگڑی والے لالہ جی جز وقتی لائبریرین تھے۔ ایک روز انہوں نے سرزنش کی:

''تم بچوں کو ناول پڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں؟ استاد نے ہوم ورک نہیں دیا؟''

فطرت ثانیہ بن جانے کے وجہ سے اس زمانے میں ڈسپلن خود اختیاری تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد یا زیادہ سے زیادہ رات کے کھانے کے وقت گھر لوٹ آنے کا معمول تھا۔ بس ایک استثنا تھا، وہ تھا سال میں ایک مرتبہ جالندھر والے مبارک علی، فتح علی کی قوالی۔ سائیں لسوڑی شاہ نے سالانہ قوالی کی ریت اپنی زندگی ہی میں ڈال دی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد عرس کے موقع پر دو روز قوالی کی محفل بپا ہوتی۔ ہم رات گئے گھر واپس آتے اور چپکے سے اپنے کمرے میں سو رہتے۔

اسکول کے زمانے میں جیب خرچ یاد نہیں، مگر فرسٹ ائر میں دس روپے ماہانہ تھا۔ جزری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر کے میں نے بیس روپے بچائے تھے۔ ابا گھر ہوتے تو جرات نہ ہوتی، لیکن وہ دورے پر جاتے تو ہم امی کے گرد ہو جاتے کہ ہمیں سینما دیکھنے کے لئے پیسے چاہئیں۔ سینما کا ٹکٹ، آئس کریم اور لیمونیڈ کے لئے ایک چہرہ شاہی کافی ہوتا۔ امی نے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ ہاں جب ٹارزن کی چوتھی قسط پر جانے کی اجازت مانگی تو اتنا ضرور کہا تھا: "یہ موا ٹارزن کب ختم ہوگا؟" انگریزی فلموں میں سے بن حر، اینا کرینا، کوئین کرسچیانا اور رومیو جیولیٹ یاد رہ گئی ہیں۔ اس نام کے بعد میں تیار ہونے والی کلاسیکی فلموں کا نقش اول، البتہ نیو تھیٹرز کلکتہ کی کئی فلمیں اس زمانے میں دیکھیں، ان جانے اداکاروں کو متعارف کرانے اور سینما کو عوامی رنگ دینے میں نیو تھیٹرز کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس ادارے میں نوعمر اداکاروں کی شخصیت جلا پاتی تھی۔ ایک عام گھرانے کی سیدھی سادی زندگی میں محروم طبقے کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور تہہ در تہہ مسائل فنکارانہ انداز میں پیش کیے جاتے۔ فن کو پرکھنے کا پیمانہ محل سے ہٹا کر جھونپڑی میں لے جانے کا سہرا نیو تھیٹرز کے سر ہے۔

امی اور بچوں کے درمیان باہمی اعتماد کو بڑا دخل تھا۔ اس کا ایک نتیجہ بچوں میں جذبہ خود اعتمادی تھا۔ وہ باور نہ کر سکتی تھیں کہ ان کا بیٹا جھوٹ بول سکتا ہے یا اس سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ ہم مذاق سے کسی پر سگریٹ پینے کا الزام لگاتے تو وہ فوراً بول اٹھتیں: "توبہ کرو، وہ ایسا کام کر سکتا ہے؟" کم از کم بچپن اور اوائل شباب میں ہم نے اس اعتماد کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کبھی غلط بیانی کر کے امی سے کوئی رعایت طلب کی نہ اپنی بریت کے لئے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

آزادی ملنے سے بارہ برس قبل ایک سیزن سری نگر میں بسر ہوا تھا۔ ہفتے میں دو بار ایک مانگنے والا صدا لگاتا: "پونسہ امی موجو، پونسہ امی موجو......"۔ چالیس برس گزر جانے پر بھی میرے کانوں میں وہ آواز گونجتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نے اسے کبھی کچھ نہیں دیا تھا۔ لہجے کی لجاجت اس کی نیلگوں سیال آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ پاؤں میں گھسے ہوئے چپل، ٹخنوں سے اوپر تنگ موہری ہوئی شلوار، سر پر میلی چکٹ ٹوپی۔ گپکار روڈ والے بنگلے کی سیڑھیاں چڑھ کے وہ عین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس وقت آتا جب میں پڑھائی میں مگن ہوتا...... ''پونسہ ای موجو......''

میں جھنجھلا اٹھتا تو امی منع کرتیں کہ اسے کچھ نہ کہو اور کچھ دے دلا دیتیں۔

صلہ رحمی کے طفیل اس درد کو امی نے سمجھا تھا اور اشارے کنائے سے ایک نوخیز کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ زندگی جوئے شیر ہی نہیں، تیشہ و سنگ گراں بھی ہے۔

انجانے طور پر امی نے روح کا ایک ایسا تار چھیڑ دیا تھا جس کی کسک عمر بھر محسوس ہوتی رہی۔ چند برس بعد کشمیر جانے کا اتفاق ہوا۔ چنار کے پتوں پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ دیہی علاقوں میں گھومنے پھرنے سے مجھے لوگوں کی کسمپرسی کا احساس ہوا۔ جگمگاتی کوٹھیوں اور تاریک حجروں کے درمیان ایک اتھاہ خلیج حائل تھی۔ ایک طرف ناداری اور نارسائی، تن بہ تقدیر، مجبور و محکوم، قسمت پہ شاکر، دوسری طرف ڈل جھیل پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے شکارے، داد عیش دینے والے سیاح اور ڈوگر اسنگھاسن کی محافظ ریاست کی فوج ظفر موج۔

چابک سواراں ایک طرف...... مسکیں گدا ایک طرف...... میرے لئے یہ تضاد ناقابل فہم تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کاتک یک خنک چاندنی میں بہتا ہوا بستی سے دور نکل جاتا۔ ہمہ گیر سیل نور بلند بام درختوں پر سے گزرتا ہوا فضائے بسیط پہ محیط ہوتا۔ کچی چاندنی کی آبشار شاخوں اور پتوں سے پھسلتی زمین پر آ رہتی۔ انسانیت کا درد سینے میں سموئے ایک انسان زندگی کی چیستان کا حل ڈھونڈنے نکلتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔

آغوش مادر میں چاند ایسی خنکی ہوتی، انسان دوستی کا پہلا سبق میں نے امی کے قدموں میں سیکھا۔

ابا کی بے پناہ مصروفیت کے باعث بچوں کی تربیت کا کام بھی ان کے سر آن پڑا تھا۔ انہوں نے کبھی نصیحت کے انبار لگائے نہ بات بات پر ٹوکا۔ بس ان کا کردار اور حسن سلوک ہمارے سامنے تھا، اور ان کی حق گوئی اور رحم دلی بھی۔ لگی لپٹی نہ رکھنا، کسی کا برا نہ چاہنا، کسی بات پر بے جا ناراض نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونا، یہ سب ہمارے سامنے تھا، اگر ہم نے کوئی صفت نہ اپنائی تو اسے اپنی کم نصیبی ہی کہہ سکتے ہیں۔

شدت جذبات سے مغلوب ہونا ان کی سرشت میں نہ تھا بلکہ جذبات کو قابو میں رکھنا طبیعت کا خاصہ تھا۔ جنگ عظیم ختم ہوتے ہی مجھے برما جانے کا حکم ہوا۔ مدراس ٹرانزٹ کیمپ سے رخصت لے کر میں گھر والوں کو الوداع کہنے آیا، وقت رخصت امی نے اتنا کہا: ''اللہ کے سپرد، خیریت سے جاؤ اور واپس آؤ'' ...... میں صدقے جاؤں، قربان جاؤں، ایسے الفاظ میں نے ان کی زبان سے نہیں سنے بلکہ اس ضمن میں کسی کا بڑھ چڑھ کے باتیں کرنا انہیں پسند نہ تھا۔

صبر و شکر اور توکل ان کی گھٹی میں تھا۔ بھائی کا ایک کورس پر امریکہ جانا ہوا تو عم زاد بہنیں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ امی نے سمجھایا: ''اس موقع پر رونا دھونا کیسا!'' اور قرآن کریم کھول کے بیٹھ گئیں۔ ابا کے انتقال کو چند ہفتے ہوئے تھے کہ چھوٹے بھائی کی پھول ایسی بیٹی یرقان میں مبتلا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ امی اس کمرے میں داخل ہوئیں جہاں نینا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس بچی سے پیار بھی بہت تھا۔ اسے دیکھتے ہی آنکھوں سے آبگینے چھلک پڑے۔ بس اتنا کہا: ''یہ کھیل کود کے دن تھے۔ جانے کا وقت نہ تھا۔''

امی سچ بولنے کی اس شدت سے قائل تھیں کہ مذاق میں بھی غلط بیانی گوارا نہ تھی۔ ایک بار وہ بہاولپور ہمارے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ کمال میاں چار برس کے ہوں گے۔ وہ میز پر کپڑا ڈال کر کرسی لگا کے بیٹھ گئے اور امی سے کہنے لگے:

''بی بی! آپ عرضی دیں کہ آپ کو مربے چاہئیں۔''

''نہیں مجھے ضرورت نہیں۔''

''واہ! میں کیسے کہوں، مجھے لینے ہی نہیں۔''

کسی نے کہا بھی کہ بچے کا دل رکھنے کے لئے ہی کہہ دیں، مگر امی کسی طور نہیں مانیں۔

اپنی سادگی کے باوجود وہ خوب سمجھتی تھیں کہ نیک دل کون ہے اور لگائی بجھائی کرنے والا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کون۔ انہوں نے کبھی گراوٹ کے ساتھ سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ غیبت، عیب جوئی اور سکینڈل سے نفرت کے باعث ایسی گفتگو میں حصہ نہ لیتیں۔ بس میں ہوتا تو روک دیتیں ورنہ خاموش رہ کر نا پسندیدگی کا اظہار کرتیں۔ روزمرہ کی زندگی میں رب ذوالجلال کا اٹل فرمان ان کے پیشِ نظر رہتا تھا:

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ؕ ٥ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ٥

ترجمہ: پس جو ذرہ برابر نیکی کرتا ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرتا ہے، وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (سورۃ زلزال)

بچپن کی ایک یاد امی کی قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ فجر کی نماز کے بعد پلنگ پر بڑی تقطیع کا قرآن کریم دھرا ہوتا۔ وہ اس پر جھکی ہوئی ہلکی مترنم آواز میں تلاوت کرتیں۔ اس کے بعد بڑے اہتمام سے مکھن نکالتیں۔ ایک گائے یا بھینس ہمیشہ گھر میں ہوتی۔ امی دودھ مکھن کی دیکھ بھال کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ چاٹی میں دہی بلو کر خود مکھن نکالتیں۔ لسی باہر تقسیم ہو جاتی۔ مکھن کا سفید پیڑا ناشتے کی میز پر آ جاتا۔

ایک دفعہ محمود میاں کہنے لگے کہ اسکول کے زمانے میں کسی شام قریبی دوست آ دھمکتے اور کہتے کہ آئس کریم پارٹی ہو جائے۔ آئس کریم بنانے والی مشین گھر میں موجود تھی۔ محمود اندر جاتے اور لجاجت کے ساتھ امی کی طرف دیکھتے۔ دبے لفظوں میں دوستوں کی آمد اور ان کی فرمائش کا ذکر کرتے اور کڑھے ہوئے دودھ کا دیگچہ باہر لے جانے کی اجازت مانگتے۔ محمود کا کہنا ہے کہ امی نے انکار کبھی نہیں کیا تھا، نہ کہا صبح مکھن کہاں سے آئے گا یا دہی کیسے بنے گا۔ بس ایک خفیف سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل جاتی۔ سر کی ہلکی سی جنبش اجازت کی غمازی کرتی اور بقول محمود ''میں زقند لگا کر دس سیر کا دیگچہ اٹھا لیتا۔ احباب مل جل کر مشین کا ہینڈل گھماتے، قلمی شورہ ڈالتے اور وہ شام بسیار خوری کی نذر ہو جاتی۔''

میاں افضل حسین مرحوم ابا کے دوست اور ہم راز تھے۔ دونوں کوئی اہم کام ایک دوسری کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشورے کے بغیر نہ کرتے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے وہ زراعتی کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج اسٹیٹ میں کم وبیش دس برس ہماری ان کی ہمسائیگی رہی۔ شریف النفس، مخلص، دھن کے پکے۔ وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت میں پیش پیش تھے۔

1940ء میں یونیورسٹی کانووکیشن ہوا تو میں ہال میں موجود تھا۔ چانسلر کی حیثیت سے تقریب کی صدارت انگریز گورنر کو کرنا تھی، مگر آخر وقت میں سی آئی ڈی نے رپورٹ دی کہ اس پر بم پھینکے جانے کا خطرہ ہے۔ گورنر نے شرکت کا ارادہ منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ اس کے بجائے وائس چانسلر صدارت کریں۔ اس پروقار تقریب میں میاں صاحب مرحوم بڑی سیاہ گاڑی میں یونیورسٹی ہال پہنچے تو سرخ فراک کوٹ میں ملبوس طرے والے اردلیوں نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال میں داخل ہوئے تو لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے، ڈائس پر میاں عبدالحئی وزیر تعلیم اور دوسرے وزرا موجود تھے۔ چودھری سر چھوٹو رام ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ وہ بادل نخواستہ کرسی سے آدھے اٹھے جیسے میاں صاحب کے لئے اٹھنا انہیں سخت ناگوار گزر رہا ہو۔ میں نے آنکھوں دیکھا حال امی کو سنایا تو انہوں نے بے ساختہ کہا: ''اللہ ایسی عزت سب کو نصیب کرے۔''

اللہ اللہ کیا پاک ہستیاں تھیں، حسد کا ذکر کیا! رشک کا بھی شائبہ نہ تھا۔

امی اور ابا کی رفاقت خوب تھی۔ ایک بحرِ زخار، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، کارزارِ زیست میں نئی راہیں تراشنے والا، خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جانے والا، رفیقِ سفر حلیم الطبع، کم گو، کم سخن، بہت کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش، بچے تلے الفاظ میں پرکھ کے بات کرنا، ساتھ ہی مخاطب کو پرکھ لینا، سچائی اور سادگی کی تصویر۔

ابا دورے سے واپس آتے تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کسی کو کار سے سامان نکالنے کو کہہ رہے ہیں تو کسی کو غسل کا پانی لگانے کے لئے، کوئی سوٹ کیس کھول رہا ہے تو کسی کو دیر سے آنے کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرزنش ہو رہی ہے۔ دفتر سے لوٹتے تو یہی ہنگامہ ہوتا۔ نچلا بیٹھنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ گرمیوں کی سہ پہر کو بھی کم سوتے۔ خط لکھوا رہے ہیں۔ میٹنگ کا ایجنڈا دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں کے مسائل سن کر مشورہ دے رہے ہیں۔ چھوٹے موٹے کام ملازموں کے سپرد کر رہے ہیں۔ اس ہاؤ ہو سے بے نیاز ایک آہستہ خرام ہستی اطمینان سے اپنا کام کیے جاتی اور وہ تھا گھر کا سنبھالنا۔ ابا کھانا کمرے میں منگواتے تو سینی سینت کر باہر بھجوا دیتیں۔ لوکی کا رائیتہ، پودینے کی چٹنی، موسم کا پھل۔ ہر چیز کی خود نگہبانی کرتیں کہ کوئی کسر نہ رہ جائے۔

ایک دفعہ ابا نے بٹیر اندر بھجوائے اور تاکید کی کہ مہمانوں کے لئے مسالے میں بھون کر بنائیں۔ بٹیر سنبھالنے لگیں تو امی کی پالتو بلیاں آگئیں۔ امی نے تین چار بٹیر ان کی طرف پھینک دیے۔ باورچی کے احتجاج کرنے پر کہا: ''وہ اس نظر سے تک جو رہی تھیں، اور ہاں بٹیر ایسے صحت مند بھی نہ تھے۔'' پھر بلیوں سے پیار کا قصہ سنایا: ''فیروز پور میں دونوں بیٹے مغرب کے وقت صحن میں کھیل رہے تھے۔ قریب ہی چنبیلی کے بوٹے تھے۔ اتفاقاً میری نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک سانپ بچوں کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے اور بلی پنجہ مار کر اسے پیچھے ہٹا دیتی ہے۔ ملازم کو بلوا کر سانپ مروا دیا۔'' گویا مشکل کے وقت ایک بلی نے بچوں کی حفاظت کی اور امی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی سنت کو اپنا کر بلیاں پالنی شروع کر دیں۔ ماں کی ممتا بھی کیا چیز ہوتی ہے!

گاہے ماہے امی اور ابا کے درمیان گفتگو کا ایک موضوع گھریلو اخراجات کا ہوتا کہ خرچ بہت ہو رہا ہے۔ امی جواب دیتیں: ''جو خرچ ہو رہا ہے، آپ کے سامنے ہے، ڈھکا چھپا تو ہے نہیں۔''

اغلب یہ ہے کہ بات کبھی محض بات کرنے کے طور پر ہوتی، کبھی ہلکی سی تنبیہ کے طور پر کہ ہاتھ روک کر خرچ کریں۔ اللہ کا فضل ہمیشہ شامل حال رہا۔ تنگی ترشی ہم نے نہیں دیکھی۔ کتر بیونت کی نوبت بھی کم آئی، مگر آزادی سے پہلے دولت کی ریل پیل بھی نہ تھی۔ آخر ایک بھرے گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے نپی تلی تنخواہ ہی تھی۔ اس میں میں اسراف کی گنجائش کہاں تھی!

تواضع اور مہمان نوازی میں ابا کا نام روشن کرنے میں امی کا کتنا ہاتھ تھا! ابا کے احباب ان کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دم دیا ہوا پلاؤ اور حیدر آبادی خستہ کوفتے اکثر یاد کرتے۔ ملک فتح خان مرحوم کسی زمانے میں فیروز پور میں سول جج تھے۔ برسوں بعد لاہور میں انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا: ''تمہاری امی جو کھیر بناتی تھیں، وہ بے نظیر چیز تھی۔''

اور یہاں...... نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا...... بس ایک لگن تھی، فرض کی ادائی۔ ہر حرکت فطری تھی جس میں دکھاوے کا شائبہ تک نہ تھا۔ جیسا کردار تصنع سے پاک تھا، ویسی روزمرہ کی زندگی تھی۔ شور و شغب اور ہنگامہ ہائے رستاخیز کے اس سمندر میں امی کی حیثیت ایک ہرے بھرے پرسکون جزیرے کی تھی۔ بپھری ہوئی لہریں کنارے سے ٹکرا کر لوٹ جاتیں۔ زندگی کے معمول میں فرق نہ آتا۔ ابا مذاق کرنے سے نہ چوکتے۔ کوئی منچلا جوال دے دیتا۔ بے تکلفی سے چٹکی لے لیتے۔ وہ چیختا: ''شیخ صاحب میری توبہ!'' بھرا بھرا پر رونق گھر ابا کے اٹھ جانے سے بے رونق ہو گیا۔ وہ بزم برہم ہو گئی۔ وہ انجمن انجمن نہ رہی۔

زندگی کے مدارج طے کرتے ہوئے ابا نے بڑا عروج پایا۔ انگریز کے زمانے میں اعلیٰ سرکاری ملازمت، بڑے لوگوں سے ذاتی مراسم، غیر منقسم ہندوستان میں مجلس آئین ساز کی رکنیت، پنجاب اسمبلی اور مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت، تعلیمی اور سماجی بہبود کے اداروں کی سربراہی اور کیا کیا کچھ۔ دولت کی ریل پیل ہو تو دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اقتدار حاصل ہو جائے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ بوالعجبی یہ کہ اعلیٰ عہدہ میاں پائے اور رعونت بیگم کی چال ڈھال سے مترشح ہو۔ عزیزوں اور ہم عصروں میں ممتاز ہونے کے باعث آنکھیں پھیر لینا پرانی ریت ہے۔ خدا جانے امی عالی ظرفی کے کس مقام پر تھیں کہ کوئی چیز اثر انداز نہ ہوئی۔ ان کی وفات پر ایک عزیز نے کہا تھا: ''جیسا اس روز دیکھا جب بیاہی آئی تھیں، آخر دم تک ویسا ہی پایا۔ ان کے رویے میں سرمو فرق نہ دیکھا''...... یہ بات اکتسابی یا شعوری نہیں، فطری تھی۔

Life is to give

یہ سبق میں نے اپنی آپا سے سیکھا تھا۔ دھلی دھلائی نورانی شکل، سرگودھا کی رہنے والی یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورت تہبند میں بڑی باوقار معلوم ہوتی تھی۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھی، مگر ہر بات دعائیہ کلمہ سے شروع کرتی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند۔ کام کاج میں مستعد۔ اپنا کوئی بچہ نہ تھا، اسی لئے خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ہر ماہ وہ اپنی تنخواہ سوکن کو دے آتی۔ سوتیلے بچوں کے لئے کپڑے لتے اس کے سوا۔ ''ان بیچاروں کے پاس بھی کھانے کے لئے کچھ نہیں۔'' ای کی زندگی بھی اس مقولے کی عملی تفسیر تھی۔

ہر شخص کو اپنی ماں بے مثل نظر آتی ہو گی۔ میری ای تو تھیں ہی بے مثل، اس پاکیزہ جاں کو غبار کدورت چھو تک نہیں گیا تھا۔ حسد، بغض اور کینہ ایسے لفظوں سے وہ یکسر ناآشنا تھیں۔ وہ اسم بامسمّٰی تھیں۔ زندگی بھر انہوں نے سلطان کی طرف راج کیا، مگر ان کی زبان سے میں نے کبھی ہلکی بات نہیں سنی۔ نہ کسی حرکت میں نخوت کی جھلک نظر آئی۔ جگ کی بھلائی مانگ کر انہوں نے اپنے بچوں کی بھلائی چاہی کہ اس زمانے کی یہی ریت تھی۔

عجیب بات ہے کہ انہوں نے کبھی گلہ نہیں کیا تھا: ''اتنی دیر سے مجھے ملنے نہیں آئے یا خط نہیں لکھا، فون تک نہیں کیا'' ...... رخصت ہوتے وقت اتنا ضرور کہہ دیتیں: ''اتنی جلدی؟ خدا کرے جلد جلد نظر آتے رہو'' ...... اپنی ذات کے لئے کوئی خواہشات نہ تھیں۔ سب تمنائیں، ساری دعائیں بچوں کے لئے وقف ہو کے رہ گئی تھیں۔

حکومت کی طرف سے مجھے خطاب ملا تو میں کراچی میں تھا اور وہ لائل پور میں۔ اخبار میں خبر دیکھ کر عزیز واقارب، دوست احباب مبارک باد کے لئے آنے لگے تو بھائی سے پوچھنے لگیں: ''یہ جو اتنے لوگ آ رہے ہیں سچ بتاؤ یہ کوئی اچھی چیز ہوتی ہے؟'' ...... ایسے ماحول میں اتنی سادہ دلی!

چند برس پہلے مجموعہ مضامین چھپنے پر مجھے ایک ادبی انعام ملا تھا۔ لائل پور جانا ہوا تو میں نے ای کے ساتھ لاڈ کیا ...... ''ایک کتاب لکھنے پر مجھے دس ہزار روپے کا انعام ملا ہے۔'' ایک دلفریب مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ پھر جیسے سنبھل کے بے یقینی کے انداز میں کہنے لگیں: ''واہ! اتنا بڑا انعام تمہیں کیسے مل سکتا ہے؟'' ...... ان کی نظر میں، میں ابھی بچہ ہی تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رفتہ رفتہ گھر کے کام کاج میں امی کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ پھر بھی فارغ نہ بیٹھتیں۔ کبھی سلائی کی مشین چلنے لگتی، کبھی سینا پرونا لے بیٹھتیں، کپڑے سینت لئے یا کوئی رسالہ اٹھا لیا۔ آخر عمر میں ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' کی جگہ ''اخبار خواتین'' نے لے لی تھی۔ عمر رواں کے بڑھتے ہوئے سائے اپنی قیمت وصول کر رہے تھے۔ ایک طبعی عمل جاری تھا۔ وہ جو شمع سوزاں کی طرح ہمارے لئے پگھلتی تھی، دعائے نیم شب میں ہمیں یاد کرتی تھی، اب اپنی ذات میں تحلیل ہو رہی تھی۔

عمر کے آخری حصے میں وہ بیماری کے ہاتھوں عاجز تھیں، از خود کروٹ لینا بھی محال تھا۔ بات کرتیں تو سانس پھول جاتا۔ آفتاب شام کو اذن غروب مل چکا تھا۔ ڈھلتے سایوں تلے زیست کی ریگ رواں ایک نقطے پہ آ کے رکنے کو تھی، مگر ڈوبتے سورج کی کرنوں سے باقی ماندہ ذرے اب بھی جگمگا رہے تھے۔ سب کے لئے وہی ملائمت، وہی شفقت۔ اس حالت میں بھی اپنی تکلیف کے متعلق حرف شکایت لب پہ نہ آیا۔ جب بھی طبیعت کے متعلق پوچھا، ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا: ''شکر ہے، اب بہتر ہوں۔'' ان دنوں بھی قران کریم سے شغف برقرار رہا۔ ہفتے میں ایک دو بار ایک خوب صورت قرات کرنے والی حافظہ کو بلوا بھیجتیں اور اسے قرات کے لئے کہتیں۔ نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ارد گرد بیٹھنے والوں سے پوچھ لیتیں: ''میں نے مغرب کی نماز پڑھ لی ہے: '' پھر بیساختہ ہنس دیتیں...... ''یاد ہی نہیں رہتا کہ نماز ادا کی ہے یا نہیں۔''

ایک دفعہ لائل پور پہنچنے پر حفظ مراتب کے علی الرغم میں نے چھوٹے شیخو کو اشارہ کیا کہ امی کو سلام کر کے پیار لے۔ اس ''پروٹوکول'' میں زہرا نظر انداز ہو گئیں۔ باتیں کرتے ہوئے امی نے دفعتاً ہنس کے کہا: ''لو تمہیں پیار کرنا میں بھول ہی گئی''۔ اٹھیں اور منہ سر چوم کے پیار کیا۔ اس پر زہرا نے آہستگی سے کہا: ''بہو ساس کا رشتہ کتنا مقدس ہے۔ جانے لوگ کیوں باتیں بناتے ہیں۔ میں دعا مانگتی ہوں کہ اپنی بہوؤں کو میں ایسی ہی نظر آؤں جیسی بی بی مجھے نظر آتی ہیں۔'' ساس کے لئے بھی اس سے بڑھ کر خراج عقیدت کیا ہو سکتا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیماری کے دوران سلام کے لئے لاہور سے جانا ہوتا، وہ بستر پر لیٹی ہوتیں۔ میں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کے قدرے شوخی سے ''السلام علیکم'' کہتا۔ لحہ دو لمحہ چہرے کا اتار چڑھاؤ، پھر وہ نو وارد کو پہچان لیتیں۔ نام لے کر پکارتیں۔ آنکھوں میں چمک آجاتی۔ دل پذیر مسکراہٹ کی کلیاں کھل جاتیں۔ بے اختیار ہنسی کی گھنٹیاں بجنے لگتیں اور آغوش محبت وا ہو جاتی۔ پہلے پہل گاؤ تکیے کا سہارا لے کر پلنگ پر نیم دراز ہوتی تھیں۔ تب معانقے میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینا آسان تھا۔ رفتہ رفتہ نقاہت بڑھ گئی۔ بستر پر اٹھ کے بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں جھک کے پیشانی پر بوسہ دیتا۔ ایک دفعہ پیار لینے کے لئے میں کافی نہ جھک سکا۔ آغوش میں نہ لے سکنے سے ان کی تسلی نہ ہوئی اور فرط محبت سے میرا ہاتھ چوم لیا۔

یہ سب کچھ میرے جیون کا حصہ ہے۔ گریزاں لمحوں کی خوش رنگ تتلیاں میں نے یادوں کے جال میں محفوظ کر لی ہیں اور دیدار دوست کی دولت بھی۔ میں وہ روئے زیبا تکتا رہتا جو کبھی طراوت اور تازگی کی تصویر تھا۔ اب سنبل ایسے گھنگریالے بالوں میں سپیدی نمایاں ہو چلی تھی۔ پر نور چہرے سے شعائیں اب بھی نکلتی تھیں۔ مسکراتیں تو ماتھے کی لکیریں کافور ہو جاتیں جیسے نور کا باریک سا آنچل اوڑھ لیا ہو، وہ تصویر دل پہ نقش ہے۔

ایہہ تن میرا چشماں ہووے، میں مرشد دیکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجاں ہو

(سلطان باہوؒ)

سن رسیدہ ہونے کی ایک علامت یادداشت کا جزوی طور پر محو ہو جانا ہے۔ پچاس برس پہلے کے قصے تو حافظہ میں محفوظ تھے، مگر کوشش کے باوجود کل کی بات یاد نہ رہتی۔ انہیں خاموش پا کر ہم کہتے: ''امی، حیدر آباد دکن کی کوئی بات سنائیں۔ ابا کو پہلے پہل وہیں ملازمت ملی تھی۔''

''ہاں بہت طویل سفر تھا۔ گاڑی دو روز چلتی رہی تھی۔ ڈبے کے مخملیں گدے تھے اور چاروں طرف آئینے لگے تھے۔ وہاں غربت بہت تھی، ایک روز میں نے پوچھا لوگ مٹی کیوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریدتے رہتے ہیں؟ کسی نے بتایا کہ زمین سے مونگ پھلی نکالتے ہیں۔ اسی پر گزر اوقات ہے۔ انہیں گندم کا آٹا میسر نہیں۔"

"اور حضرت گیسودراز کا مزار بھی تو گلبرگہ میں تھا، جہاں ابا ملازم تھے۔"

"ہاں تمہارے ابا کے ساتھ میں وہاں گئی تھی۔ ایک شخص کو وہاں دیکھا جس کی دونوں ٹانگیں کسی حادثے میں کٹ گئی تھیں، وہ درد سے بے تاب ہو کر چلا رہا تھا: "یا حضرت بندہ نواز گیسو دراز۔"

ایک شخص اسے کاندھوں پر اٹھائے مزار کے گرد گھوم رہا تھا....." نصف صدی کی غربت اور ایک مجروح شخص کا کرب یاد کر کے امی آبدیدہ ہو گئیں۔

انتقال سے چند ہفتے قبل ان سے رخصت ہوتے وقت ایک دو مرتبہ احساس ہوا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ یہ روئے تاباں میں پھر بھی دیکھوں گا؟ آخری ملاقات یک طرفہ تھی۔ وہ ہوش میں نہ آئیں۔ ہم بے بسی سے شمع کا ٹمٹمانا دیکھا کیے۔ لو جھلملائی اور ایک لمحہ کے لے تیز ہو کر بجھ گئی۔

بچپن سے جوانی اور شباب سے بزرگی تک امی نے کتاب حیات کا ایک ایک ورق کھنگالا تھا۔ اپنے ماں باپ کے زیر سایہ معصوم بچپن گزارا۔ خاوند کا عروج دیکھا۔ بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔ غم کے چرکے سہے۔ ہر باب دلاویز تھا۔ ہر صفحے میں اخلاص کی بوباس تھی۔ ہر حرف قند مکرر کا مزہ دیتا تھا۔ تبھی تو ہم بھولی بسری کہانیاں بار بار سنتے۔ وہ سنا کے بھول جاتیں۔ ہم انجان بن کے دوبارہ چھیڑ دیتے اور سیف الملوک کے وہ گنے چنے اشعار سنانے کے لئے کہتے جو انہیں یاد تھے۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے، سدا نہ باغ بہاراں

سدا نہ راجے راج کریندے، سدا نہ سنگت یاراں

آخر جدائی کا وہ لمحہ آن پہنچا جس کی طرف وہ اشارہ کرتی تھیں۔ رانی کا راج تو اس دن ختم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گیا تھا جب ابا کے سانس پورے ہوئے۔

امی کی اس تصویر پر امتداد وقت کی پرچھائیاں ہیں، یہ اس دور کی یادگار ہے جب بیر بہوٹی کی طرح سرخ لبادے میں لپٹی لپٹائی وہ دادی اماں کے پاس بیٹھی ہوتیں۔ ملنے والی عورتیں پوچھتیں: ''خیر سے یہ محبوب الٰہی کی دلہن ہے؟'' دادی اماں اثبات میں سر ہلا دیتیں اور نظر بد کے ڈر سے امی کو اندر جانے کے لئے کہتیں۔ انہیں گوارا نہ تھا کہ امی کو کوئی آنکھ بھر کے دیکھے۔ شادی کے بعد ابا انگلستان چلے گئے۔ امی کا آدھا وقت سسرال اور آدھا میکے میں گزرتا۔ نانا ابا محکمہ تار میں ملازم تھے۔ دفتر میں کام کر رہے تھے کہ اردلی نے آکر ابا کی آمد کی اطلاع دی: ''پروہنا جی آئے نیں، اپنے سوہنے میم معلوم ہندے نیں۔''

یہ تھا ایک طویل رفاقت کا نقطۂ آغاز، جسے نصف صدی پر محیط ہونا تھا۔ یہ سب سچ سہی۔

پر تری تصویر قاصد گر یہ پیم کی ہے

شاید امی کو علم نہ تھا کہ ان میں حس لطیف موجود ہے۔ رنگ کے معاملے میں وہ بڑی نفاست پسند تھیں۔ انہیں ہلکے رنگ مرغوب تھے۔ ہلکے ملگجے رنگ جیسے قوس قزح میں رنگوں کے کنارے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ماند پڑ جائیں۔ سوئم کے موقع پر تین خوش الحان بچے تجوید کے تحت سورۂ رحمٰن کی تلاوت کر رہے تھے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○ کی آہنگ بازگشت فضا میں گونج رہی تھی۔ سامعین پہ رقت طاری تھی۔ بادلوں کی اوٹ میں قوس قزح کے پیارے رنگ فضائے بسیط میں بکھر گئے تھے۔ ایسے میں ان کی روح کس قدر شادکام ہوئی ہوگی۔ امی کے اٹھ جانے سے آبائی گھر اداس ہو گیا۔ در و دیوار پہ عالم محبوبی کی جگہ رخصت ہوتی ہوئی زرد دھوپ نے لے لی۔ راتوں رات در و دیوار کے معنی بدل گئے۔ شاہتوطرز کا گھر خشت و سنگ کا انبار رہ گیا۔

اب کوئی میری راہ نہ تکے گا۔ کوئی نہ کہے گا: ''ایسی بھی کیا جلدی ہے، دو چار روز تو اور رک جاؤ۔''

اب وہ محبوب آواز کہاں سنوں گا جو کانوں میں رس گھولتی تھی اور وہ دعائیں جن کی نغمگی روح کے تار چھیڑتی تھی۔ اپنے خالی ہاتھوں کی طرف نظر اٹھے گی جنہوں نے کبھی ایک کھلتا ہوا چہرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالے میں لیا تھا۔ امی سچ کہتی تھیں: ''سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں۔''

ماں باپ کے قرب سے انسان کا جی نہیں بھرتا۔ اب اندھیری راتوں میں یادوں کے جگنو جل دیتے ہیں۔ پچھلے پہر کے سناٹے میں بے نام خیال ذہن کے غرفے میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔ وہ دن گزر گئے جب پرندوں کے مدھم سر صبح کاذب کی خبر دیتے تھے اور پو پھٹنے سے پہلے نغمے کا دھارا پھوٹتا تھا، اب چاروں اور خاموشی اور اداسی ہے۔ ضرور خزاں کی آمد ہوگی۔

جب کبھی بادل گھر آتے ہیں اور اونچے لانبے سفیدے مستانہ وار جھومتے ہیں اور ہوا کی خنکی راحت کا پیام لاتی ہے تو میرا یقین محکم ہو جاتا ہے کہ رب کریم کے حضور امی کا عجز و نیاز قبول ہوا ہوگا اور جرس رحیل کے سمے انہیں ابدی راحتوں کی نوید ملی ہوگی۔

فلما رایت الناس شد وا رحالھم ۔ الیٰ بحرک الطامی اتیت بجرتی

''جب میں نے دیکھا کہ لوگوں نے اونٹوں پر کجاوے کس لئے ہیں اور تیری سخاوت کے بحر زخار کا رخ کر لیا ہے تو میں بھی گھڑا لے کر آن پہنچا۔''

''کوئی جنت ماں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔'' یہ فقرہ کان میں کیا پڑا کہ اک لرزش خفی بدن میں دوڑ گئی۔ واقعی وہ اک جنت گم گشتہ تھی...... مگر گم گشتہ کیوں، وہ جنت تو ہر دم آباد ہے، ہر آن میری رفیق۔ میرا دامن رنگا رنگ نعمتوں سے بھر گیا۔ جھولی میں چھید بھی ہوئے، لیکن جو کھویا تھا اس سے کہیں زیادہ پایا۔ کبھی عزیزوں کی الفت نقش بر آب ثابت ہوئی، کبھی دوستی کا دیا آندھی کی زد میں آیا، مگر ماں کی بے لوث محبت بے مہری ایام کا تریاق تھی۔ اس پیار نے قدم قدم پر یقین کی شمعیں روشن کیں۔ اب صحبت مادر ہوگی نہ کوئی طفل سادہ، والدہ کی وفات سے پیار کا وہ رشتہ ٹوٹ گیا جس نے کلیت (cynicism) سے محفوظ رکھا تھا۔ خود غرضی، خود ستائی اور ''نرگیست'' کا آئینہ دکھانے کے لئے زندگی سامنے آن کھڑی ہوئی۔

یہ احساس کہ امی کی جدائی عارضی ہے اور میری لغزشوں کے باوجود رب کریم مجھے دید دوست سے محروم نہیں رکھے گا، حق الیقیں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ مٹی میں مل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مٹی کہاں ہوا، وہ زندگی کے سفر میں ہر لحظہ میرے سنگ ہے۔ گرد و غبار کی کثیف تہیں ڈھل جاتی ہیں۔ اوپر تلے گزرنے والے ماہ و سال کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔ وہ مانوس فضا نظروں میں گھوم جاتی ہے جہاں برسوں بسیرا رہا تھا۔ خندہ زن، فکر سے آزاد، ماں باپ کی قربت میں زمان و مکان کی زنجیریں پگھل جاتی تھیں، یہ بھی یاد نہ رہتا کہ اپنے بچے جوان ہو رہے ہیں اور آتشدان کے گرد حلقہ باندھ کے وہ یوں ہی بیٹھتے ہیں جیسے کبھی ہم بیٹھا کرتے تھے کہ قدرت کا یہی نظام ہے۔

اب بچوں کے ساتھ ہم اپنی جنت بسائے ہوئے ہیں۔ چند روز ہوئے لاہور میں رہنے والے بہن بھائی ہمارے ہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کی آمد سے گھر جگمگا اٹھا تھا۔ قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔ رنگینی محفل کے جلو میں گزرے دنوں کی بو باس تھیں۔ پرانی یادیں عود کر آئیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں، بچپن کی حماقتیں، اس زمانے کے مذاق۔ گزرے لمحوں کو آواز دینے سے کلفت کافور ہو گئی۔ شکر رنجیاں باتوں کے رس میں ڈوب گئیں۔ مہر و وفا کے سوتے ابل پڑے۔ کتنے ہی خوش رنگ پھول دامن میں آ گرے۔ محمود میاں موڈ میں تھے۔ وہ اس انداز سے پھلجھڑی چھوڑتے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ پرانے قصے سننے میں چھوٹے بڑے برابر کے شریک تھے۔ بچے بڑے شوق سے پوچھتے: ''انکل پھر کیا ہوا تھا......؟'' اس ہنستی کھیلتی محفل میں مجھے محسوس ہوا کہ امی کا مسکراتا ہوا چہرہ ہمیں پیار سے تک رہا ہے، جیسے انہیں طمانیت ہو کہ زندگی کا سفر سہل ہو گیا۔

اس ہاتھ کا لمس یاد ہے۔ گرم پیشانی پر آخری بوسہ دیا ہے۔ اب ایک خلا ہے جو پر نہیں ہوتا۔ ایک یاد ہے جو محو نہیں ہوتی۔ ایک رمیدہ خوشبو جس کی مہک باقی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک فقیر ماں کا بیٹا

اصغر ندیم سید شاعری اور ڈرامے کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے نثر اور شاعری کے میدان میں جو شہرت حاصل کی۔ اُن کے لکھے ڈراموں نے اُسے مزید آگے بڑھایا۔ یوں وہ جدید اُردو ڈرامے کی دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ اُنہوں نے کئی لازوال اور شہرہ آفاق ڈرامے تخلیق کیے۔ جنہیں عوام ابھی تک نہیں بھول سکے۔ ایک چھوٹے شہر سے آ کر ایک بڑے شہر میں عزت، دولت اور شہرت حاصل کرنے کے سخت، مشکل اور جدوجہد سے بھرپور کام کا کریڈٹ وہ اپنی والدہ محترمہ کو دیتے ہیں۔ اِس مضمون میں انہوں نے اپنی والدہ کو جن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے اور عقیدتوں کے خراج سے کشیدہ معلوم ہوتے ہیں۔

•••••••••••••••••••••

میں ایک ڈرا ہوا بچہ تھا۔ مجھے دُنیا کی ہر شے سے خوف آتا تھا۔ گھر سے باہر گلی میں ہر گزرنے والا آدمی مجھے بچے اغوا کرنے والا اخرکار لگتا تھا۔ گھر کے اندر اپنے والد سے ڈرتا تھا۔ ان کی موجودگی میں ہم سب بہن بھائی ادھر ادھر دبکے رہتے تھے۔ ایسے میں جس ہستی کے گرم گرم پروں کے نیچے ہمیں پناہ ملتی، وہ ہماری ماں تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں ان کے متعلق کچھ لکھ سکوں گا۔ جس ہستی کا عکس یا سایہ میری پوری ذات میں گھل مل گیا ہو، اس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے، اسے اظہار میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی عاجزی میں یہ تحریر لکھی جا رہی ہے۔ اور شاید میں اپنی ماں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخصیت کا بہت ہی مختصر حصہ اس تحریر میں دریافت کرسکوں۔ میری ساری یادیں کچی مٹی میں گندھی ہوئی ہیں۔ میں ایک کچے گھر میں پروان چڑھا ہوں اور مٹی میں سوتا جاگتا رہا ہوں۔ ویسے بھی ملتان مٹی کا بنا ہوا شہر ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کی بوباس میں صدیوں پرانی تہذیب اور تاریخ سانس لے رہی ہے۔ اس مٹی کی بڑی لذت ہے۔ اس میں آدمی کو اداسی ملتی ہے، عشق ملتا ہے، فقیری ملتی ہے، درد ملتا ہے، عاجزی ملتی ہے۔ اسی نے مجھے صوفیاء کے سوز وساز سے آشنا کیا ہے۔ دردمندی اور مٹھاس اس شہر کے رہنے والوں کی نس نس میں رچی بسی ہے۔ میں نے ملتان کو اپنی ماں کے مزاج سے سمجھا ہے۔ وہ پوری تہذیب کی شناخت ہے۔

میری ماں ایک غریب گھر سے دوسرے غریب گھر میں خاموشی سے اٹھ آئی جہاں اللہ نے انہیں جو پہلی اولاد بخشی وہ میں تھا۔ اوپر نیچے ہم پانچ بہن بھائیوں کو زندگی کے گرم اور سرد موسموں سے بچاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر کبھی کسی قسم کا شکوہ نہ اپنے خدا سے پیدا ہوا، نہ اپنے مجازی خدا سے۔ وہ ان ماؤں کی نمائندہ ماں ثابت ہوئی جو اپنے گھر کا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ اور یاد رہے، یہ وہ زمانہ تھا جب گھروں میں گیلی لکڑیوں کی آگ پر بغیر پریشر ککر کھانا پکا کرتا تھا اور دالیں ذرا دیر میں گلا کرتی تھیں۔ اپنی آدھی سانسیں تو انہوں نے آگ جلانے پر صرف کر دیں اور باقی سانسیں وہ ہمیں گرمی مہیا کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔ آج بھی ان کی دعائیں چھتری بن کر میرے سر پر تنی ہوئی ہیں۔ وہ اللہ کے فضل سے آج بھی سارا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دے رہی ہیں اور آج بھی ان کے ہاتھ کے کھانے کی لذت اسی طرح قائم ہے۔

اسی خوشبو کو جب میں نے اپنی بیوی کے کھانوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو بہت مشکل پیدا ہوئی۔ ہر آدمی بیوی تو اپنی مرضی کی چاہتا ہے لیکن اس کے ہاتھ میں ذائقہ ماں کا دیکھنا چاہتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے اپنی بیوی کو کھانے کے ذائقے اور ترکیبیں سمجھانے میں کچھ وقت لگا، لیکن چونکہ وہ خود بھی کھانے پکانے کا بہت شوق رکھتی تھی، اس لئے اس نے میری ماں کی طرح کھانوں میں روایتی لذت کو دریافت کرلیا۔ ہم نے سادہ زندگی دیکھی، جو سائیکل کے دو پہیوں پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوار ہوتی ہے اور اسی کی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ ہم نے آج کے ٹی وی پر دکھائے جانے والے گلیمر کی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے ہماری ماں نے ہمیں بڑے بڑے خواب نہیں دکھائے۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ پاکستان کی سماجی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں اور کہاں کہاں سے ناجائز دولت گھروں میں گھر کرنے والی ہے اور گھر کیسے بدلنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کی ہتھیلی پر کوئی ایسی رقم نہیں آتی تھی جو مستقبل کے خواب خرید سکتی، اس لئے اس نے اپنے ہاتھ اپنے جھاڑو اور ڈوئی پر مضبوطی سے پیوست رکھے اور نظر اپنی اولاد کی چال پر رکھی۔ اس نے اپنے روزانہ خرچے والی صندوقچی کو تالا تو لگایا، مگر چابی کہیں آس پاس ہی رہنے دی تا کہ ضرورت مند بچوں کو پیسے نکالنے میں سہولت رہے۔ اس نے پنجیری اور سوہن حلوے کو چھپا کر رکھا مگر جس گھر میں چھپانے کے لئے دو چار ہی جگہیں ہوں وہاں کوئی شے چھپی نہیں رہتی، اور اس بات کا ہماری ماں کو پتہ تھا۔ اس لئے وہ چھپائی ہوئی چیز کو دوبارہ وہاں ڈھونڈنے نہیں جاتی تھیں۔

اگر ماں کو یہ پتہ نہ ہو کہ اس کے بچے کس وقت کیا چاہتے ہیں اور ان کے اندر کی خواہشیں انہیں کہاں کہاں پریشان کر رہی ہیں تو میں سمجھتا ہوں وہ ایک مکمل ماں نہیں ہوتی۔ میری ماں کو میرے اندر پلنے والی خواہش سے پہلے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب میرا مطالبہ کیا ہوگا اور اس کے لئے کی گئی بھوک ہڑتال کتنی دیر رہے گی۔ اس لئے وہ مقررہ وقت پورا ہونے سے ذرا دیر پہلے کھانا لے کر آتی تھی اور جھوٹا سچا وعدہ کر کے میری بھوک ہڑتال ختم کرانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

میں نے بچپن اور لڑکپن میں اپنی ماں کو بہت تنگ کیا ہے، جوانی میں البتہ میں نے انہیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ نہ تو محلے سے کوئی شکایت ان تک پہنچی، نہ ہی انہیں رشتہ ڈھونڈنے اِدھر اُدھر جانا پڑا۔ اچھی خاصی پڑھی لکھی بہو کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ شاید میری یہ بات میرے بچپن کے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔ میری ماں کو معلوم تھا کہ اس کے بچوں کو کوئی چیز احتجاج اور ضد کے بغیر نہیں مل سکتی، اس لئے اسے روزانہ ہماری ضدوں اور بھوک ہڑتالوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ ہماری بھوک ہڑتال توڑنے کے نسخے بھی جانتی تھی۔ ہمارا حال یہ تھا کہ اگر ہمیں سردیوں کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوٹ سلوانا ہے تو پینٹ ایک سردیوں میں ملتی تھی تو کوٹ دوسری سردیوں میں نصیب ہوتا تھا۔ اس لئے سردیوں کی چیز کے لئے ہم گرمیوں میں ضد کرنا شروع کر دیتے تھے اور اپنے والد سے مار نے کی ابتدا کرتے تھے۔ میں نے اپنے باپ سے بہت مار کھائی ہے، لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی ماں نے مجھے جھوٹ موٹ بھی ہاتھ مارا ہو۔

شاید یہی وجہ ہے کہ والد کے گھر سے جانے کے بعد خوشی کی جو لہر ہمارے اندر اٹھتی تھی اس کا اثر پورے گھر پر پڑتا تھا، لیکن ماں کو ہمارے بابا کی زیادہ غیر حاضری میں چھپے ہوئے خطرے کی دھمک جلدی سنائی دینے لگتی تھی۔ اس کے شک کی کچھ بنیادیں بھی تھیں۔ اس لئے وہ ہمارے بابا میں کسی اور عورت کی شراکت سے خوف کھاتی تھی۔ ساری زندگی وہ اس مسئلے سے دو چار رہی۔ اسے کسی بات نے نہیں ڈرایا۔ وہ کم پیسوں سے کبھی پریشان نہیں رہی۔ کم کپڑوں اور کم خوراک اور کچے گھر میں وہ گیندے کے پھول کی طرح خوشی سے کھل اٹھتی تھی لیکن اس بات کو وہ کبھی قبول نہ سکی کہ کوئی ہمارے بابا کو پسند آئے، یا کوئی ہمارے بابا کو پسند کرلے۔ بہر حال زندگی کا وہ وقت اب گزر چکا اور ان کے شکوک ختم ہو چکے ہیں اور وہ زندگی میں ایک کامیاب خاتون ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ یقیناً اس وقت بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں گی کہ ان کے سب بچے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہیں۔ ایسا اس لئے بھی ہے کہ میری ماں کا نام اقبال بیگم ہے۔ انہیں اقبال مند ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن اپنی ماں کسے اچھی نہیں لگتی اور اس کی خوبیاں ہی خوبیاں ہر ایک کو نظر آتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ماں اگر اچھی ساس بن جائے تو پھر بیٹوں کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ماں نے ہر روپ میں اپنے بیٹوں کے خوابوں کی حفاظت بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ میں نے اپنی پسند کی شادی کی ہے، جسے انہوں نے قبول ہی نہیں کیا بلکہ بہو کو یہ احساس بھی دلایا کہ وہ ان کی بھی پسند بن گئی ہے۔

مجھے ذرا ذرا سا یاد ہے کہ مجھے اپنی ماں کا پلو پکڑ کر چلنے کی عادت تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی ان سے الگ نہیں ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی مہمان یا رشتے دار آجاتا تو میں ان کے پیچھے چھپ جایا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا تھا۔ شاید مجھے یہ احساس تھا کہ ماں کی ہستی صرف میری ہے اور کسی اور کا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ احساس اتنا پختہ ہوگیا کہ جب ایک شام کسی شادی میں شریک ہونے کے لئے ماں تیار ہوئی اور زیور پہنا تو میں رونے لگا اور بہت رویا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔ میں نے ماں کو پہلی بار زیور اور شادی کے کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ مجھے لگا کوئی میری ماں کو مجھ سے چھین رہا ہے۔ جب ماں نے زیور اتارے تو مجھے سکون آیا۔ پھر ایک زمانے تک میں نے انہیں اس عالم میں دوبارہ نہیں دیکھا۔

میں بہت خرچیلا تھا۔ اِدھر اُدھر گھر کے سودا سلف سے پیسے مارنے کی مجھے عادت پڑ گئی تھی اور پھر میں ان پیسوں کو باہر ہی ٹھکانے لگا آتا تھا۔ گول گپے، دہی بڑے، چھوٹے خوانچے والوں کی کھٹی میٹھی چیزیں، شکر قندی، موسمی پھل، جو ہاتھ لگ جاتا تھا یا جو ان پیسوں میں آسانی سے مل جاتا تھا، وہ کھا پی کر گھر آتا تھا، محلے میں میری ماں کی ساکھ کتنی اچھی تھی یا ان کی ایمانداری اور دیانت داری کا کیا عالم تھا، اس کی ایک مثال مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں اور میرا ماموں زاد تصویریں خریدنے اور البم بنانے کے خبط میں مبتلا ہو گئے۔ اتنے پیسے کہاں سے آتے۔ ہم نے محلے کے ہر گھر سے اپنی ماں کے نام پر قرضہ لے لیا۔ ہر گھر سے ہمیں بغیر تصدیق کیے مطلوبہ پیسے ملتے گئے اور ہم خرچ کرتے گئے۔ یہ بھول گئے کہ کسی نہ کسی دن تو یہ راز کھلے گا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ بعد سب نے اپنے پیسوں کے متعلق ہماری ماں سے بات کی تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کیا ماجرا ہے، کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی کسی سے ادھار نہیں لیا تھا۔ اپنی خواہشوں کو اپنے مجازی خدا کی آمدنی کے تابع رکھا۔ ضرورت سے زیادہ ایک ململ کا دوپٹہ نہیں خریدا۔ بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالا۔ انہیں بازار کا راستہ تک معلوم نہ تھا۔ جو کچھ بابا لے آتے وہی انہوں نے پہن لیا۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ میرا کام ہے تو انہوں نے وہ پیسے ہر گھر میں پہنچا دیئے اور میری شکایت بابا سے نہیں کی۔ وجہ یہی تھی کہ اس پر جو سزا مجھے ملنی تھی وہ انہیں منظور نہیں تھی۔

ہمارے گھر میں پہلی خوشی اس وقت داخل ہوئی جب میرے چھوٹے بھائی نے میٹرک میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بورڈ میں پوزیشن لی تو گھر میں پہلی بار کسی اخبار کا نامہ نگار داخل ہوا۔ پہلی بار گھر کے باہر کسی اخبار کا کیمرہ مین آیا۔ وہ دن اور آج کا دن میری ماں کو خدا نے بے شمار خوشیاں دے دی ہیں۔ اخبار کا نامہ نگار اور کیمرہ مین گھر پر دستک دیتا ہے تو ماں کو وہ پہلی خوشی یاد آ جاتی ہے۔ وہ اپنے نام کی طرح اقبال مند ہوتی ہیں اور شاید ان کے نام کی برکت میرے حصے میں باقی بہن بھائیوں سے زیادہ آئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ان کے پلو کو بہت پکڑا ہے۔ ابھی تک میرے ہاتھ میں ان کی دعاؤں کا پلو ہے اور میں اس کو تھام کر انشاء اللہ بہت دور تک جاؤں گا۔ میری ہر خوشی پر ان کا سایہ ہے، میرے ہر لفظ میں ان کی عطا کی ہوئی فقیری ہے اور فقیروں کے پاس بہت دولت ہوتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماں جی

بریگیڈیئر (ر) گلزار احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے بڑی ہی بھرپور زندگی گزاری ہے اور ان دنوں وہ جس عظیم الشان مشن کے لئے جوانوں کی طرح شب و روز کام کر رہے ہیں، اس سے ان کی حقیقی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کشمیر کاز نے انہیں طوفان بلاخیز بنا دیا ہے اور وہ اپنے علم اور تجربے کی ساری پونجی ایک اعلیٰ نصب العین پر نچھاور کیے جا رہے ہیں۔ شخصیت میں وہ مٹھاس کہ ایک بار ملاقات ہو جائے تو انہی کا ہو کے رہ جائے۔ اس مرد خود آگاہ نے اپنی والدہ کے بارے میں جو کچھ رقم کیا ہے وہ ہماری تاریخ اور ادب کا نہایت بیش قیمت حصہ ہے

••••••••••••••••••••••••

ماں جی کے متعلق میرے لئے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ گیارہ سال کی عمر میں مجھے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ سندھ مدرسۃ الاسلام کے ہوسٹل میں داخل کرا دیا گیا۔ جب میری عمر تیرہ سال کی تھی تو ماں جی داغ مفارقت دے گئیں۔ جو تھوڑی یادیں ان سے وابستہ ہیں وہ ان کے صبر و استقلال اور خاموش پیار کا مرقع ہیں۔ ماں جی سے متعلق پہلی یاد ایک سبق کی صورت میں حافظہ پر نقش ہے۔ درحقیقت یہیں سے میری یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ میری عمر اس وقت سات سال کے قریب ہو گی۔ میں اور میرے ساتھ کھیلنے والا نور محمد والد محمد خاں نائب صوبیدار ہمارے گھر کے برآمدے کے منقش چوبی ستون سے لپٹے کھڑے تھے کہ صحن کے مشرقی دروازے سے ایک ادھیڑ عمر خاتون داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں مری ہوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرغی لٹک رہی تھی جو نور محمد اور میرے پتھروں کا نشانہ بنی تھی۔ نور محمد کا پتہ نہیں مگر مجھ پر افسوس یا سرزنش کے خوف جیسا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مرغیوں کو پتھروں کا نشانہ بنانا ہمارا مرغوب کھیل تھا اور اس کھیل پر کبھی ڈانٹ نہیں پڑی تھی۔ ممکن ہے وہ بروقت حلال کر لی جاتی ہوں۔ اس خاتون نے دادی جان کی طرف دیکھ کر مگر باواجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''باواجی! آپ کے پوتوں نے آج پھر میری مرغی مار ڈالی ہے۔''

باواجی نے گھر میں موجود لڑکیوں کو حکم دیا:

''لڑکیو! کیسراں کو ایک مرغی پکڑ دو''۔

آپا راج بی اور اس کی سہیلی نے جھپٹ کر ایک مرغی پکڑی اور چاچی کیسراں کے حوالے کر دی۔ باواجی کھنکارے اور کچھ اس طرح کے الفاظ کہے:

''کیسراں! تمہاری مرغیاں تو جانور ہیں ہی، مگر یہ بچے بھی جانور ہی ہیں۔ مجھ سے جانور سنبھالے نہیں جاتے۔ تو ہی اپنی مرغیوں کو سنبھال کر رکھا کر''۔

چاچی کیسراں لوہاری مشرقی دروازے سے نکلی اور ہم دونوں مغربی دروازے سے دوڑ کر نور محمد کے گھر کے سامنے چبوترے پر اسی کھیل میں مصروف ہو گئے اور کیسراں کے گھر پہنچنے سے قبل ہم نے سامنے والی ڈھیری پر چگنے والی مرغیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ایک مرغی پر نشانہ درست پڑا اور ہم بھاگ کر پھر باواجی کے زیر سایہ پہنچ گئے۔ نور محمد باواجی کا ہمشیرہ زاد تھا جسے وہ سکھوں سے شکست اور قید کے بعد چکری راجگان سے لے آئے تھے۔ اب جو گھر گیا تو ماں جی انگلی پکڑ کر گھر کے بڑے کمرے (پسار) میں لے گئیں اور نہایت آرام سے سمجھایا کہ مرغیوں کو بھی درد ہوتا ہے، ان کو نہیں مارنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہا کہ پرائی شے پر پتھر پھینکنا تو بہت بری بات ہے۔ کچھ اس انداز سے ہمیں سمجھایا کہ عمر بھر کسی غیر کی شے پر نگاہ نہیں کی۔ کاش اس نصیحت کے پورے الفاظ یاد رہ جاتے۔

ماں جی سے متعلق دوسری یاد دالمیال (تحصیل چوآسیدن شاہ ضلع چکوال) کے دور سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق ہے۔ بھایا (بڑے بھائی) گلزار حسین اور بھایا احمد خان (بڑی خالہ کا پوتا) اور مجھے دوالمیال کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ رہنے کے لئے دوالمیال کے ایک سلوتری صاحب کے مکان میں ایک کمرہ یا ممکن ہے پورا گھر ہی عاریتاً لے لیا گیا تھا۔ ماں جی ہمارے ساتھ تھیں۔ خود تو ناخواندہ تھیں مگر ہمیں پڑھنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ بھائی احمد خان پر اثر کم ہی ہوتا تھا۔ بھائی جان گلزار حسین محنتی طالبعلم تھے۔ میں کیا پڑھتا تھا کچھ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اسکول جا کر بیٹھتا ضرور تھا۔ تختی، سلیٹ، کاپی، کتاب کا استعمال یاد نہیں، حالانکہ مرغیاں مارنے سے یہ بعد کا زمانہ ہے۔

دوالمیال پرائمری سکول جو نصف صدی تک پرائمری سے ترقی نہ کر سکا، علاقے کا واحد پرائمری اسکول تھا۔ چودہ سال قبل ڈلوال کے راجا عبداللہ خاں کی عطا کردہ زمین پر بلجیم مشن نے ایک ہائی سکول شروع کیا تھا۔ ورنہ میلوں تک اور کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اسی خطے میں اب بارہ ہائی سکول اور ایک ڈگری کالج، ایک انٹر کالج اور دینی مدرسہ جو میٹرک تک تعلیم بھی ساتھ ہی دیتا ہے، موجود ہیں۔ ہم ہیں کہ اس پہلو اور دوسرے پہلوؤں میں آزادی کی نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔ دوالمیال کے سکول میں، میں کلاس میں کم ہی بیٹھتا تھا۔ ایک دن دو تین لڑکوں نے جو مجھ سے بڑے تھے، مجھے اٹھا کر جوہڑ میں پھینک دیا۔ دو تین غوطے کھائے۔ دردسے بھایا احمد خاں، جو خود بھی کلاس میں کم ہی بیٹھتا تھا دوڑ کر آیا اور مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ ماں جی کو پتہ چلا تو بھائی گلزار حسین کو تاکید کی کہ استاد سے کہے کہ اسے کلاس سے باہر نہ جانے دیں۔ معلوم نہیں کہ اس حادثے کی وجہ سے یا خود ہی خان جی والد صاحب کا خط آیا کہ وہ چھٹی آرہے ہیں اور ہم سب کو فیروز پور ساتھ لے جائیں گے۔ ماں جی پہلے بھی چھاؤنیوں میں رہ چکی تھیں۔ شاید اس لئے گھر میں اس سفر کا کوئی خاص چرچا نہ ہوا۔ چھوٹی آپا کو چھاؤنی میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ اسے دادی اماں کے پاس ہی رہنا تھا۔ بڑی آپا سجادہ بیگم کی شادی ہو چکی تھی، اس لئے گھر کے کام میں ماں جی کا ہاتھ بٹانے کے لئے ساتھ جانے والا کوئی نہ تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دن بھائی احمد خاں نے فیصلہ کیا کہ اسکول سے بھاگ کر گاؤں چلے جائیں۔ بھائی گلزار حسین بھی راضی ہو گئے۔ میری بساط ہی کیا تھی۔ انہوں نے کہا ہو گا اور میں ساتھ چل پڑا ہوں گا۔ راستے میں ایک جوہڑ تھا۔ وہاں رک گئے اور کیچڑ سے بیل اور گھوڑے بناتے رہے۔ وہ دونوں تو کھلونے بنانے میں مصروف تھے۔ میری نظر پڑی اور دیکھا کہ ماں جی تیز تیز چلی آرہی ہیں۔ ہم خاصی اونچائی پر تھے۔ وہ تقریباً دوڑ رہی تھیں۔ ہمارے نزدیک پہنچیں تو لپک کر مجھے اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ پھر ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا، مگر دونوں کو ایک ایک تھپڑ جڑ دیا۔ میں نے اس ایک واقعے کے علاوہ ماں جی کو غصے میں نہیں دیکھا۔ مجھے اٹھائے ہوئے ان دونوں کو اپنے آگے لگا کر واپس تین چار میل دوالمیال گئیں۔ ممکن ہے کہ اس واقعے کی اطلاع خان جی کو دی ہو اور اسی لئے ہمیں فیروز پور لے جانے کا فیصلہ ہوا ہو۔ ہمارے لئے یہ خبر خوش خبری کا مقام رکھتی تھی۔

گاؤں کے ایام کے دوران کھیل کود کے علاوہ بچھڑوں کو قریب کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چرانے کے لئے لے جانے کے علاوہ صرف مولوی سراج دین صاحب کے گھر قرآن پڑھنے کے لئے جانے کی پابندی تھی۔ پڑھنے پر ابھی زور نہیں دیا جاتا تھا۔ ماں جی خود پاس بیٹھ کر دیکھتی رہتی تھیں۔ ہمارے مولوی صاحب کے گھر جانے کے بعد خود تلاوت کرتی تھیں۔ بہار کے دنوں میں شہتوت اور کوہیر (جنگلی پھل جو بہت لذیذ ہوتا ہے) میں بہت شوق سے کھاتا تھا، مگر ماں جی اس دوران پاس بیٹھی رہتی تھیں اور زیادہ کھانے سے منع کرتیں۔ کہتی تھیں گرم ہوتے ہیں۔ پیٹ کی خرابی یا بدہضمی ہو سکتی ہے۔ صرف کھجولا کی بات نہیں بلکہ جب تک ماں جی کی زیر نگرانی رہے، پیٹ کی تکلیف یاد نہیں۔

فیروز پور کے ایام کے دوران اس دیہاتی نونہال کو دو مرتبہ والد محترم نے ایک ایک تھپڑ مارا جس پر دیہاتی ذہن بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ تلاش کے بعد جب یہ دیہاتی نونہال ماں جی کے پاس لایا گیا تو سینے سے لگالیا گیا۔ شکوہ نہ گلا نصیحت نہ خفگی۔ گلے سے کچھ اس طرح لگالیتی تھیں کہ بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور شاید تربیت ہی ایسی تھی کہ اس نونہال کو کسی موقع پر رونے کا یا رو کر کوئی چیز مانگنے کا خیال تک پیدا نہ ہوا۔ فیروز پور کے بعد ہم سب کراچی چھاؤنی آ گئے۔ وہاں قرآن پڑھنے کے لئے حافظ صدرالدین (دوالمیال والے) کے پاس جاتا تھا اور حساب خان جی پڑھاتے تھے۔ بھائی جان اسکول جاتے تھے۔ میں جس حافظ صاحب کے ہاں سے آتا تو پوچھتا کہ کیا پکا ہے؟ جواب میں چیز بتائی جاتی، اس کو کھانے سے انکار کر دیتا۔ ماں جی پوچھتیں کیا کھاؤ گے تو کسی اور چیز کا نام لیتا، وہ تیار ہونے لگتی تو کسی اور شے کی فرمائش کرتا۔ اگر بالائی یا دہی کے لئے ضد ہوتی تو اس کے پیسے مل جاتے اور پاس کی دکان سے لانے کو کہا جاتا۔ پھر خیال بدل جاتا اور جو کچھ ماں جی نے پہلے بتایا ہوتا تھا، اس کی فرمائش کر دیتا۔ انہوں نے کبھی میری ضد پر خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ "نہ" کا لفظ تو ان کے علم ہی میں نہیں تھا۔ کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ میں رو پڑوں۔ رات سونے سے پہلے دودھ پیا ہوتا تھا۔ اگر کبھی دودھ پینے سے پہلے نیند آ جاتی تو گہری نیند سے جگا لیا جاتا، مگر جگانے کا انداز ایسا تھا کہ حرف شکایت کا اظہار یاد نہیں۔

بھائی جان کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے اگر میں آؤٹ ہو جاتا تو بلا پکڑے ماں جی کے پاس شکایت لے کر جاتا کہ بھائی جان نے جان بوجھ کر آؤٹ کیا ہے۔ وہ کہتے میری کیا غلطی ہے، گیند ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ ماں جی پیار سے صلح کروا دیتیں۔ نہ بھائی جان پر خفا ہوتیں نہ کبھی میری ناجائز شکایت پر کچھ کہتیں۔ میں نے اکثر ماؤں کو بچوں کو ڈانٹتے اور خفا ہوتے دیکھا ہے۔ کیسی پیار کرنے والی ماں تھیں کہ تیرہ سال میں ایک مرتبہ بھی مجھے اونچی آواز سے کچھ نہیں کہا۔ میں جب میٹرک میں تھا تو بڑی آپا سجادہ بیگم کے پاس ان کے گاؤں ملوٹ گیا ہوا تھا تو کسی وجہ سے میں نے "ہائے اماں" کہا۔ آپ بھی ان کی پالی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں: "گلزار احمد! اتنا پیار کرنے والی ماں کی روح کو کیوں تکلیف دے رہے ہو؟ اگر اماں جی کو یاد ہی کرنا ہے تو درود شریف پڑھ کر ان کی روح کو بخشا کرو۔" وہ دن اور یہ دن "ہائے اماں" کا لفظ میری زبان تو کجا میرے ذہن کے پردے پر بھی نہیں ابھرا۔ یہ بہن بھی اماں جی کی چہیتی بیٹی تھیں۔ اور ان ہی کی تربیت یافتہ تھی۔ کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ سے ان کے میاں سے اختلاف پر خان جی نے حکم دیا: ''گھوڑی لے جاؤ اور سجادہ بیگم کو لے آؤ۔ اور ہاں، حیدر خان (آپ سجادہ کے شوہر) سے کہنا کہ اسے لینے نہ آئے اور نہ کسی اور کو لینے کے بھیجے۔ ہم اسے واپس نہیں کریں گے''۔ میں گھوڑی لے کر گیا اور خان جی کا حکم سنایا۔ اس روز چپ رہیں، دوسری صبح مجھ سے کہا: 'واپس کھولا چلے جاؤ اور خان جی سے کہنا کہ میری پالکی کہاروں کے کاندھوں سے خان عالم خاں کی حویلی میں اتری تھی۔ اب میری میت اسی حویلی سے خان عالم خان کے بیٹوں اور پوتوں کے کاندھوں پر اٹھے گی۔ جاؤ، اللہ تمہارا حافظ ہو''۔

ایک دن میری سوتیلی اماں کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہوئیں اور ماں جی کے متعلق کچھ کہہ دیا۔ خان جی نے سنا تو کہا: ''خدا کی بندی! اس جنتی نیک عورت شاید ہی کوئی اور ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قیامت کے روز حضرت فاطمہؓ کے اونٹ کی مہار اس کے ہاتھ میں ہوگی''۔

خان جی کی پلٹن کا تبادلہ کوئٹہ ہوگیا۔ ہمیں رام سوامی گاڑی کھاتے (کراچی) میں تیسری منزل پر ایک مکان دلایا گیا۔ ماں جی نے چھ مہینے دو بیٹوں کے ساتھ گزار دیے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ساتھ لے کر گاؤں چل پڑیں۔ بھائی جان سیانے تھے۔ گھر چلانے میں ان کا کتنا حصہ تھا، مجھے معلوم نہیں...... ان سے انتہا درجے کا پیار کرتیں، مگر پیار کا دکھاوا نہ ہوتا تھا۔ خانیوال کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ خانیوال چند گھنٹے رکنا پڑتا تھا۔ انتظار گاہ میں ایک اور برقع پوش سے باتیں ہوتی رہیں۔ خاتون کا ایک جملہ اور ماں جی کا جواب یاد رہ گیا ہے۔ خاتون نے پوچھا: ''اتنا لمبا سفر اور دو معصوم بچے، یہ کیوں کر رہی ہو؟'' ماں نے جواب دیا: ''بچوں کو پڑھانا جو ہوا''۔ وہ خاتون کہنے لگیں: ''پڑھ کر کیا کریں گے؟'' ماں جی کا فقرہ تمام عمر یاد رہا: ''انسان بن جائیں گے''۔ بھائی جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نہایت شریف انسان تھے۔ معلوم نہیں میں انسان بن سکا ہوں یا نہیں!

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میری غریب ماں

سید نظر زیدی نے بے پناہ ریاضت، اعلیٰ اسلامی اقدار سے گہری وابستگی اور مہذب رویوں کے باعث صحت مند ادب کی تخلیق اور پرورش میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں انہیں بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں بچوں کیلئے سیرت النبی کی بہترین کتاب لکھنے پر خصوصی انعام سے نوازا گیا۔ سید نظر زیدی کے دادا قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ 1877 کی جنگ آزادی میں اس گھرانے کا مال و منال اور عز و افتخار سب فرنگیوں کے انتقام کی نذر ہو گئے۔ تاہم ان کے والدین نے بڑی وفاداری کے ساتھ خاندانی وقار قائم رکھا۔ سید نظر زیدی کی شخصیت کی تشکیل میں انکی والدہ کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے مشقت کا سارا بوجھ خود اٹھایا اور اولاد کی عزت نفس کی پوری پوری حفاظت کی۔ اس مضمون میں سید نظر زیدی نے اپنی والدہ کی عظمت کو اجاگر کیا ہے۔

••••••••••••••••••••••••

دنیاوی زندگی میں میرا تعلق جن لوگوں سے رہا اور ہے، ان میں سب سے زیادہ معزز اور محترم میں اپنی والدہ مرحومہ کو سمجھتا ہوں۔ میرے دل میں ان کے لئے جو احترام اور محبت و عقیدت ہے اس کا اندازہ شاید اس بات سے ہو سکے کہ میں نے کئی بار صدق دل سے یہ دعا مانگی ہے کہ ''اے رب، اگر مجھ سے کسی نوعیت کی بھلائی کا کوئی کام ہوا ہے تو اس کا ثواب میری ماں کے لئے خاص کر دے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والدہ مرحومہ سے میری یہ عقیدت اور محبت شاید اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے میری پرورش اور تعلیم وتربیت اس طرح کی گویا ان کی زندگی کا واحد مقصد یہی تھا اور یہ فرض انجام دیتے ہوئے انہوں نے اس طرح اپنے آپ کو مٹی میں ملالیا گویا ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ لگتا تھا وہ اپنے آپ کو بھول ہی گئی ہیں۔ ان کے سامنے صرف میں ہوں اور انہوں نے پختہ عزم کر رکھا ہے کہ مجھے گرم ہوا بھی نہ لگنے دیں گی۔

میں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو انہیں ایک امیر گھر میں کھانا پکاتے اور برتن مانجھتے دیکھا۔ یہ بہت پستی کی زندگی تھی اور میری حیثیت بھی اس کے مطابق ہوگی، لیکن انہوں نے مجھے اس پستی سے بدرجہ ادنی بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ اپنی مثالی محبت اور اونچے خیالات کے پروں میں اس طرح چھپایا کہ میرا جسم میلا ہونے دیا نہ ذہن۔ اس زبان سے جسے الفاظ کی حاجت نہیں ہوتی میرے دل ودماغ میں یہ خیال راسخ کیا کہ جہاں اب ہم ہیں یہ ہمارا اصل مقام نہیں، ایک حادثے کے نتیجے میں گڑھے میں گر گئے ہیں اور انشاء اللہ جلد ہی اس سے نکل آئیں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات یہیں روک کر چند باتیں اپنے بزرگوں اور اپنے خاندان کے بارے میں عرض کر دوں۔ میں سابق یو پی (ہندوستان) اور موجودہ اتر پردیش (بھارت) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا جس کا نام کاہیڑی ہے اور یہ تحصیل نجیب آباد میں مالن ندی کے کنارے آباد ہے۔ یہ وہی ندی ہے جس کا ذکر کالی داس نے اپنے مشہور ناٹک شکنتلا میں مالنا کے نام سے کیا ہے۔ سال پیدائش اندازاً 1971ء ہے۔ میرے آج کے نقطہ نظر سے جب میں چیزوں اور مقامات کو ایک شاعر اور ادیب کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، یہ گاؤں بہت خوش منظر اور پرفضا ہے۔ شمال کی طرف کوہ ہمالیہ کے سلسلے کی پہاڑیاں مہربان ہمسایوں کی طرف نظر آتی ہیں۔ ان سے نیچے ہمالہ کی ترائی کا بہت بڑا جنگل ہے جسے کجلی بن کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بن غالباً مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے سندر بن سے بھی بڑا ہے۔ کہا جاتا ہے اس کے کچھ حصے ایسے ہیں جن میں داخل ہونے کی اب تک انسان نے جرأت نہیں کی۔ جنوب کی طرف کجلی بن کے آخری کنارے پر مالن ندی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہتی ہے اور اس کے بعد بستیاں ہیں جن میں سے ایک کلہیڑی بھی ہے۔

گڑھوال کی پہاڑیوں کی بلندیوں سے شفاف خنک ہوا کے جھونکے چلتے تو کجلی بن اور مالن کو پھلانگتے اور کھیتوں پر سے گزرتے ہوئے گاؤں کے باشندوں تک پہنچتے ۔لیکن اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ غربت کے بوجھ تلے دبے ہوئے کسانوں اور گاؤں کے باشندوں کو اس نعمت غیر مترقبہ سے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ انہیں فرحت حاصل ہوتی نہ ان کی صحت پر اس عمدہ آب وہوا کا اثر پڑتا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پورے علاقے میں آبپاشی کا معمولی سا انتظام بھی نہیں تھا۔ فصلوں کے اچھا یا برا ہونے کا انحصار بارش پر تھا۔ زمین اگرچہ زرخیز تھی، لیکن بارانی ہونے کی وجہ سے پیداوار کم دیتی۔ چھوٹے کسانوں کے تقریباً سبھی گھرانے غربت زدہ تھے۔ چہرے تازگی اور جسم صاف ستھرے لباس سے محروم، تاہم خاص میرے خاندان کی حالت عام لوگوں سے بہت اچھی تھی۔

میرے والد سید شمشیر علی، کجلی بن کے ایک حصے میدووالا میں ملازم تھے اور چچا سید شبیر علی اپنے دو بیٹوں ،سید مظہر حسین اور سید شمشاد حسین کی معیت میں کھیتی باڑی کے دھندوں میں مصروف رہتے ۔زمین کے واجبات اور دیگر اخراجات والد صاحب کی تنخواہ سے ادا کر دیئے جاتے تھے اور کھیتوں سے اتنا غلہ بہر حال حاصل ہو جاتا تھا جو دونوں گھروں کے لئے کافی ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں جنگل سے بہت چیزیں آتی تھیں۔ شکار کا گوشت، دودھ، جنگلی مرغیاں، تمباد، کتھا اور دوسری بہت سی چیزیں۔ اور یہ اتنی مقدار میں آتی تھیں کہ عزیزوں اور پڑوسیوں کو ان سے وافر حصہ ملتا تھا۔

رزق کی اس فراوانی کے علاوہ ہمارے گھرانے کو بہت عزت حاصل تھی، نیکی اور بھلائی کے کاموں کے علاوہ شاید اس لئے بھی کہ میرے چچا شہ زور پہلوان تھے۔ ہمارا رہنا سہنا گاؤں کے عام باشندوں سے مختلف ،شہریوں جیسا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے اجداد ہجرت کر کے اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے۔ میرے پاس کوئی دستاویزی ثبوت تو نہیں، لیکن اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ علاقہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں تقریباً غیر آباد تھا، اس لئے یہاں وہ انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ ایک عزیز نے بیان کیا کہ ہمارے بزرگوں میں سے ایک صاحب بنگال چلے گئے تھے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ کن حالات سے دوچار ہوئے۔

میرے دادا سید خورشید علی قاضی تھے۔ غالباً وہ بھی اس وقت اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے جب پورے ملک میں انگریزی عدالتیں قائم کی گئیں۔ تاجروں کے روپ میں ہندوستان آنے والے انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت میں اضافے کے ساتھ ہی اس ملک کے نظام عدل میں مداخلت شروع کردی تھی۔ سب سے پہلی عدالت وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں قائم کی گئی۔ اس کے بعد بتدریج یہ دائرہ پھیلایا گیا، تاہم قاضیوں کی عدالتیں 1857ء کے بعد بھی کچھ عرصہ قائم رہیں، لیکن بالآخر وہ بھی ختم کردی گئیں۔

ایثار کا اعلیٰ نمونہ

جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا، میری عمر سات سال اور چند ماہ تھی۔ اور یہ بات میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے کہ عمر کا یہ مختصر حصہ میرے لئے موسم بہار جیسا تھا۔ گھر میں جو محبت مجھے حاصل تھی، اس کے علاوہ باہر بھی میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ جہاں بھی جاتا، لوگ ہاتھوں چھاؤں کرتے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ میدو والا لے گئے تو میرا دامن چاندی کے روپیوں اور کھوئے سے بنی مٹھائی سے بھر گیا۔ کجلی بن کے اس علاقے میں گوجروں کے بہت ڈیرے تھے۔ شفاف پانی اور چارے کی فراوانی کے علاوہ یہ آسانی میسر تھی کہ جو شخص جتنی چاہے زمین گھیر لے۔ میری والدہ صاحبہ نے بتایا تھا جب میں پیدا ہوا تو سو سے زیادہ کرتے ٹوپیاں میرے لئے آئیں۔

ہمارے معاشرے میں بعض لوگوں کو بھاگوان اور بعض کو منحوس کہا جاتا ہے، اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سعادت اور نحوست کا تعلق انسان کی اہلیتوں اور اخلاق و عادات سے ہے۔ جو لوگ درست انداز میں محنت کرتے اور اپنی حالت سنوارنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے دامن برکتوں سے بھر جاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے مفلوک الحالی ان کا استقبال کرتی ہے، لیکن جب میں اپنے حالات پر غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے خاندان کی ساری خوشحالی اور عزت والد صاحب مرحوم کے دم سے تھی۔ جیسے ہی ان کی آنکھیں بند ہوئیں مصائب کا خوفناک دور شروع ہو گیا اور ان مصائب کا بہت بڑا حصہ مجھے اور والدہ صاحبہ کو ملا۔ میری عمر کم تھی، اس لئے اسباب کا تو پوری طرح علم نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ خوشحالی کے خاتمے کے علاوہ گھر میں ایسا فساد شروع ہو گیا کہ والدہ صاحبہ کو گھر چھوڑنا پڑا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے یہاں میں چند باتیں ان کی عادات واطوار کے بارے میں عرض کر دوں۔ وہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں، مگر نماز روزے کی پابند اور دین کے اصولوں پر پختہ ایمان رکھتی تھیں۔ نرم دل اور خدا ترس تھیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتی تھیں تو آگے بڑھ کر مقدور بھر اس کی مدد کرتیں۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ پاس پڑوس والوں کے لئے ہمارا گھر مرکز فیض تھا، گھریلو استعمال کی معمولی چیزوں سے لے کر گھر تعمیر کروانے والے چوکھٹ تک کے لئے والد صاحب سے فرمائش کر دیتے تھے اور ان کا سوال پورا کر دیا جاتا تھا۔ ضرورت مندوں کے کام آنے اور امداد کرنے کے سلسلے میں میرے والد صاحب کا کردار مثالی تھا۔ اس زمانے کے لوگ خدمت خلق کو شاید اس متعین مفہوم کے ساتھ تو نہ جانتے ہوں گے جس طرح اس زمانے کے لوگ جانتے ہیں، لیکن میں نے جو حالات اپنے والد صاحب کے سنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا مشن تھا اور یہی رویہ والدہ صاحبہ کا بھی تھا۔ وہ ہانڈی پکاتیں تو اس حدیث کے مطابق، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک درج ہے کہ جب شوربا پکاؤ تو تھوڑا سا پانی زیادہ ڈال لیا کرو کہ اس میں سے اپنے ہمسایوں کو بھی دے سکو، وہ بالعموم سالن ضرورت سے زیادہ پکاتیں اور غریب ہمسایوں کو پہنچاتیں۔ کوئی اناج خریدنے آتی تو عام بھاؤ سے سستا دیتیں اور بعد میں دو ہتڑ بھر کر اور ڈال دیتیں کہ میری طرف سے ہے۔

یہ تو تھی ان کی کشادہ دلی، مگر اس کے ساتھ روپے پیسے کی قدر کرنے والی بھی بہت تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر ان کا بٹوا خالی ہوتا تو طبیعت کا رنگ کچھ اور ہوتا، چڑچڑی اور جھنجھلائی ہوئی نظر آتیں۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا شخص جس کے ساتھ انہوں نے اچھا سلوک کیا ہوتا، طبیعت کے خلاف کوئی بات کرتا تو اس کی شامت آجاتی۔ اپنا ایک ایک احسان گن کر سامنے رکھ دیتیں۔

ان خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ وہ بہت محنتی اور بہادر تھیں۔ گھر کے کام کاج کے ساتھ عموماً چرخا کاتتی اور مرغیاں پالتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جنگلی بلی مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی۔ انہوں نے ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ لیا اور بلی نے پنجوں سے ان کا ہاتھ کھسوٹ ڈالا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نسوانی فطرت کے مطابق ہائے توبہ کرتیں اور چیختی چلاتیں، لیکن انہوں نے فوراً علاج کی طرف توجہ دی اور علاج بھی یہ کیا کہ نمک میں مرچیں ملا کر زخمی ہاتھ پر یہ آمیزہ مل دیا۔ اس علاج سے انہیں جو تکلیف ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے!

اولاد سے عشق

ایک اور خاص وصف اپنے بچوں سے عشق تھا۔ یوں تو سبھی ماؤں کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے، لیکن ان کی یہ محبت مثالی تھی اور اس لئے میں نے اسے عشق کہا ہے۔ کم از کم اپنی ذات کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو لگاؤ انہیں مجھ سے تھا، اسے عشق ہی کہا جاسکتا ہے۔ ابتدائی عمر میں میری دیکھ بھال کا فریضہ میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ انجام دیتی تھیں، لیکن سات برس کی عمر کے بعد انہوں نے یہ فرض انجام دیا اور اس محنت اور لگن سے کہ آج کل کی مائیں تو اس کا قصد بھی نہیں کرسکتیں۔ اس زمانے کی باتیں یاد آتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے انہوں نے میری پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے اپنی ذات کو بھلا ہی دیا تھا۔ ان کی جملہ مساعی اور توجہ کا مرکز میری ذات تھی۔

انہوں نے ابتدائی زندگی ایک خوشحال اور معزز گھرانے کی بااختیار خاتون کی حیثیت سے بسر کی تھی۔ ضرورت مند ان کے دروازے پر آتے تھے۔ لیکن اب وہ دوسروں کے گھروں میں کھانا پکاتی اور برتن مانجھتی تھیں۔ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، ان کے گھر چھوڑنے کی پوری تفصیلات تو مجھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معلوم نہیں ہیں، لیکن ہوسکتا ہے اس کی بنیادی وجہ میری ذات ہی ہو۔ یہ خیال اس وجہ سے ذہن میں آتا ہے کہ اس پست حالت میں بھی وہ مجھے معزز رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتی تھیں۔

جس گھر میں، میں نے انہیں سب سے پہلے دیکھا وہ دہرہ دون میں محکمہ سروے کے ایک افسر سید ظل حسین کا گھر تھا۔ سید صاحب اور ان کی بیوی قصبہ جھالو کے رہنے والے تھے جو میرے نانا صاحب کا وطن تھا اور شاید اسی رشتے سے وہ وہاں آئی تھیں۔ سید صاحب نہایت نیک سیرت اور شریف صورت انسان تھے۔ انہوں نے مجھے تحصیلی اسکول دہرہ دون میں داخل کرایا۔ کتابیں بھی خود خرید کر دیں، لیکن خواتین کا معاملہ ہر جگہ مختلف ہوتا ہے۔ خاتون خانہ سے ان بن ہوگئی اور والدہ صاحبہ سید نصیر الدین حیدر ڈپٹی کمشنر دہرہ دون کے گھر آگئیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اس جھگڑے کی بنا میری ذات تھی۔ ہوا یہ کہ عید کے موقع پر والدہ صاحبہ نے میرا کرتا بنانے کے لئے چکن کا ٹکڑا خریدا۔ یہی کپڑا خاتون خانہ نے اپنے پوتوں اور پوتیوں کے لئے خریدا تھا۔ انہوں نے اس بات کو قابل اعتراض خیال کیا کہ میرا اور ان کے بچوں کا لباس ایک جیسا ہو، والدہ صاحبہ سے کہنے لگیں: ''ہاشمی! کیا تیرا بیٹا بھی وہی لباس پہنے گا جو ہمارے بچے پہنیں گے؟''

مجھے معلوم نہیں یہ مکالمہ کن مراحل سے گزرا، یہ جملہ اس لئے ذہن میں محفوظ رہا کہ مصائب کا زمانہ فتح ہونے کے بعد ایک دن والدہ صاحبہ کی زبان سے سنا تھا۔ مجھے تو بس یہ یاد ہے کہ اس کے بعد والدہ صاحبہ وہاں سے آگئیں اور ہمارا دوسرا ٹھکانہ ڈپٹی نصیر الدین حیدر صاحب کی کوٹھی بنا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جس میں کبھی امیر کابل رہے تھے، بہت پر فضا اور خوش منظر۔ اس کے باغیچے میں لیچی، لوکاٹ کے بہت درخت تھے اور اس کا ایک حصہ امیر صاحب کے شکار کئے ہوئے شیروں کی کھالوں، سروں اور ان کے استعمال میں آنے والی دوسری چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ لوگ یہ ساز و سامان دیکھنے کے لئے اسی طرح آتے تھے جس طرح عجائب گھروں میں جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈپٹی گھر سے یتیم خانے تک

ڈپٹی صاحب اردو زبان کی بہت معروف ادیبہ قرۃ العین حیدر کے چچا تھے۔ یہاں مجھے بہت آسائش اور سہولتیں میسر آئیں۔ اسکول جانے کے علاوہ اس ٹیوٹر سے بھی پڑھتا تھا جو ڈپٹی صاحب کے بچوں کو پڑھانے آتا تھا۔ فرصت کا وقت ان بچوں کے ساتھ کوٹھی کے باغیچے میں کھیلنے اور نہر کے کنارے سیر کرنے میں گزرتا تھا جو سڑک کے دوسرے کنارے بہتی تھی۔ چند ہی دن میں ہم بہت گھل مل گئے تھے۔ وہ کسی معاملے میں بھی برتری کا اظہار نہ کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس بستی سے میرے بزرگوں نے ہجرت کی تھی، وہ ڈپٹی صاحب کے قصبے نہٹور کے قریب ہی تھی۔ ہوسکتا ہے کوئی پرانی نسبت دریافت ہوگی ہو اور اس وجہ سے والدہ صاحبہ وہاں گئی ہوں یا پھر یہ ان کی ذاتی شرافت کا نتیجہ ہو۔ اس سلسلے میں ان کی ایک بہت دلچسپ شرارت تو اب بھی یاد آجاتی ہے۔ میں کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا تھا کہ ایک بچے نے بجلی کے پلگ کی طرف اشارہ کر کے اس کے سوراخوں پر انگلیاں رکھنے کے لئے کہا اور میں نے سادہ دلی سے ان پر انگلیاں رکھ دیں۔ نتیجے میں زوردار جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی دوسری طرف زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ مجھے اس وقت تک بجلی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار روشن بلب دیکھے تھے اور ان سے اس قدر متاثر تھا کہ شام کے وقت سڑک کے کھمبوں پر لگے ہوئے بلب روشن کئے جاتے تھے تو یہ منظر دیکھنے کے لئے خاصی دیر پہلے سڑک پر آجایا کرتا تھا۔

میری یہ خوشگوار زندگی ایک بار پھر انقلاب کی نذر ہوئی۔ ڈپٹی صاحب کا تبادلہ دہرہ دون سے میرٹھ ہوگیا اور ہم بھی ان کے ساتھ ان تاریخی شہر میں آگئے، لیکن یہ انقلاب تکلیف دہ نہ تھا، بلکہ خوش آیند اور سازگار تھا۔ میری تعلیم کا سوال سامنے آیا تو ایک ایسا فیصلہ کیا گیا جو بظاہر تو کسی قدر کراہت کا پہلو لئے ہوئے تھا، لیکن نتائج کے لحاظ سے ایسا تھا کہ میری زندگی کا وہ رخ متعین ہوگیا جس پر چلتے ہوئے میں آج بہت اطمینان اور فخر محسوس کرتا ہوں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مجھے یتیم خانے میں داخل کرا دیا جائے۔ مجھے تو اس وقت اپنے بارے میں کچھ سوچنے کی عادت ہی نہ تھی، نہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قابل تھا۔ میری عمر ساڑھے آٹھ یا نو برس ہوگی۔ لیکن اپنی والدہ صاحبہ کے اس فیصلے سے متفق ہونے کے بارے میں سوچتا ہوں تو ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں لکھ آیا ہوں، وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور اس فیصلے کے نتیجے میں مجھے ان سے جدا ہو جانا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی عام عورت ہوتی تو یہ چاہتی کہ اس کا بیٹا اس کی نظروں کے سامنے رہے، کیونکہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مطابق یہ جدائی ایسی ہی تھی جیسے مجھے کسی دوسرے شہر بھیج دیا گیا ہے، لیکن انہوں نے اسے بخوشی مان لیا اور میں دارالیتامی والمساکین خیر نگر دروازہ میرٹھ میں منتقل ہو گیا۔

اس ادارے کے مہتمم مولانا حبیب اللہ قادری تھے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان اداروں میں سے تھا جو سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کے لاوارث رہ جانے والے بچوں کے لئے مراد آباد اور میرٹھ وغیرہ شہروں میں قائم کرائے تھے۔ صورت حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ ایسے مسلمان بچوں کو عیسائی مشنری اپنی تحویل میں لے رہی تھی اور حکومت انہیں آسانیاں فراہم کر رہی تھی۔ حیات جاوید کی روایت کے مطابق اس عذاب سے مسلمان بچوں کو اس طرح بچایا گیا کہ جگہ جگہ یتیم خانے قائم کر دیئے گئے۔

اس یتیم خانے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بہت اچھا تھا۔ مروجہ تعلیم کے ساتھ قرآن پڑھانے اور ضروری دینی تعلیم دینے کا انتظام خاص طور سے کیا گیا تھا اور ساتھ کوئی دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی۔ بچوں کو پانچوں وقت کی نماز جامع مسجد خیر نگر دروازہ میں پڑھائی جاتی تھی جو متصل ہی تھے۔ ایک بچے کو امام بنا دیا جاتا تھا اور بڑوں کی جماعت سے الگ ان کی جماعت ہوتی تھی۔ استادوں میں سے کوئی ایک قریب رہ کر ان کی نگرانی اور رہنمائی کرتا تھا۔

دستکاری کے تین شعبے تھے۔ نجاری، جفت سازی اور خیاطی۔ مجھے خیاطی کے شعبے میں داخل کیا گیا۔ ایک کہاوت ہے: ''پہلے تھے ہم دھنیے، جالا ہے، پھر بن گئے ہم درزی......لوٹ پیٹ سے سید بن گئے، یہی خدا کی مرضی۔'' یہاں ایک سید زادے کو درزیوں کی صف میں شامل کر دیا گیا اور اس بات کا ثبوت فراہم ہوا کہ اللہ کے کام نرالے ہیں جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جیسا چاہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کرتا ہے۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ خدا کے فضل و کرم سے اب میں کامل انسانی مساوات پر ایمان رکھتا ہوں اور جیسا کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ نے فرمایا: ’’تمام انسان حضرت آدم علیہ اسلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ اسلام مٹی سے بنے تھے۔ کسی کالے کو گورے اور کسی گورے کو کالے پر کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں، نہ عربی اور عجمی میں کسی نوعیت کا امتیاز ہے۔ بہتر وہ ہے جس کے عمل اچھے ہیں۔‘‘ میرے نزدیک کوئی برادری یا کوئی پیشہ ادنی نہیں ہے، لیکن جب ہوش سنبھالا تو اس خاندانی تفاخر نے بہت پریشان کیا جو رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا اور خدا کے فضل سے بہت ابتلا کے زمانے میں بھی جسے ضعف نہ پہنچا۔ بہت کوشش کر کے اس ذریعہ معاش سے پیچھا چھڑایا اور صحافت اور تصنیف و تالیف کے شعبے میں روزی کا انتظام ہو گیا۔ الحمدللہ

انگریز افسر نے آیت کریمہ پڑھوائی

اس یتیم خانے میں بچوں کو جو خوراک دی جاتی تھی وہ تو واجبی سی ہی تھی۔ ایک خاتون موٹی موٹی روٹیاں اور دال یا کوئی ترکاری پکا دیتی تھیں اور وہی تقسیم کر دی جاتی تھی، لیکن دعوتوں میں بہت عمدہ کھانا ملتا تھا اور دعوتیں بالعموم ہوتی رہتی تھیں۔ شادی، غمی کی تقاریب میں لوگ بچوں کو بلاتے تھے اور کہیں کہیں کھانے کے ساتھ پیسے بھی ملتے تھے۔ ایک بار فوج کے ایک انگریز افسر نے، جو لال کرتی میں رہتا تھا، آیت کریمہ کا ورد کرایا تو بہت عمدہ کھانا کھلانے کے ساتھ ہر بچے کو گرم کرتے، پاجامے پر مشتمل ایک ایک سوٹ بھی دیا۔

اس یتیم خانے میں بھی اللہ کے خاص فضل سے میری پذیرائی ہوئی اور مجھے نسبتاً بہتر سلوک کا مستحق خیال کیا گیا۔ معلوم نہیں کس طرح یہ راز کھلا کہ میری آواز بہت اچھی ہے اور مجھے حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی ؒ (نورانی میاں کے والد) دو ہم سبق لڑکوں کے ساتھ اپنے ہمراہ میلاد کی محفلوں میں لے جانے لگے۔ مولانا بالعموم تو تبلیغی دوروں میں ملک سے باہر رہتے تھے، لیکن ربیع الاول میں وطن لوٹ آتے تھے اور شہر کے امراء کے گھروں میں محفل میلاد کا سلسلہ شروع ہو جاتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ واقعات سیرت بیان کرتے کرتے مولانا رکتے اور اشارہ فرماتے کہ ہم نعت شروع کریں۔ ہم تینوں ہم آہنگی سے نعت پڑھتے اور یہ بات کسی مبالغے کے بغیر ہے کہ سماں بندھ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک موقع پر حضرت مولانا نے میری اور ایک اور لڑکے حبیب الرحمان کی تعریف کی تھی۔

اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب میں نے خود کو ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا اور لاہور کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا تو یہ بات یاد ہی نہ آئی کہ ترنم میرے کلام کو دو آتشہ بنا سکتا ہے۔ ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بات یاد آ جاتی تو ان شاعروں میں ممتاز ہوتا جنہوں نے اپنے ترنم کی وجہ سے بہت نام کمایا اور مقبولیت حاصل کی۔

میرٹھ میں قیام کئی لحاظ سے دہرہ دون کے قیام سے اچھا تھا۔ یتیم خانے میں کئی اچھے دوست بن گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب کے بچوں سے بھی میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بالخصوص ان کے صاحبزادے اچھے میاں سے تو ایک طرح قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اجازت لے کر ان کی کوٹھی جاتا تھا تو بہت محبت سے ملتے۔ افسوس اس وقت ان کا اصلی نام یاد نہیں آ رہا۔ سنا ہے قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان کراچی آ گیا تھا اور اچھے میاں انجینئر کی حیثیت سے سرکاری ملازمت میں رہے۔ خدا کرے زندہ ہوں اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں۔

میرٹھ میں بہت اچھی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میں دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ہنر بھی سیکھ رہا تھا، مگر نہ معلوم کیوں والدہ صاحبہ میرٹھ سے دلی آ گئیں اور چند روز بعد ہی مجھ بھی بلوا لیا۔

ماں کی دعاؤں کا اثر

اب میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہاں ہمیں دلی کے رجسٹرار اور رئیس نواب ابوالحسن خاں صاحب کی اس تاریخی حویلی میں پناہ ملی جو ایک روایت کے مطابق حکیم احسن اللہ خاں کی رہائش گاہ رہی تھی۔ نواب صاحب کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی دو بیٹیوں اور چار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیٹوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی اہلیہ مرحومہ کی ایک سہیلی جن کا تعلق پنجابی سوداگروں کی برادری سے تھا، ان بچوں کی نگہداشت کا فریضہ انجام دیتی تھیں، لیکن وہ رہتی اپنے گھر تھیں۔ مقررہ دنوں میں آجاتی تھیں اور شام کو اپنے گھر لوٹ جاتیں۔ انہیں لانے کے لئے کار بھیجی جاتی تھی اور کار ہی میں ان کے گھر پہنچایا جاتا تھا۔

اس دور کی اپنی زندگی پر غور کرتا ہوں تو یہ بات خدائی امداد معلوم ہوتی ہے کہ مجھے ہر جگہ بہت عزت اور محبت ملی۔ نواب صاحب کے ہاں تو گویا کمال ہی ہو گیا۔ یہ سب بچے مجھے ایک طرح برابری کا درجہ دیتے تھے۔ حویلی کی دوسری منزل میں ہم اکٹھے ورزش کرتے۔ اس زمانے کے مشہور گانے گاتے اور گپیں ہانکتے، گھوڑا گاڑی پر سیر کے لئے جاتے تو میں برابر بیٹھ کر جاتا۔ اسی طرح بدھ کے دن یہ پورا خاندان فاتحہ کے لئے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا" جاتا تو میں بھی ساتھ جاتا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی نے کوئی معمولی چیز ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے کے لئے بھی کہا ہو۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو بطور خاص بیان کرنے کے قابل ہے۔ ایک بار میں کسی ضرورت سے اپنے گاؤں گیا تو نواب زادہ انور حسن خاں صاحب نے اپنی سلک کی شیروانی اور صابر کے بہت بڑھیا جوتے پہننے کے لئے دیے کہ ذرا شان سے جاؤں۔ کھانا میرے لئے ٹرے میں بھیجا جاتا تھا۔

خالص مادی نقطۂ نظر سے سوچیں تو میری اس عزت افزائی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جن بچوں نے میری قدر کی ان کی اور میری سماجی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا، لیکن میں نے ابتلا کے اس پورے زمانے میں خود کو ان کے برابر بیٹھا ہوا محسوس کیا۔ سوچتا ہوں تو اس کے سوا کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ سب کچھ میری غریب ماں کی دعاؤں اور محترم والد صاحب کی نیکیوں کی وجہ سے ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے ان کے بستر مرگ پر ال کیا تھا: ''آپ ان بچوں کو کس کے حوالے کر رہے ہیں؟'' اور انہوں نے آسمان کی طرف انگلی ... اور اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ میں نے خود کو ہمیشہ اللہ کی رحمت کے سائے میں محسوس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا۔ بہت مشکل حالات میں غیب سے مدد ملتی رہی ہے، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نے اپنے خبث باطن سے مجبور ہو کر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور اس کی سازش میری ترقی کا سبب بن گئی۔

دوسری وجہ بالیقین ان خاندانوں کا شریفانہ ماحول اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ تھا۔ اگر ان خاندانوں کے بڑے اپنے بچوں کو میرے ساتھ ملنے جلنے سے روکتے تو معلوم نہیں مجھے کن حالات سے گزرنا پڑتا۔ کم ظرف اور اوچھے لوگ تو اپنے غریب رشتہ داروں کے ساتھ میل جول پیدا نہیں کرتے۔ بہر حال میں بہت اچھے اور پر آسائش ماحول میں تھا اور اس سے نکلنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک بہت ہی عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ نواب صاحب نے اپنے چاروں بیٹوں کو دہرہ دون کے کسی تعلیمی ادارے میں داخل کر دیا۔ اب تک ان بچوں نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں انہیں کسی اسکول میں داخل نہ کرایا گیا تھا۔

اب یہ بات ذہن میں محفوظ نہیں کہ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے میری ذہنی کیفیت کیا ہوئی ہو گی۔ یقیناً اچانک پیدا ہو جانے والے خلا نے پریشان کیا ہو گا، تاہم زندگی تو اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ میں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو گا، لیکن کچھ عرصے بعد نواب صاحب کے بچے تعطیلات گزارنے کے لئے گھر آئے اور جب واپس جانے لگے تو معلوم نہیں کس طرح مجھے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میں اپنی والدہ صاحبہ کو بتائے بغیر ان کے ساتھ دہرہ دون چلوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کے ساتھ کار میں سوار ہو کر میں دہرہ دون پہنچ گیا۔

بیوہ کا اکلوتا بیٹا جسے وہ جان برابر چاہتی تھی: اچانک غائب ہو جائے تو اس کی پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شاید ان لوگوں نے جنہوں نے مجھے نواب صاحب کے بچوں کے ساتھ کار میں سوار ہوتے دیکھا ہو گا انہیں میری اس نہایت ہی واہیات حرکت کے بارے میں بتا دیا ہو گا اور بات صرف میری جدائی کے صدمے تک رہ گئی ہو گی۔

نواب صاحب کی ایک کوٹھی دہرہ دون میں بھی تھی اور ان کے بچے اسی میں رہتے تھے۔ میرے لئے یہ جگہ باغ جنت سے کم نہ تھی۔ ملازمین مزے مزے کے کھانے پکاتے۔ کھلی فضا میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھومنے پھرنے کی پوری آزادی اور ذمہ داری نام کی کسی چیز کا ذکر تک نہ تھا۔ ان ساری باتوں کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے تھا، لیکن یہ خداداد عیش چند روز ہی حاصل رہا۔ دلی سے حکم پہنچا اور مجھے واپس بھیج دیا گیا۔

ایک بڑا فیصلہ

یہاں تک میں نے جو کچھ لکھا اس میں میری ذاتی باتیں زیادہ ہیں، والدہ صاحبہ کا ذکر جزوی طور پر آیا ہے، لیکن اب میں اس مرحلے پر پہنچ گیا ہوں جہاں سے ان کی عظمت اور بے مثال ایثار کا حال شروع ہوتا ہے۔ جب میں دلی پہنچا تو انہوں نے شکایت بھری نظروں سے دیکھنے کے علاوہ مجھے کچھ نہ کہا۔ ڈانٹا، نہ گرجیں برسیں، لیکن ساتھ ہی ایک ایسا فیصلہ سنا دیا جو بالیقین ایک عظیم ماں ہی کر سکتی ہے۔ فرمایا: ''ثابت ہو گیا تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں تجھے لاہور بھیج رہی ہوں۔ ان نواب زادوں کے ساتھ رہا تو تیری زندگی خراب ہو جائے گی۔''

اس وقت تو مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو ان کا یہ فیصلہ بہت اہم ہونے کے ساتھ بہت مشکل بھی تھا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ مجھ سے عشق کی حد تک محبت کرتی تھیں۔ میری ذات ان کی امیدوں اور توجہات کا واحد مرکز تھی۔ رات کو کبھی آنکھ کھل جاتی تو انہیں مناجات پڑھتے اور دعائیں مانگتے سنتا۔ بات کرتیں تو میرے بارے میں، سوچتیں تو میری بھلائی کے لئے۔ بلا مبالغہ انہوں نے میرے لئے اپنے آپ کو مٹی میں ملا لیا تھا۔ لیکن جب میری تربیت اور بہتر مستقبل کا سوال سامنے آیا تو یوں اجنبی بن گئیں جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہوں۔ اسی دن سفر کا معمولی سامان تیار کیا اور مجھے تنہا لاہور جانے والی ریل گاڑی میں بٹھا دیا جو بھٹنڈہ ہو کر جاتی تھی۔

شاید بعض حضرات کو یہ معمولی بات لگے، لیکن میں سمجھتا ہوں میری ماں کے لئے یہ معمولی نہ تھی، یہ تو ایسا معاملہ تھا جیسے انہوں نے اپنا سینہ چیرا اور دل نکال کر لاہور کی طرف پھینک دیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ یہ فیصلہ نہ کرتیں اور میرے مستقبل کے مقابلے میں اس بات کو اہمیت دیتیں کہ میں ان کی نگاہوں کے سامنے رہوں اور کلیجے سے چمٹا رہوں تو میرا حال بہت خراب ہوتا۔ عمر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تقاضے سے جن امیر بچوں نے مجھے اپنا دوست بنایا تھا، بڑے ہو کر میری اس سے زیادہ مدد نہ کر سکتے کہ اپنی جائیداد کے انتظام کے سلسلے میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری دے دیتے، اور تعلیم مکمل نہ ہونے کی صورت میں شاید یہ بھی ممکن نہ ہوتا۔ پھر میں کیا کرتا اور کس انداز سے زندگی گزارتا، اس کا تصور بھی نا قابل برداشت ہے۔

اگرچہ لاہور آ کر بھی میں نے کوئی ایسی حیثیت حاصل نہیں کی جو قابل ذکر ہو، ایک قلمی مزدور کی طرح زندگی گزاری اور اس میں بھی بڑا نام حاصل نہ کر سکا، لیکن اللہ پاک نے اپنے خاص فضل سے ایک ایسی دولت سے نوازا جو میرے نزدیک دنیا بھر کے خزانوں سے گراں بہا ہے، اور وہ ہے اپنے دین پر پختہ یقین اور اپنی ملت اور اپنے وطن سے بہت گہری محبت۔ ہوش سنبھالا تو یہ ارمان دل و دماغ میں رچ بس گیا کہ غلامی کی لعنت سے جلد از جلد چھٹکارا مل جائے اور ہم مسلمان پہلے کی طرح معزز اور محترم ہو جائیں۔ دوسرا عشق قلم سے ہوا اور اس پختہ فیصلے کے ساتھ ادبی اور شعری سفر شروع کیا کہ ایک جملہ بھی ایسا نہ لکھا جائے جس میں خیر اور بھلائی کا پہلو نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے اس فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔ بہت کچھ لکھنے کا موقع ملا اور جو کچھ بھی لکھا بہت محتاط ہو کر لکھا۔ اس یقین کے ساتھ لکھا کہ درگاہ خداوندی سے اس کا اجر ملے گا۔

اس دنیاوی زندگی کا سفر جو بہر حال فانی ہے، خاصی دشواریوں سے طے ہوا۔ جتنی محنت کی اس کا جائز معاوضہ بھی نہ مل سکا، کہیں تعصبات کی دیواریں حائل ہوئیں اور کبھی میری ترقی کا سبب بنتے رہے۔ اس بات کے لئے اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ عمر کے اس آخری حصے میں زندگی پرسکون اور پر آسائش ہے۔ روپے زیادہ نہیں، لیکن اللہ پاک ان کے بغیر بھی مسرت و اطمینان فراوانی کے ساتھ عطا فرماتا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ ایک خاتون میرے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی ہے، جبکہ میں نے ہوش اس حالت میں تسنبھالا تھا کہ میری غیور ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر رہی تھی۔

آخر میں اپنی غریب لیکن عظیم ماں کے بارے میں چند باتیں اور۔ لاہور آ کر جب میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لڑکپن کی آخری حد پر پہنچا تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دلی جا کر والدہ کو اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ کام خاصی دشواری سے ہوا۔ نواب ابوالحسن خاں مرحوم و مغفور اس بات پر بہت مشکل سے آمادہ ہوئے کہ میں اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ان کے اور میرے مابین اس بات پر اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ مجھے یاد ہے انہوں نے بہت ناراض ہو کر کہا: "جا ساری زندگی دشمن تیرے پیچھے لگا رہے گا جو تجھے چین نہ لینے دے گا۔" اور واقعی میں نے اس نادیدہ دشمن کے قدموں کی چاپ پوری زندگی سنی، لیکن اس دشمن کے مقابلے میں ماں کی دعائیں قوی رہیں۔ زندگی کا سفر خوشحالی کی طرف جاری رہا۔

نواب صاحب کی مجبوری دراصل یہ تھی کہ ان کی دو بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں اور گھر میں میری والدہ صاحبہ کے سوا کوئی اور خاتون نہ تھی جو ہمہ وقت ان کے پاس رہتی، لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنی ماں کو اس حالت میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں انہیں گاؤں لے گیا اور تقسیم کے بعد 1949ء میں پرمٹ بنوا کر لاہور لے آیا۔ ان کا انتقال یہیں ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے!

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اماں جی

یہ ان عظیم خاتون کی داستان حیات افروز ہے جس کی آغوش میں تربیت پانے والے بیٹوں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی نے آج سے 34 سال پہلے محمد ظفر اللہ خان کے ساتھ مل کر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کا آغاز کیا تھا اور اس عہد پر آشوب میں اسلام کے اعلیٰ تصورات اور اقدار کا ادب وصحافت کے میدان میں بڑی ہنرمندی اور سلیقے سے تحفظ کیا تھا جب الحاد اور اشتراکیت ہمارے ادیبوں اور قلم کاروں کا سرچشمہ قوت بنے ہوئے تھے۔ اماں جی کی بلند ہمتی اور بلند حوصلگی نے اپنے بیٹوں کو وقت کی انتہائی سفاک آمریت کے آگے کھڑے رہنے اور جمہوریت کی جنگ لڑنے کا ولولہ عطا کیا تھا۔ حافظ افروغ حسن نے اس مضمون میں اپنی ماں کی عظمت کا حق ادا کر دیا ہے۔

• •

1925ء کا سال ہے۔ موجودہ مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال کے ایک گاؤں ہابڑی میں ایک شیر خوار بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔ شروع میں بچے کو بخار چڑھتا ہے۔ تین چار دن گزر جاتے ہیں اور بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔ بچے کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں ایک ہفتہ گزر جاتا ہے۔ گاؤں کی بڑی بوڑھی اور سیانی عورتیں بچے کی حالت دیکھ کر کہتی ہیں: ''اے بہن! تمہارے بچے پر چیچک کا حملہ شروع ہو چکا ہے۔ جب تک چیچک پوری طرح نکل نہیں آئے گا اور اپنی مدت پوری کرنے کے بعد ڈھل نہیں جائے گی، اس وقت تک بچے کا بخار اترے گا نہ اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوش آئے گا۔ اے بہن! یہ بڑا موذی، خطرناک اور تباہ کن مرض ہے۔ بچہ تمہارا دودھ پیتا ہے۔ اگر تم نے اس کی بیماری کے دوران نمک مرچ والی کوئی چٹ پٹی چیز کھالی تو اسے فوراً خارش ہو جائے گی اور اس کی بے چینی کی وجہ سے وہ کھجا کھجا کر اپنا جسم اور چہرہ نوچ ڈالے گا...... اور یہ نشانات ساری عمر اس کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر موجود رہیں گے جو اس کے چہرے کی زیبائی اور رعنائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغدار کر کے رکھ دیں گے۔'' تجربہ کار بزرگ خواتین کی باتیں سن کر ماں کا دل دھک کر کے رہ جاتا ہے۔ وہ چیچک کی تباہ کاریوں سے واقف ہے۔ اسے علم ہے کہ یہ مرض نہایت موذی اور جان لیوا ہے۔ اگر مریض جانبر ہو بھی جائے تو اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ اکثر مفلوج اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ چہرہ بدنما داغوں کی وجہ سے کریہہ المنظر بن جاتا ہے۔

ہابڑی ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کوئی ڈاکٹر ہے نہ طبیب۔ کسی انگریزی اور دیسی دوا کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خطرناک اور اذیت ناک مرض کی ایک طرف یہ بے پناہ شدت اور دوسری طرف علاج و دوا کے اسباب اور وسائل کی نایابی، ماں کے دل پر خوف اور وحشت طاری کر دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو بے بس اور بے یار و مددگار پاتی ہے۔

بے چینی اور مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک اس کے ذہن پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوتی ہے جس سے اسے حوصلہ بھی ملتا ہے اور سہارا بھی۔ وہ ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ اپنے بیمار اور نڈھال بچے کی تیمارداری اور دیکھ بھال کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔

ماں اپنے پیارے بیمار بچے کو گود میں لے کر پلنگ میں بیٹھ جاتی ہے۔ اسے جھلا بھی رہی ہے اور سورۃ رحمن کی تلاوت کر کے اس پر دم بھی کرتی جاتی ہے۔ اپنے اس عمل سے اسے احساس ہوتا ہے کہ بچے کو سکون مل رہا ہے اور اس کا اپنا دل بھی سکون و اطمینان کے روح افزا جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ مایوسی اور تشویش کے بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ کیوں نہ ہو؟ اللہ کی کتاب ہے ہی سراپا رحمت، دلوں کی ڈھارس کا موثر ذریعہ اور جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے کامل اور مکمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نصیب شفا۔

یہ عظیم ماں ...... جس نے اپنے مریض بچے کی سلامتی وصحت کے لئے اللہ کی مقدس اور بابرکت کتاب کو اپنے کریم اور رحیم رب کی بارگاہ میں وسیلہ بنایا ہے ...... پرہیزی تدابیر پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ اس نے نمک اور مرچ سے تیار ہونے والی تمام چیزوں کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ وہ اپنے بچے کی سلامتی کی خاطر مجسم ایثار بن جاتی ہے۔ وہ صرف روکھی روٹی دیسی کھانڈ کے ساتھ کھاتی ہے۔ کام ودہن کی لذتوں کی قربانی کا یہ سلسلہ تین ہفتے چیچک کے مکمل خاتمے تک جاری رہتا ہے۔

آخر کار مرض کی وہ بحرانی رات آجاتی ہے جو اس مرض میں اکثر آیا کرتی ہے۔ بچہ موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ ان لمحات میں ماں کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہوگی، اس کا اندازہ ہر وہ ماں کر سکتی ہے جو اپنے سینے میں اپنی اولاد کے لئے ماممتا بھرا دل رکھتی ہے۔

ان نازک ترین لمحات میں ماں سراپا التجا بن کر اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتی ہے اور اس کی جناب میں اسی کی رحمت کا واسطہ دے کر نہایت خشوع اور گریہ وزاری سے عرض کرتی ہے:

''الٰہا! میں تیری نہایت عاجز و بے نوا بندی ہوں۔ تیرے در کے سوا میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میرے بچہ کی صحت وسلامتی اور زندگی صرف تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو اپنی رحمت سے اسے زندگی بخش۔ اور زندگی بھی وہ جس میں تندرستی بھی ہو اور سلامتی بھی۔ میں تیری جناب میں تیری ہی باعظمت اور بابرکت کتاب کو وسیلہ بناتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ اگر میرا یہ بچہ جو تیرا ہی عطا کردہ ہے، اس موذی مرض سے صحیح اور سلامت بچ نکلا تو میں اسے تیری پاک اور سراپا رحمت کتاب کا حافظ بناؤں گی۔''

ماں کی یہ دُعا دل کی گہرائیوں سے کچھ اس طرح نکلی تھی کہ رحمت خداوندی جوش میں آجاتی ہے۔ مرض کی بحرانی کیفیت ختم ہوتی ہے۔ بچہ آنکھ کھول دیتا ہے۔ ماں کی جان میں جان آجاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ وہ اپنی دعا کی قبولیت پر جذبہ تشکر و امتیاز سے سرشار ہو کر اپنے مولائے حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔

وہ ماں جس نے اپنے شیر خوار بچے کی سلامتی، صحت یابی اور زندگی کی بھیک اپنے رب کریم سے اس کی کتاب کا واسطہ دے کر مانگی تھی، وہ اماں جی تھیں اور جس کے متعلق اپنے محسن حقیقی سے اس کی کتاب کا حافظ بنانے کا عہد کیا تھا، وہ میں تھا۔

اماں جی علم و فضل اور دنیاوی جاہ و حشمت کے اس بلند مقام پر تو فائز نہیں تھیں جو عام طور پر اس دنیا میں عزت اور شہرت کا موجب بنتا ہے، لیکن یہ بات بلا خوف تردد کہی جا سکتی ہے کہ ایک خاتون خانہ کی حیثیت سے خانہ داری کے فرائض کی انجام دہی اور ماں کی حیثیت سے اولاد کی پرورش اور تربیت جس محنت و مشقت، سلیقہ شعاری و جفاکشی، دلسوزی و خیر خواہی اور عزیمت و استقامت سے کی، وہ انہیں عظیم اور بلند ہمت خواتین کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

☆☆☆

اماں جی ضلع مظفر نگر یو پی (بھارت) کے ایک مشہور گاؤں شاہ پور میں پیدا ہوئیں۔ محترم ماموں خلیق احمد صاحب کی روایت کے مطابق ان کی تاریخ ولادت 6 اپریل 1891ء ہے۔

ہمارے نانا جان نے ان کا نام فردوسی بیگم رکھا۔ نانا جان سعید احمد صاحب قرآن کے حافظ اور جید عالم دین تھے۔ عربی اور فارسی پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ دین علوم کی تکمیل مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جیسے بلند پایہ اور نابغہ روزگار علما سے کی تھی۔ باطنی علوم اور روحانی فیوض مولانا غوث علی شاہ صاحب پانی پتی سے حاصل کئے تھے جو اپنے دور کے بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔

نانا جی کے نزدیک انگریز کی ملازمت حرام تھی۔ ساری عمر سرکاری ملازمت سے وابستہ نہ ہوئے۔ گاہے گاہے منشی گری اور مدرسی اختیار کر لیتے تھے۔ طبیعت پر استغنا اور بے نیازی اور فقر و درویشی کا ذرق غالب تھا۔ تبلیغ دین کا جوش اور ولولہ انہیں بے چین کئے رکھتا تھا اور اس مقصد کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاطر وہ دور دراز مقامات کا سفر بھی کرتے اور خدا کی رضا حاصل کرنے کی خاطر دین پھیلانے کا فرض ادا کرتے۔

نانا جان مولانا حافظ سعید احمد صاحب عالم فاضل مبلغ دین ہونے کے ساتھ ساتھ زاہد شب زندہ دار بھی تھے۔ رات کا بڑا حصہ عبادت اور ذکر الٰہی میں صرف ہوتا۔ کثرت ذکر سے ان کی رحانی قوت میں یک گونہ بالیدگی اور سحر آفرینی پیدا ہوگئی تھی جو اکثر اہل اللہ کا خاصہ ہوتا ہے۔

اماں جی نے بچپن ہی میں اپنے ابا جی سے ناظرہ قرآن پڑھا اور انہی سے قرآن مجید کے ترجمے کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ اردو کی ایسی کتابیں پڑھیں جن میں شریعت کے احکام و مسائل بیان ہوئے تھے۔

اماں جی کے ساتھ ان کے بڑے بھائی جناب مخدوم احمد مرحوم، جناب مشتاق احمد مرحوم اور حافظ شفیق احمد مرحوم بھی اپنے والد سے اردو، عربی، فارسی اور ریاضی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تختی لکھنے کی مشق پر بہت زیادہ زور دیا جاتا لیکن اماں جی کو تختی لکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اماں جی اردو کی مشکل سے مشکل کتاب پڑھ اور سمجھ سکتی تھیں، لیکن لکھنا انہیں بالکل نہیں آتا تھا۔

اماں جی کا بچپن شاہ پور ہی میں گزرا۔ نانا جی کے فقیرانہ مزاج کے باعث گھر میں اکثر تنگدستی کا عالم رہتا...... لیکن اس غربت وافلاس کے ماحول نے اماں جی میں محنت ومشقت، اپنے ہاتھ سے کام کرنے اور سلیقے کے ساتھ تھوڑی چیز سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عادت اور صلاحیت پیدا کردی تھی۔

قرآن مجید کے مطالعہ، نانا جی کی روحانی اور اخلاقی تربیت اور گھر میں تنگدستی کے ماحول نے اماں جی میں یہ جذبہ بچپن ہی سے پیدا کردیا تھا کہ وہ کمزوروں، ضعیفوں اور بیماروں کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ ماموں خلیق احمد کے روایت کے مطابق اماں جی اپنے محلے کی بڑی اور ضعیف عورتوں کی خدمت کر کے بے حد خوشی محسوس کرتیں۔ بوڑھیوں کو نہلاتیں، ان کے سر اور کپڑے دھو کر صاف کرتیں، ان کے کپڑے سی دیتیں۔ اگر کوئی خاتون خانہ بیمار ہو جاتی تو اس کے گھر کا کام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دیتیں۔ بیمار اور ضعیف عورتوں کے ہاتھ پاؤں دبا کر ان کو آرام و راحت پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ اس طرح ان کے دلوں سے نکلی ہوئی دعائیں حاصل کر کے اپنی خوشیوں میں بے پناہ اضافہ کرتیں۔ شاہ پور کے قیام کے دوران یعنی شادی تک اماں جی کا یہی طرز عمل رہا۔ اس طرح دین کی محبت کے ساتھ خدمت خلق کا شوق ان کی طبیعت کا لازمی عنصر بن گیا۔

اماں جی کی شادی 10 مئی 1909ء کو ان کے تایازاد عبدالغفار صاحب سے ہوئی۔ وہ اس وقت ضلع حصار صوبہ پنجاب میں محکمہ نہر میں بطور پٹواری ملازم ہو چکے تھے۔ وہ زمانہ سخت کساد بازاری کا تھا۔ ایک مسلم نوجوان کے لئے مڈل پاس کر کے سرکاری ملازمت میں آ جانا اس کی بہت بڑی خوش قسمتی تصور ہوتی تھی۔

ابا جی نے یتیمی کی حالت میں اپنے بہنوئی حاجی محمد یحییٰ صاحب کے پاس ہانسی ضلع حصار میں تعلیم حاصل کی۔ دادا جی عبدالحمید صاحب جو حافظ قرآن اور عربی و فارسی کے عالم تھے، اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ کر تھوڑی عمر ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

1911ء میں والد صاحب تبدیل ہو کر منگالہ آ گئے۔ منگالہ، سرسہ سے چھ میل کے فاصلے پر دریائے گھگھر کے کنارے مسلمان ارائیوں کا ایک گاؤں تھا۔ اعلیٰ قسم کے خوشبودار چاولوں کی پیداوار کے لئے یہ گاؤں پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اماں جی چار سال یہاں مقیم رہیں۔ دو بچیاں یہیں پیدا ہوئیں۔

اماں جی کی پرورش یوپی میں ہوئی تھی اور منگالہ پنجاب کے اس حصے میں تھا جسے باگڑ کہا جاتا تھا۔ دونوں علاقوں میں زبان، تہذیب، بول چال، رہن سہن اور طرز معاشرت میں نمایاں فرق تھا لیکن اماں جی نے اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت اس غیر مانوس ماحول سے جلد ہی ہم آہنگی پیدا کر لی۔ گاؤں کی خواتین سے میل جول اور تعلقات کچھ اس نہج پر استوار کئے کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود ان کی شادابی اور تازگی میں کوئی کمی نہ آئی۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم ملک یعنی 1947ء تک کچھ بزرگ خواتین منگالہ سے آیا کرتی تھیں۔ اماں جی ان سے بڑی محبت و شفقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملتیں۔ وہ کئی کئی دن ہمارے گھر ٹھہرتیں۔ آپس میں حقیقی بہنوں کی طرح دکھ سکھ کی باتیں کرتیں۔ تحفے تحائف کا تبادلہ کرتیں۔ ہم سب بہن بھائی بھی ان کا بے حد احترام کرتے۔

آج خیال آتا ہے کہ اماں جی کے خلوص میں کتنی شیرینی، ان کے طرز عمل میں کتنی جاذبیت اور میل جول اور تعلقات قائم کرنے کے انداز میں کتنی سادگی اور پاکیزگی تھی کہ چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی مہک اور خوشبو اسی طرح تازہ رہی۔ آج تو حال یہ ہے کہ قریب ترین خونی رشتے بھی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، کی نذر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

1915ء میں ابا جی کا تبادلہ ضلع کرنال کے گاؤں ہابڑی میں ہو گیا۔ یہ مسلمانوں راجپوتوں کا گاؤں تھا۔ یہاں کے باشندے علم کی روشنی سے محروم تھے، لیکن تھے بڑے جفاکش اور محنتی، زبان کے دھنی اور قول کے پکے۔ اس گاؤں میں اماں جی کا قیام سولہ سال رہا۔ ہم چاروں بھائیوں یعنی برادر محترم حاجی گل حسن صاحب، میری اور برادران عزیز اعجاز حسن اور الطاف حسن کی جائے پیدائش یہی گاؤں ہے۔ اس گاؤں بلکہ پورے ضلع میں ہمارا کوئی رشتہ دار نہ تھا، لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا تو چاروں طرف اپنایت ہی محسوس کی۔ ہر بڑا شخص کوئی تایا تھا تو کوئی ماموں۔ ان کی طرف سے ہمیشہ بزرگانہ شفقت اور عنایت کی مٹھاس ہی حصے میں آئی۔ خواتین میں کوئی مامی تھی تو کوئی خالہ، کوئی پھوپھی تھی تو کوئی تائی۔ یہ رشتے سب زبانی تھے، مگر خلوص و ایثار اور بے لوث تعلقات نے ان میں بے پناہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود اب بھی ان مخلصانہ روابط کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔

ہابڑی میں تعلیم کا مناسب بندوبست نہ تھا، اس لئے 1931ء میں ابا جی تبادلہ کرا کر سرسہ تشریف لے آئے اور ایک کچا مکان رہائش کے لئے خرید لیا جسے اماں جی نے بڑی محنت و مشقت سے لیپ پوت کر رہائش کے قابل بنایا۔ یہاں آ کر ہم چاروں بھائیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ برادر محترم گل حسن صاحب، ڈاکٹر اعجاز حسن اور الطاف حسن نے سرسہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے 1937ء، 1945ء اور 1947ء میں بالترتیب میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اعجاز اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الطاف میٹرک کے امتحان میں اپنے اسکول میں اول آئے۔ اس علاقے میں یہ احساس پہلی بار ابھر کر سامنے آیا کہ مسلمان طالب علم بھی اپنی محنت و ریاضت اور قابلیت و صلاحیت کی بدولت تعلیم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

میں نے 1935ء میں پانچوں جماعت کا امتحان پاس کیا تو مجھے اسکول سے اٹھا کر قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے جناب قاری حافظ محمد شفیع صاحب کے پاس بٹھا دیا گیا، کیونکہ اماں جی نے اپنے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے حافظ قرآن بنائیں گی۔

قاری محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ، اللہ ان کی قبر کو منور کرے اور اسے جنت کا ایک باغیچہ بنائے، نہایت خدا ترس، متقی اور پاکباز انسان تھے۔ ان کا تعلق ہانسی کے مغل خاندان سے تھا۔ پولیس میں بطور کانسٹیبل اپنے فرائض نہایت ذمہ داری اور دیانت داری سے ادا کئے اور ملازمت کے دوران میں قرآن پاک زبانی یاد کیا۔ رات کو گشت پر ہوتے تو چاند کی روشنی میں حمائل شریف سے اپنا سبق یاد کرتے جاتے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر ترقی پا کر ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

1930ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر قاری محمد شفیع صاحب نے اہل سرسہ کی خواہش اور اصرار پر وہاں کی عالیشان جامع مسجد میں امامت کے فرائض سنبھال لئے۔ ساتھ ہی مسجد کی ملحقہ عمارت میں ایک مدرسہ قائم ہوا جہاں بچوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھانے اور حفظ کرانے کی ذمے داری بھی قاری صاحب کے سپرد ہوئی۔

استاد محترم قاری محمد شفیع صاحب کو قرآن سے شغف عشق کی حد سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ ان کا سارا وقت قرآن پڑھنے یا سننے میں گزرتا۔ 1930ء سے تقسیم ملک 1947ء تک یہ چشمہ فیض، پوری آب و تاب سے رواں دواں رہا۔ ہزاروں بچوں نے ناظرہ قرآن پڑھا اور سینکڑوں نے حفظ کیا۔ وہ سرسہ جہاں کی سترہ مساجد میں کوئی مقامی حافظ تراویح میں قرآن سنانے کے لئے نہ ہوتا تھا، اب خدا کی فضل اور قاری صاحب کی محنت شاقہ کی برکت سے ہر مسجد میں مقامی حافظ قرآن سنانے والا بھی موجود تھا اور سامع بھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استاد محترم کے پاس جن خوش قسمت لوگوں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے، میں اپنی معلومات اور تجربے کی حد تک ان میں دو اہم خصوصیات پاتا ہوں۔ اول، انہیں قرآن مجید اچھی طرح یاد ہے۔ دوم، انہوں نے قرآن مجید سننے اور سنانے کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔

قرآن مجید حفظ کرنے میں مجھے تین سال کا عرصہ لگا۔ اس دوران میں اماں جی اور ابا جی کی خصوصی توجہات اور نوازشات دیدنی تھیں۔ اماں جی میرے لئے مختلف قسم کے بادام اور مغزیات کے حلوے تیار کر کے رکھتیں اور انہیں کھانے کی بار بار تاکید فرماتیں، مگر میری طبیعت ان سے بری طرح سیر ہو چکی تھی۔ انہیں چکھنے کو بھی دل نہ چاہتا۔ میرے بہن بھائیوں کی خوب موج بنی رہتی۔ گرمیوں کے موسم میں ابا جی اپنی ملازمت کو گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے لئے بادام کی ٹھنڈائی خود اپنے ہاتھ سے رگڑتے اور مجھے پینے کے لئے دیتے۔ میرے لئے ان کی یہ ساری توجہ و عنایت اور سعی و کوشش قرآن پاک کی نسبت سے تھی۔

1937ء میں ابا جی کا تبادلہ سرسہ سے ضلع کرنال کے ایک گاؤں بھانہ میں ہو گیا۔ ابا جی اکیلے ہی وہاں تشریف لے گئے، لیکن چند ماہ بعد ہم سب کو وہاں جانا پڑا، کیونکہ برادرم گل حسن صاحب کو طبیہ کالج دہلی میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اب تین جگہ خرچ کا پورا کرنا محال ہو گیا تھا۔

بھانہ ہندو جاٹوں کا گاؤں تھا۔ آبادی تقریباً دو ہزار تھی۔ تین چار مسلمان گھر بھی تھے جن کی حیثیت کمیوں کی تھی۔ ابا جی اس گاؤں میں جتنے عرصے تنہا رہے، گاؤں کی مشترکہ عمارت جنج گھر کی بالائی منزل پر رہے۔ ان کا معمول تھا کہ تہجد اور فجر کی نماز میں قرات بلند آواز سے کرتے۔ اس گاؤں میں کسی مسلمان فقیر کو اللہ کا نام لے کر بھیک مانگنے کی بھی اجازت نہ تھی، لیکن ابا جی کی قرآن خوانی میں کچھ ایسی تاثیر اور سحر آفرینی تھی کہ کچھ دنوں ہی میں گاؤں کے لوگ ان کو دیوتا اور اوتار جیسے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔

ہم اماں جی کے ساتھ بھانہ پہنچے تو رہائش کے لئے بالائی منزل کے دو کمرے ملے۔ ان کمروں کے دروازے بھی نہیں لگے تھے۔ ہوا کی رکاوٹ کا کوئی موثر ذریعہ نہ تھا۔ انہی دنوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ میں تازہ تازہ قرآن مجید ختم کر کے گیا تھا، لیکن اچھی طرح ضبط نہ تھا۔ ابا جی نے تراویح کا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا۔

رمضان کا چاند نظر آتے ہی جج گھر کی نچلی منزل کے برآمدے میں نماز باجماعت کا اہتمام ہوا۔ ہابڑی کے کچھ مسلمان مزدور جو نہر پر مٹی ڈالنے کا کام کرتے تھے، رات کو اسی عمارت میں آ کر ٹھہرتے، وہ بھی اس جماعت میں شریک ہوتے۔

میں سارا دن وہ پارہ یاد کرتا جو رات کو سنانا ہوتا۔ دو تین مرتبہ اماں جی کو سناتا۔ تراویح کی جماعت بارونق ہونے لگی۔ دو ایک دن کے بعد کچھ لوگ تراویح کے وقت جج گھر کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔ خدشہ ہوا شاید یہ لوگ کچھ شرارت کرنے کی نیت سے آتے ہیں یا نماز کا سلسلہ بند کرانا چاہتے ہیں، لیکن وہ نماز ختم ہوتے ہی واپس چلے جاتے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھتی گئی جن میں مرد بھی ہوتے اور عورتیں بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ ہجوم کتنا ہی ہوتا، خاموشی سا عالم طاری رہتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان سب کو گھروں سے نکال کر سردی کے موسم میں خاموش اور ساکت کھڑا کرنے والی چیز قران پاک کی تلاوت تھی۔ قرآن کے الفاظ میں ان کے لئے عجیب قسم کی کشش اور جاذبیت تھی...... یہ قرآن کا زندہ اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ انسانی قلب وروح پر ایک لطیف اور شیریں اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔

رمضان بخیریت گزر گیا۔ سردی نے پورا زور پکڑا۔ خنک ہواؤں کے تیز وتند جھونکے چلنے لگے۔ سردی کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ جسم میں خون جمتا محسوس ہونے لگا۔ مکان میں یہ اہلیت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے مکینوں کو زمہریری ہوا کے تباہ کن حملوں سے محفوظ رکھ سکے، چنانچہ اماں جی سردی کی اس شدید لہر کی زد میں آ گئیں۔ بخار ہوا۔ ابا جی سرکاری امور کے سلسلے میں باہر تشریف لے گئے تھے۔ ہم سب بہن بھائی جو اماں جی کے پاس موجود تھے، اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر صورت حال کی سنگینی سے بے خبر تھے۔

اماں جی کا بخار بڑھتا گیا۔ بخار کے باوجود وہ گھر کے کام کاج میں حصہ لیتی رہیں۔ ان پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سردی کا حملہ سخت خطرناک تھا، چنانچہ بخار کے ساتھ نمونیہ بھی ہوگیا۔سب تیمار دار نا سمجھ۔ نہ دوا نہ علاج۔ اللہ نے اماں جی کو بے پناہ قوت مدافعت عطا کی تھی، وہ اسی کے بل بوتے پر اس شدید اور خوفناک مرض کا مقابلہ کر کے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور گھر کی ذمے داریاں انجام دینے میں مصروف ہوگئیں۔ بخار تو جاتا رہا اور نمونیہ کے درد کی شدت بھی ختم ہوگئی، مگر اس کے اثرات پھیپھڑوں پر ایسے پڑے کہ دمے کا مرض لاحق ہوگیا اور سانس تکلیف سے آنے لگا۔

ابا جی دو ہفتے بعد واپس آئے اور اماں جی کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے، مگر وہاں گاؤں میں علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ بیل گاڑی پر آٹھ میل کے فاصلے پر پونڈری لے کر گئے۔ وہاں نگینہ کے ایک عالم دین تھے جو حافظ قرآن اور قصبے کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب تھے اور طبیب حاذق ہونے کی وجہ سے مریضوں کا علاج بھی کرتے تھے۔

انہوں نے اماں جی کا طبی معاینہ کر کے مرض کی تشخیص کی اور بتایا کہ مرض ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ اگر علاج باقاعدگی سے کرایا گیا تو شفا کی امید ہے۔ اگر بے پرواہی سے کام لیا گیا تو یہ مرض مستقل دمے کی صورت اختیار کرلے گا۔ حکیم صاحب نے ایک ہفتے کی دوا تجویز کی اور تاکید کی کہ ہر ہفتے مریضہ کی حالت سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ علاج شروع ہوگیا۔ میں ہر ہفتے صبح سویرے بھانہ سے پیدل پونڈری روانہ ہوجاتا۔ حکیم صاحب کو سارے حالات بتاتا۔ وہ نسخہ تجویز کرتے۔ بازار سے دوا خرید کر دن کے تقریباً گیارہ بجے واپس گھر آجاتا۔ یہ معمول تقریباً سات ماہ جاری رہا۔ مسلسل اور باقاعدہ علاج کے باوجود مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس وقت کے حالات پر غور کرنے سے سخت حیرت ہوتی ہے کہ اماں جی دم کشی کی سخت اذیت ناک تکلیف کے باوجود اپنی ذمے داریوں سے کبھی غافل نہ ہوئیں۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا، بھینسوں کے لئے چارا تیار کرنا، اوکھلی میں دھان چھڑنا، چکی سے آٹا پیسنا اور اسی قسم کے دوسرے سخت محنت ومشقت والے کام کرنا ان کا معمول تھا، اس سے ان کی غیر معمولی اور محیر العقول قوت ارادی کا اندازہ ہوتا ہے جو ان اہل دل لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جن کا دل ذکر الٰہی سے شاداب اور جن کی روح اللہ کے ساتھ تعلق کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجہ سے مصفا ہوتی ہے۔

بھانہ میں جس مکان کے بالائی حصے میں ہماری رہائش تھی، وہ ایک بنئے کی ملکیت تھا۔ اس مکان کے زیریں حصے میں رات کے وقت اس کے جانور بندھتے تھے۔ صبح کو اس کی گھر والی آ کر مویشیوں کا گوبر وغیرہ اکٹھا کر کے تھاپتی اور صفائی کرتی۔ ساتھ ہی نیچے سے اماں جی کے ساتھ بات چیت کرتی جاتی...... ایک دن خلاف معمول صبح کے بجائے دوپہر کے بعد آئی۔ اماں نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ کل میرا گھر والا باہر کسی گاؤں گیا ہوا تھا۔ دکان پر میں بیٹھی تھی۔ ایک چمار کا لڑکا سودا لینے آیا تو اس کا کپڑا میرے جسم کے کپڑوں سے چھو گیا اور اس طرح میں بھرشٹ ہو گئی۔ مصیبت یہ تھی کہ گھر میں میرے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میں گھر میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی ورنہ وہ بھی گندی ہو جاتی، اس لئے رات کو میں نے کچھ نہیں کھایا اور ساری رات بھوکی رہی۔ سخت سردی تھی، مگر بستر میں نہ لیٹ سکی کیونکہ میں بھرشٹ تھی۔ اگر بستر کو ہاتھ لگاتی تو وہ بھی گندا اور ناپاک ہو جاتا، چنانچہ ساری رات بوری اوڑھ کر سیڑھیوں میں پڑی سردی میں ٹھٹھرتی رہی۔ صبح دن چڑھے میرا گھر والا آیا۔ وہ کنویں سے تازہ پانی لایا اور مجھے نہلا کر پاک صاف کیا۔

اب اس واقعے کو یاد کر کے ہنسی بھی آتی ہے اور ساتھ ہی خدا کے اس احسان کے تصور سے روح جھوم بھی اٹھتی ہے کہ اس نے اپنے آخری نبیؐ کے ذریعے انسانیت کو کتنا سادہ، پاکیزہ اور قابل عمل ضابطہ حیات دیا جس میں طبقاتی تقسیم ہے نہ اونچ نیچ کا تصور، غیر فطری بندشیں ہیں نہ ناقابل برداشت صعوبتیں۔ یہاں سہولتیں ہیں اور آسائشیں ہیں اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق میل ملاپ اور روابط و تعلقات کی وسیع راہیں کشادہ ہیں۔

تقریباً سوا سال کی مدت قیام کے بعد ابا جی کا تبادلہ بھانہ سے پھر سرسہ کے علاقے کی طرف ہو گیا۔ گاؤں سے روانگی کے وقت بہت سی عورتیں اماں جی سے ملنے آئیں۔ ان میں وہ اچھوت زدہ خاتون بھی تھی۔ پہلے تو وہ دور کھڑی اپنا درد دل بیان کرتی رہی، لیکن تھوڑی دیر بعد بے قابو ہو کر آگے بڑھی اور اماں جی کے گلے مل کر خوب روئی اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبیعت کو قدرے آسودگی ملی۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خلوص اور محبت کا جذبہ کتنا طاقتور ہے۔ اس کی موجودگی میں خود ساختہ بندشیں اور مصنوعی رکاوٹیں پاش پاش ہو کر رہ جاتی ہیں۔

1939ء کے شروع میں اماں جی اور ہم سب واپس سرسہ اپنے گھر میں آ گئے...... برادر محترم گل حسن صاحب جنہیں طبی تعلیم کے لئے طبیہ کالج دہلی میں داخل کرایا گیا تھا، وہاں کی تعلیم سے وحشت زدہ ہو کر واپس آ گئے تھے۔ وہ کساد بازاری اور مسلم نوجوانوں کے لئے سخت بیروز گاری کا دور تھا، تاہم کچھ عرصے بعد انہیں محکمہ نہر میں تار بابو کی اسامی پر جگہ مل گئی۔

اماں جی کی طبیعت پر دینی اور روحانی رجحان، جوانی بلکہ بچپن ہی سے غالب تھا اور یہ سب کچھ نانا جی کی تعلیم اور تربیت کا نتیجہ تھا۔ پنج وقتہ نماز کی پابندی اور باقاعدگی سے تلاوت قرآن مع ترجمہ اہتمام کے ساتھ سحر خیزی اور نوافل تہجد کی ادائیگی ان کے روزمرہ کے معمولات کا لازمی حصہ تھا۔ ان کی خواہش رہتی تھی کہ ان کی اولاد بھی دینی فرائض کی پابندی کرے اور صبح کے وقت نماز فجر کے بعد باقاعدگی سے قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ صبح کو اماں جی کا گھر قرآن مجید کی تلاوت کے نورانی اور روح پرور نغموں سے گونجنے لگتا۔ اور یہ روح افزا اور دلربا سہانا منظر اس گھر پر سارا دن خدا کی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں کے نزول کا باعث بنا رہتا۔

اماں جی کے اس دینی اور روحانی ذوق نے ان میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کسی صاحب کمال بزرگ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر تزکیہ نفس کی منزلیں طے کریں اور اپنی دینی اخلاقی اور روحانی تربیت کے ذریعے سعادت اخروی کا سامان مہیا کریں۔ یہ 1939ء کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے۔ ابا جی نے اماں جی کی یہ خواہش اپنے روحانی پیرومرشد حضرت خواجہ حافظ عبدالصمد سجادہ نشین خانقاہ مظفری حصار کی خدمت میں پیش کی جب کہ وہ سرسے تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت صاحب از راہ کرم فوراً ابا جی کے ساتھ پاپیادہ ہمارے گھر تشریف لے آئے..... کتنا خوش قسمت تھا ہمارا گھر جس کے فرش کو اللہ کے ایک نیک، مقرب، صاحب دل اور باعظمت انسان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

حضرت صاحب نے پس پردہ اماں جی کو طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کے مطابق اپنے حلقہ بیعت میں شامل کیا۔ سابقہ گناہوں سے توبہ کرائی۔ دینی فرائض کی پابندی کا عہد لیا۔ درود شریف اور استغفار کی تسبیح پڑھنے کی ہدایت کی اور اسم ذات کے ذکر کی تلقین فرمائی۔

اماں جی، جنہیں ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن سے پہلے ہی والہانہ شغف تھا، اب جو انہوں نے ایک صاحب نسبت اہل اللہ کی رہنمائی میں ذکر اسم ذات کی مشق شروع کی تو شروع شروع میں ذکر الٰہی کے انوار وتجلیات سہانی پھوار کی صورت میں ان کے قلب صافی پر پڑنے لگے جس سے ان پر سرور ونشاط اور فرحت وانبساط کی وجد آفرین کیفیت طاری ہوگئی، لیکن جب اس ہلکی پھلکی اور دھیمی پھوار نے موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی تو طبیعت میں عجیب تغیر پیدا ہو گیا۔ دنیا اور اس کے لوازمات ومشاغل سے نفرت ووحشت اور اذکار واوراد میں بے پناہ لذت وحلاوت۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسم ذات کے ذکر کی کثرت سے ان کے رگ وپے میں محبت الٰہی کی وارفتگی سرایت کر گئی ہے۔ اس کیفیت کی موجودگی میں دنیا ومافیہا سے کیا تعلق؟ اماں جی کی طبیعت کے اس رجحان اور ذوق سے سب گھر والوں کو قدرے فکر لاحق ہوئی۔ مجھے سخت تشویش تھی۔ آخر کار ایک دن جرات کر کے میں نے عرض کی:

''اماں جی! آپ پر خانہ داری اور اولاد کی پرورش وتربیت کی اہم ذمے داریاں ہیں جنہیں خدا کی رضا کے لئے پورا کرنا بھی عین عبادت ہے۔ اذکار واوراد، نوافل میں شامل ہیں۔ اگر نوافل کی وجہ سے اہم فرائض فوت ہو جائیں تو یہ دین کی روح کے سراسر خلاف ہے، اس لئے آپ ذکر ونوافل کے سلسلے میں قدرے احتیاط واعتدال سے کام لیں۔''

خدا کا شکر ہے کہ اماں جی نے میری مودبانہ گزارشات توجہ سے سنیں اور انہیں شرف قبولیت بخشتے ہوئے اپنے معمولات میں بتدریج اعتدال کی راہ اختیار کر لی۔ یہ ان کی پختہ دینی بصیرت اور مستحکم ایمانی فراست وحکمت ہی تھی جس کے باعث انہوں نے اعتدال وتوازن کا دامن ہاتھ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ جانے دیا، ورنہ اس شیفتگی و وارفتگی اور جذب و محبت کی وادی میں قدم رکھ کر کون کسی کی نصیحت پر کان دھرتا ہے اور کب اسے حکمت و مصلحت کی باتیں پسند آتی ہیں۔

اماں جی کی سانس کی تکلیف جسے وہ بھانہ سے ساتھ لے کر آئی تھیں، باقاعدہ علاج کے باوجود بدستور چلتی رہی۔ سردی ہو یا گرمی، رات کے دو بجتے ہی دم کشی کا شدید دورہ انہیں اٹھا کر بٹھا دیتا۔ پھر یہ تکلیف خاصا دن چڑھنے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہوتی۔ بعض دفعہ سارا دن تکلیف کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ سیانے اور تجربے کار لوگ اکثر یہی کہتے ہیں کہ دمہ ایسا موذی مرض ہے کہ یہ دم کے ساتھ ہی جاتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اماں جی پر کبھی مایوسی، ناامیدی اور دل شکستگی کی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنی پورے عزم و ہمت اور حوصلے و ولولے کے ساتھ اپنی ذمے داریاں نبھائے جاتیں۔ تکلیف کا یہ سلسلہ 1943ء کے آخر تک چلتا رہا۔ آخر کار اللہ کو اپنی بندی پر ترس آیا۔ اس کی رحمت جوش میں آئی اور ایک روحانی ذریعے کو، جس کا ذکر ابھی بعد میں آئے گا، اس تکلیف اور بیماری سے نجات کا باعث بنا دیا۔

1947ء تک اماں جی کا قیام سرسہ ہی میں رہا۔ 2 ستمبر 1947ء کو ہندو اور سکھ مسلح حملہ آوروں نے مسلم محلوں پر یورشیں شروع کر دیں۔ سینکڑوں بچے، عورتیں اور مرد بڑی بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔ ہمارا گھر سبزی منڈی میں تھا۔ خدا کے فضل سے یہ محلہ مار دھاڑ اور آتش زنی کی واردات سے بچا رہا، اسی لئے پورے شہر کے بچے کھچے مسلمان یہاں آ کر پناہ لینے لگے۔ 4 ستمبر کو سول انتظامیہ نے اس علاقے کو مسلمانوں کا حفاظتی کیمپ قرار دے دیا اور حفاظت کے لئے گورکھا فوجی دستے متعین کر دیے۔

اماں جی کے گھر میں پناہ لینے والوں کی کثیر تعداد جمع ہو چکی تھی جس میں بچے، عورتیں اور مرد بھی شامل تھے۔ یہ کیمپ پورے دو ماہ تک قائم رہا۔ اس عرصے میں اماں جی کا کردار انصارِ مدینہ کے عدیم المثال کردار کا ایک ہلکا سا عکس تھا۔ جو کچھ گھر میں تھا، اسے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بڑی خوشدلی اور فراخدلی سے بے دریغ خرچ کیا۔ ایثار و قربانی اور حسن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلوک اور مروت کی ایسی درخشندہ مثالیں قائم کیں کہ ان کا گھر پورے دو ماہ تک مکینوں کے ہجوم اور حالات کی سخت تنگی و پریشانی کے باوجود امن وسکون اور باہمی مودت والفت کا گہوارہ بنا رہا۔

3 نومبر 1947ء کو ہمارے کیمپ کے مکینوں کو اسپیشل ٹرینوں کے ذریعے براستہ بٹھنڈہ فاضلکا تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے پاکستان کی اسپیشل ٹرینیں میکلوڈ گنج (پاکستان) تک لائیں۔ جب ہماری ٹرین پاک سرحد میں داخل ہوئی اور پاکستان کے پہلے ریلوے اسٹیشن پر ہلالی پرچم لہراتا ہوا دیکھا تو ٹرین میں سوار مسلمانوں کی خوشی قابل دید تھی۔ وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھے۔ اللہ اکبر، اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد اور قائداعظمؒ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔

پاکستان بن جانے کے بعد اماں جی کا مستقل قیام آخر عمر تک لاہور میں رہا۔ ابا جی 1945ء ہی میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اس علاقے میں تجربہ کار پٹواریوں کی شدید کمی پیدا ہوئی، چنانچہ لاہور آ کر انہیں بطور پٹواری کام کرنے کا موقع مل گیا۔ برادرم محترم گل حسن صاحب کا سلسلہ ملازمت جاری تھا۔ کچھ عرصے بعد برادر عزیز اعجاز حسن کو بطور کلرک اور عزیزم الطاف حسن کو بطور سگنیلر محکمہ نہر میں ملازمت مل گئی۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد معاشی لحاظ سے ہمارے گھر کے حالات سخت پریشان کن تھے۔ ہم تقریباً خالی ہاتھ آئے تھے، پاس سرمایہ تھا نہ گھر کی ضروریات کا سامان۔ متروکہ سامان حاصل کرنے کے لئے جس ہمت وجرات، مستعدی اور ہوشمندی و بے غیرتی جیسی صفات کی ضرورت تھی ان کا ہم سب میں فقدان تھا، لیکن خدا کا کرم وفضل شامل حال تھا۔

اماں جی کی بلند ہمتی اور سلیقہ شعاری نے ان صبر آزما حالات میں پورے خاندان کو سنبھالا دیے رکھا۔ آخر کار آہستہ آہستہ یہ تنگی فراخی میں اور یہ عسرت فراغت میں تبدیل ہو گئی۔

1965ء میں اماں جی کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ موتیا اترنے کا یہ عمل تو کئی سال سے جاری تھا، مگر اب بینائی بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ انہیں سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ وہ قرآن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجید کی زیارت اور تلاوت سے محروم ہو گئی ہیں۔ آخر کار جنگ بندی کے بعد ڈسکہ میں ڈاکٹر چیمہ صاحب کے اسپتال میں آپریشن ہوا جو بفضل ایزدی کامیاب رہا۔ آپریشن کی وجہ سے انہیں جسمانی اور دماغی کمزوری لاحق ہوئی تھی، عمر کے تقاضوں کے پیش نظر وہ پوری طرح دور نہ ہوئی۔ خانہ داری کی ذمے داریاں ان کی بہوؤں نے سنبھال لی تھیں، مگر گھر کے معاملات کی سرپرستی بدستور انہیں کے پاس تھی۔

اماں جی کے دل کی گہرائیوں سے نکلی دعائیں اور صدائیں بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوئیں۔ بظاہر اس کی صورت اس طرح پیدا ہوئی کہ ہمارے بڑے بھائی گل حسن صاحب نے 1967ء میں 25 سال کی سروس کے بعد ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی، اس موقع پر انہیں جی پی فنڈ اور گریجویٹی کی جو رقم یکمشت ملی اس کا سب سے عمدہ اور نفع بخش مصرف انہوں نے یہ نکالا کہ خود بھی حج پر جائیں اور اپنے ساتھ ماں اور اہلیہ کو بھی اس لازوال اور انمول سعادت میں شریک کریں۔

ہم سب بھائیوں میں برادر محترم گل حسن صاحب کی خوش نصیبی اور بلند بختی اس لحاظ سے ہم سب کے لئے قابل رشک ہے کہ انہیں ماں باپ کی خدمت، ان کی دلجوئی و خبر گیری اور ان کے لئے مخلصانہ ایثار و قربانی کے وہ مواقع میسر ہوئے جن کی برکتوں سے ہمارے دامن بڑی حد تک خالی ہیں۔ اس سعادت پر وہ اپنے مولائے حقیقی کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

بھائی صاحب نے حج کے لئے درخوستیں دیں۔ اپنی ضعیف والدہ کی سہولت و آسائش کی خاطر بحری جہاز کی سیکنڈ کلاس کا انتخاب کیا۔ گو اس کے اخراجات عرشے کے مقابلے میں خاصے بھاری بھر کم تھے، لیکن ان کے سامنے جو بلند مقصد تھا اس کے پیش نظر ان اضافی اخراجات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ درخواستیں منظور ہوئیں اور اس مقدس سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اماں جی کا یہ قافلہ جو 12 جنوری 1968ء کو لاہور سے روانہ ہوا، چار افراد پر مشتمل تھا اماں جی، بھائی گل حسن صاحب، ان کی اہلیہ سعیدہ بیگم اور عزیزم ریاض الرحمٰن کی والدہ محترمہ جنہیں ہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھابھی صاحبہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اماں جی کی عمر اس وقت تقریباً 80 برس کے لگ بھگ تھی۔ ایک آنکھ کا آپریشن بھی ہو چکا تھا، لیکن اس کسمپرسی اور ضعیفی کے باوجود ان کا حوصلہ بلند اور قوت ارادی مضبوط تھی۔ ہو بھی کیوں نہ، وہ اسی دیار مقدس کے سفر پر جارہی تھیں جہاں کے ذرے ذرے سے روح کو تازگی و شادابی اور دل کو نورانیت کی بے بہا دولت حاصل ہوتی ہے۔

اس زمانے میں ہر حاجی کو اپنی پسند کا معلم مقرر کرنے کا اختیار تھا، چنانچہ اس قافلے کے سربراہ بھائی گل حسن صاحب نے جناب مقتدر سکندر کو بطور معلم منتخب کیا اور اپنے سامان کے ہر بنڈل پر ان کا نام تحریر کرالیا۔

کراچی سے بحری جہاز 18 جنوری کو روانہ ہوا۔ جہاز میں اماں جی اور ان کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں تھے، اس لئے یہ بحری سفر بڑے سکون سے گزرا اور کسی قسم کی پریشانی اور تکلیف پیش نہیں آئی۔ 25 جنوری کو یہ جہاز جدے کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ان دنوں ہمارے ایک عزیز شاگرد قاضی منظور احمد صاحب مکہ معظمہ میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ انہیں اماں جی اور ساتھیوں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی، اس لئے وہ اپنی کار لے کر جدے پہنچ گئے اور مہمانوں کو کار میں بٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ ان کا گھر مسجد حرام سے خاصے فاصلے پر تھا، لیکن ٹیکسیوں کی سہولت ہر وقت میسر تھی۔ قاضی صاحب نے اپنے گھر کا ایک کمرہ خدا کے گھر کے ان مہمانوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی دن اماں جی نے اپنے ساتھیوں سمیت قاضی صاحب کی رہنمائی میں عمرے کے طواف وسعی کے مناسک ادا کر کے وہ احرام کھول دیا جو جہاز میں باندھا تھا۔

اس سال حج چار مارچ کو ہوا، اس سے 25 جنوری سے ایام حج تک اماں جی کو روزانہ مسجد حرام میں آکر طواف کرنے، کالے غلاف میں لپٹے ہوئے اللہ کے گھر کی زیارت کرنے اور وہاں اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کی سعادتیں بڑی فراوانی سے حاصل ہوتی رہیں۔ اماں جی کو وقفے وقفے سے پیشاب آنے کی تکلیف بھی تھی جو عام طور پر اس عمر کا لازمی تقاضا ہے، اس لئے مسجد حرام میں حاضری کے ایسے اوقات مقرر کر لئے گئے جن میں اس تکلیف سے کم سابقہ پڑے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھائی گل حسن صاحب تو ساری رات باقاعدگی سے مسجد حرام ہی میں گزارتے۔ فجر کی نماز کے بعد قیام گاہ پر تشریف لاتے اور ناشتا کر کے سو جاتے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھا کر خدائے ذوالجلال کے باعظمت گھر پہنچ جاتے اور وہاں کے انوار و برکات سے اپنی جھولیاں بھرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے۔

بھابھی سعیدہ کا بیان ہے کہ میں روزانہ اماں جی اور بھابھی صاحبہ کو عصر سے پہلے ٹیکسی کے ذریعے حرم شریف لے جاتی تھی۔ نماز عصر کی ادائیگی کے بعد میں ان دونوں کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ کا طواف کراتی۔ اس طرح ہم نماز مغرب سے پہلے دو طواف کر کے فارغ ہو جاتے اور اس کے بعد خوب سیر ہو کر زمزم پیتے اور عشاء کی نماز پڑھ کر رہائش گاہ پر واپس آتے۔

شروع شروع میں رش کم تھا، اس لئے روزانہ حجر اسود کو بوسہ دینے کی سعادت حاصل ہوتی رہی، لیکن بعد میں اژدھام کی وجہ سے اس مقدس پتھر تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ اماں جی نے اس دوران پوری دو راتیں بھی حرم محترم میں گزاریں۔

بھابھی صاحبہ کا بیان ہے کہ حرم میں اماں جی اکثر وقت تلاوت قرآن میں گزارتیں۔ اجتماعی دعائیں جو قرآن میں مذکور ہیں، بڑی الحاح وزاری سی کرتیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی اولاد میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس کے دین و دنیا کی بھلائی اور ترقی کے لئے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے مالک سے التجائیں کرتیں۔

حج کے دنوں میں منیٰ کو روانگی، وہاں کا قیام، عرفات کا وقوف، رات کو مزدلفہ میں ٹھہراؤ، منیٰ میں واپسی، قربانی کا اہتمام اور رمی جمرات ایسے کٹھن اور دقت طلب مراحل میں ان سے بخیریت عہدہ برآ ہونا ایک ضعیف العمر اور کمزور انسان کے بس میں نہیں، لیکن اماں جی کو ایک ایسے بلند اقبال بیٹے اور ایک ایسی خوش خصال بہو کی محبت حاصل تھی جو ہر قدم پر ان کی دستگیری اور خدمت کو سب سے اہم فرض اور سب سے مقدس سعادت تصور کرتے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں ان کے ہاتھ پاؤں بن گئے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محترم بھائی گل حسن صاحب کی نیک بختی کے کیا کہنے کہ ان تمام مقدس مقامات میں ان کی حقیقی جنت ان کے ہم دوش تھی۔ عرش الٰہی تک براہ راست پہنچنے والی موثر اور قسمت کو بدل دینے والی دعائیں ہر وقت ان کے ہم رکاب تھیں۔ سعادت کی یہ معراج اسی کے حصے میں آتی ہے جس پر رب کائنات کی خصوصی نظر کرم ہو۔ حج کے مناسک سے فراغت کے بعد اماں جی کا قافلہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ بھائی گل حسن صاحب کا بیان ہے کہ اس سفر میں ان کی طبیعت پر سرور ونشاط کی والہانہ کیفیت طاری رہی۔ زبان پر درود وسلام کا ورد تھا۔ بھابی سعیدہ بتاتی ہیں کہ مدینہ منورہ میں رہائش کے لئے ہمیں جو مکان ملا، وہ مسجد نبوی کے قریب تھا۔ اس لئے اماں جی اور ہم تمام نمازیں باجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہی میں ادا کرتے تھے اور یہاں روضہ اطہر کی زیارت، ریاض الجنہ میں نوافل کی ادائیگی، اصحاب صفہ کے چبوترے پر تلاوت قرآن اور مسجد کے مختلف حصوں میں ذکر وانابت کے مواقع بکثرت نصیب ہوئے۔ روضہ انور پر حاضری کے وقت اماں جی خشیت ورقت کا پیکر بن جاتیں۔ آنکھوں سے سیلاب اشک امڈ پڑتا۔ اسی حالت میں اپنے محبوب آقا کی بارگاہ میں نہایت ادب واحترام کے ساتھ نذرانہ سلام پیش کرتیں۔

اماں جی نے پورے دس دن مدینہ منورہ میں گزارے اور پچاس فرض نمازیں مسجد نبوی میں ادا کیں۔ اس طرح براہ راست جلوہ گاہ نبوت سے کسب فیض کیا۔

حرمین شریفین کی زیارت اور شعائر اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اماں جی اور ان کے ساتھی 12 اپریل 1968ء کو واپس بخیریت لاہور پہنچے۔ ان دنوں اماں کی رہائش مین روڈ سمن آباد پر واقع ایک کوٹھی میں تھی۔ اس دن اس کوٹھی میں جشن کا سماں تھا۔ ان کے تمام عزیز واقارب اور رشتے داران کا پرخلوص استقبال کرنے اور ان سے مقبول دعاؤں کا تحفہ وصول کرنے کے لئے موجود تھے۔ ہر طرف مبارکباد کی صدائیں تھیں۔ گویا محبت کا چشمہ زمزم پورے جوش وخروش سے موجزن تھا۔ اماں جی ہر ایک بیٹے، بیٹی، بہو، پوتے، پوتی، نواسے اور نواسی کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لائی تھیں۔ یہ ان کے کردار کی عظمت کا بین ثبوت تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسط اپریل 1971ء میں ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے معائنہ کر کے علاج تجویز کیا، مگر بے سود۔ آخر کار اماں جی پر فالج کا نہایت شدید حملہ ہوا۔ حملہ اتنا سخت تھا کہ زبان بند ہو گئی اور جسم کا پورا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا۔ اتفاق کی بات ہے، جس دن ان پر فالج کا حملہ ہوا، ہم چاروں بھائیوں میں سے کوئی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ برادر محترم جناب گل صاحب حج کے لئے سعودی عرب تشریف لے جا چکے تھے۔ میں بسلسلہ ملازمت کنگن پور میں تھا۔ برادر عزیز اعجاز حسن کاروباری سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ برادر عزیز الطاف حسن، قاہرہ میں تھے۔

اعجاز حسن صاحب کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع ملی تو وہ اسی شام بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گئے۔ خبر ملتے ہی میں بھی اگلے دن ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ تین چار یوم بعد الطاف حسن بھی آ گئے، مگر برادر گل حسن صاحب کی واپسی میں تقریباً ایک مہینہ لگا۔

لاہور میں علاج معالجے کے اسباب و وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں ماہر ڈاکٹر بھی موجود ہیں اور نامور اطبا بھی۔ ڈاکٹروں میں ڈاکٹر عبدالرشید اور ڈاکٹر عالمگیر صاحب مسلسل علاج کرتے رہے۔ ان کے مشورے کے مطابق وقتاً فوقتاً دوسرے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی جاتی رہیں۔ اطبا میں حکیم نیر واسطی صاحب، حکیم محمد انور جابری صاحب، حکیم حافظ مختار الٰہی صاحب اور حکیم محمد عبداللہ صاحب جہانیاں والے اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں علاج تجویز کرتے رہے، مگر قدرت کے فیصلے کے مقابلے میں انسانی تدابیر و مساعی کب کارگر ثابت ہوتی ہیں! آخر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر ذی روح کے لئے مقدر ہے۔ یکم اپریل 1972ء کو بروز ہفتہ اس وقت جب وہ اپنی سحر خیزی کے معمول کے مطابق اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس سے راز و نیاز کی باتیں کیا کرتی تھیں، دعوت اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس طرح ہم سب بہن بھائی ایک ایسے سایہ رحمت و شفقت سے محروم ہو گئے جو نہایت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹھنڈا، فرحت بخش، دلنواز، روح پرور اور حوصلہ افزا تھا۔ اس سایہ میں ہمارے لئے ہر قسم کے رنج ومحن، آلام ومصائب اور شدائد وخطرات کے مقابلے میں تحفظ کا احساس امن وسلامتی، برکت وعافیت اور رافت ورحمت کی خنکی موجود تھی۔

اماں جی کے آخری سانس لینے کے فوراً بعد فجر کی اذان کی ایمان پرور صدائیں فضا میں ہر طرف گونجنے لگیں۔ حق ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔ ساری کائنات پر اسی کی خدائی وفرمانروائی ہے۔ کامیابی سے ہمکنار ہوگیا وہ جو اس کا ہوگیا۔ تباہ برباد ہوگیا وہ جس نے اس سے منہ موڑا۔

اماں جی کو غسل ان کی بیٹیوں اور بہوؤں نے اپنے ہاتھ سے دیا۔ نہلانے اور کفنانے کے بعد جب ان کی میت منہ دکھانے کے لئے کمرے میں رکھی گئی تو ان کے وجیہہ چہرے پر عجیب قسم کی روحانیت اور نورانیت تھی۔ نورانیت ایسی جس میں آنکھوں کو خیرہ کردینے والی آب وتاب اور چمک دمک تھی۔ میں اپنی حد تک نگاہ جما کر دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ اماں جی کی وصیت کے مطابق برادرم گل حسن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر روتی ہوئی آنکھوں، تڑپتے اور بلکتے ہوئے دلوں اور لرزتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میانی صاحب کے قبرستان میں ہزاروں من مٹی کے نیچے ان کو دفن کردیا جہاں اب وہ محو استراحت ہیں۔

اماں جی کا سایہ اپنی اولاد کے لئے کتنا باعث برکت اور موجب رحمت تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے تین دن بعد ہی 4 اپریل 1972ء کو رات آٹھ بجے ان کے دو بیٹوں یعنی برادران عزیز ڈاکٹر اعجاز حسن اور الطاف حسن معروف بہ قریشی برادران کی مارشل لا ضابطے کے تحت گرفتاری عمل میں آگئی۔ ان کے رسالے ''اردو ڈائجسٹ'' اور ''زندگی'' بند کردیے گئے۔ فوجی عدالت قائم ہوئی جس نے یکطرفہ سرسری سماعت کے بعد دو سال قید بامشقت اور لاکھوں روپے جرمانے کا حکم سنایا۔ قریشی برادران اور ان کے خاندان والوں پر شدید ابتلا وآزمائش کا یہ دور 4 اپریل 1972ء سے شروع ہوکر وسط جولائی 1977ء تک یعنی پانچ سال سے زیادہ رہا۔ اس میں قید وبند کی صعوبتیں، مقدمات کی بھرمار، ذرائع آمدنی کی کلی طور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر بندش اور ذہنی کرب جیسی زہرہ گداز اور حوصل شکن صورتیں مسلسل پیش آتی رہیں۔ اپنی اولاد کے حق میں اماں جی کی دعاؤں کا وہ ذخیرہ جو خزانہ خداوندی میں جمع تھا، قریشی برادران کو اس مسلسل، متواتر اور نا قابل برداشت ابتلاو آزمائش میں کامیاب اور سرخرو بنانے کا ذریعہ بنا۔ وہ پامردی اور جرات سے ہر ظالمانہ اور سنگ دلانہ وار کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر کار ظلم تھک کر چور چور اور پاش پاش ہو گیا۔ اگر اماں جی کی محفوظ دعائیں رحمت خداوندی کو رحم و کرم پر آمادہ نہ کرتیں تو قریشی برادران اور ان کے خاندان کی خستگی وخوارگی، تباہی و بربادی اور ہلاکت وخسران میں کون سی کسر باقی رہ گئی تھی!

اماں جی کی پرورش وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، فرائض نماز اور نوافل تہجد کی ادائیگی ان کا مستقل معمول تھا۔ جب تک نگاہ کام کرتا رہی، قرآن مجید کی تلاوت ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کے ساتھ کرتی رہیں۔ انہیں قرآن پاک اور اس کے ترجمے پر اتنا عبور تھا کہ اگر قرآن پڑھنے والا زیر زبر کی غلطی بھی کر دیتا تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح فرما دیتیں۔ قرآن مجید کی کسی آیت کی تلاوت کرو، وہ اس کا ترجمہ سنا دیتیں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی مہارت رکھنے والوں کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل بشارت دی ہے:

"قرآن مجید میں مہارت رکھنے والے نیک اور معزز فرشتوں کے ساتھ ہیں۔"

اماں جی کو آخری پاروں کی اکثر سورتیں زبانی یاد تھیں جنہیں وہ روزانہ مختلف اوقات میں پڑھتی تھیں۔ بینائی کمزور ہونے سے جب وہ قرآن کی تلاوت سے محروم ہو گئیں تو ان کا دارومدار صرف ان یاد کی ہوئی سورتوں پر تھا۔

اماں جی سحر کے وقت جس رقت وخشیت اور گریہ وزاری سے اپنے مولائے حقیقی کی جناب میں دعا کرتی تھیں وہ اتنی پراثر ہوتی تھی کہ "اجابت از درحق بہر استقبال مے آید" کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جایا۔

اماں جی قرآنی دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کے لئے اپنے رب سے بھیک مانگتیں۔

سورہ توبہ کی آخری دو آیتوں کا ورد بڑے ہی ذوق، محبت و شوق اور جذب و شیفتگی سے کرتی تھیں۔ معلوم ہوتا کہ ان آیات کا ایک ایک لفظ ان کے قلب و روح کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔

اماں جی کی دعا تھی کہ اس دنیا میں انہیں بے بسی، بے چارگی و محتاجی کا دور نہ دیکھنا پڑے، لیکن ان پر فالج کا انتہائی سخت حملہ ہوا جس نے ان کے پورے جسم کو بے کار، معطل اور مفلوج کر دیا تھا اور یہ کیفیت پورے ساڑھے گیارہ ماہ تک رہی، تاہم یہ ان کی مقبول اور پرتاثیر دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ ان کی اولاد اور متعلقین کے دلوں میں رب کریم نے ان کی مخلصانہ خدمت اور مشفقانہ عیادت کا پرجوش ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ سب ان کے چلتے پھرتے ہاتھ پاؤں بن گئے تھے۔ اس سلسلے میں مسابقت کا یہ والہانہ داعیہ اور جذبہ اتنا شدید و عمیق تھا کہ باید و شاید۔ میں اماں جی کی علالت کی اطلاع پا کر جب اگلے دن کنگن پور سے لاہور پہنچا تو ان کی زبان بند، ہوش و حواس معطل اور جسم کا دایاں حصہ مفلوج تھا۔ اس کے باوجود بے قراری اور بے چینی اپنے نکتہ عروج پر تھی۔ مدہوشی کے عالم میں وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر دل تڑپ کر رہ گیا۔ آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئیں۔

ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں ان کے پاس ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ ان کا جسم دباتا بھی رہا اور دھیمی آواز میں قرآن پاک بھی پڑھتا رہا۔ قرآن کی تلاوت کرتے کرتے دل کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ تسکین محسوس کر رہی ہیں۔ جب رات آتی تو میں اکثر اپنے بہن بھائیوں کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ میں رخصت پر ہوں، اس لئے رات کی ڈیوٹی کے لئے میں کافی ہوں۔ میں ساری رات انہیں کتاب اللہ سناتا رہتا۔ اس طرح میرے دل اور ان کی روح کو سکون و نشاط کی کیفیت نصیب ہوتی رہتی۔ ہفتوں گزر گئے، نہ تھکاوٹ کا احساس ہوا اور نہ اکتاہٹ کا۔ میں اپنی کتاب زندگی کے اکسٹھ ورق پلٹنے کے باوجود مزاج و طبیعت کے لحاظ سے بچوں کے گروہ میں شامل ہوں یعنی میری نیند اب بھی روزانہ دس گھنٹے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی خلل آ جائے تو جسم اور دماغ کا تمام نظام معطل ہو جاتا ہے، مگر اسے تائید غیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہفتوں مسلسل جاگنے کے باوجود نہ جسم کی قوت کار میں کوئی فرق آیا اور نہ طبیعت کے نشاط میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ میں انہیں ایک دن اور رات میں پورا قرآن مجید سنا دیتا۔

اماں جی کو قرآن مجید سے جو گہرا لگاؤ تھا، اس کے سبب اپنی اولاد کو اس کی تعلیم دلانے کا پورا اہتمام کیا۔ اپنی سب بیٹیوں کو گھر پر خود ناظرہ قرآن پڑھایا اور بیٹوں کو قاری صاحب سے اس کی تعلیم دلوائی۔ پانچ سال کی عمر میں جب ہمیں اسکول میں داخل کرایا جاتا تو ساتھ ہی مسجد میں قاری صاحب کے پاس قرآن کی تعلیم کے لئے بٹھا دیا جاتا۔ سردیوں میں ہم فجر کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتے۔ اس کے بعد قاری صاحب سے قرآن پاک کا سبق لے کر سوا آٹھ بجے تک یاد کیا کرتے۔ وہاں سے فارغ ہو کر گھر آتے اور روٹی کھا کر اسکول کی طرف چل دیتے۔ گرمیوں کے موسم میں نماز ظہر سے نماز عصر تک قرآن پاک کی تعلیم ہوتی۔ جونہی ہم چوتھی جماعت پاس کرتے، ناظرہ قرآن مجید بھی ختم کر لیتے۔ قاری صاحب کے قرآن پڑھانے کا طریقہ نہایت موثر اور سائنسی انداز کا تھا۔ ان سے جو کوئی ناظرہ قرآن پڑھ لیتا اس میں بلا کی روانی ہوتی۔ حروف کے صحیح مخارج سے ادائیگی پر عبور ہوتا۔ قرات میں حسین نغمگی کی دلنواز کیفیت ہوتی۔

گھر کی بھرپور ذمے داریوں کے باوجود ہابڑی اور سرسہ کے قیام کے دوران اماں جی کا یہ معمول رہا کہ وہ محلے کی بچیوں کو ناظرہ قرآن پڑھاتیں۔ سینکڑوں بچیوں نے ان سے قرآن پاک پڑھا۔ قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں خانہ داری کی تربیت دیتیں۔ اس طرح اماں جی کا گھر ہمیشہ ایک دینی اور معاشرتی تربیت گاہ کی حیثیت اختیار کئے رہا۔ اس تربیت گاہ میں جو بچی آ جاتی، اماں جی کے ساتھ اس کا ماں بیٹی کا رشتہ مستقل اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جاتا۔ وہ بڑی ہو جاتیں، ان کی شادیاں ہو جاتیں، بال بچوں والی ہو جاتیں، لیکن اس رشتے کی پاکیزگی اور نفاست میں کوئی فرق نہ آتا۔ اماں جی ان کے دکھ سکھ میں کام آتیں۔ عید پر انہیں عیدیاں بھجواتیں۔ اگر ان کی خانگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی میں کوئی ناہمواری پیدا ہو جاتی تو مداخلت کر کے ان کو ہموار اور درست کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے سسرال والے بھی اماں جی کی بزرگانہ خدمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے سامنے سر تسلیم کر دیتے۔

ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن کی کثرت کے باعث اللہ تعالیٰ نے اماں جی کی زبان اور ان کے دم میں ایک شفا بخش تاثیر پیدا کر دی تھی۔ وہ جس مریض پر آیات الٰہی پڑھ کر دم کر دیتیں وہ خدا کے فضل سے شفایاب ہو جاتا۔ بعض بیماریوں میں ان کا یہ عمل تریاق کی حیثیت رکھتا تھا۔ مثلاً کن پھڑ، بچوں کا نمونیہ، موذی اور زہریلے جانوروں کا کاٹ لینا اور درد سر وغیرہ۔ مریض بلکتے اور تڑپتے آتے اور ہنستے کھیلتے جاتے۔ مار گزیدہ مریض آتا، اماں جی اسے نیم کے پتے چبواتیں۔ ساتھ ساتھ دم کرتی جاتیں۔ جب تک زہر کا اثر جسم میں ہوتا، نیم کے پتے مریض کو میٹھے یا پھیکے محسوس ہوتے۔ دم کا سلسلہ جاری رہتا یہاں تک کہ ان کی کڑواہٹ کو اس کی قوت ذائقہ محسوس کرنے لگتی۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ جسم سے زہر کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ یہ سب قرآن پاک کی برکت اور اس کا اعجاز تھا۔ دین کے ساتھ گہرے ربط نے ان کے اندر ایک روحانی قوت پیدا کر دی تھی۔ اس وقت کے چند واقعات بیان کرتا ہوں جو بڑے ہی دلچسپ ہیں:

اماں جی نے خود بیان کیا تھا کہ ہابڑی میں ایک مرتبہ ایک ایسی بیماری وبا کی صورت اختیار کر گئی جس میں مریض پہلے بخار میں مبتلا ہوتا، آہستہ آہستہ بخار کی تیزی اور شدت بڑھ جاتی اور مریض بے سدھ ہو جاتا۔ اس بیماری نے میرے گھر پر بھی حملہ کیا۔ ایک ایک کر کے سارے بچے اور تمہارے ابا جی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ گھر میں صرف میں اکیلی تندرست تھی جو سب بیماروں کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ میں ساری رات جاگتی اور بچوں کو باری باری دیکھتی جاتی۔ پریشانی کی حالت میں تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک رات جو میری آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سفید پوش اور سفید ریش بزرگ ایک ایک مریض کے سرہانے جا کر کچھ پڑھ کر دم کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا: ''آپ کون ہیں؟'' جواب میں انہوں نے فرمایا: ''کیا تم ہمیں نہیں جانتیں؟''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ہی ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ ہم تمہارے قریب سامنے ہی رہتے ہیں۔

اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ سب مریض اٹھ بیٹھے ہیں۔ کوئی پانی مانگ رہا ہے تو کوئی روٹی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بیماری سے رہائی پا چکے ہیں۔ میں نے اللہ کے اس احسان پر سجدہ شکر ادا کیا۔

برادر عزیز ڈاکٹر اعجاز حسن رلوی ہیں کہ 1942ء کی ایک شام اسکول سے پڑھ کر گھر آیا تو اماں جی نے کہا: ''فوراً تیار ہو جاؤ تمہیں میرے ساتھ مونک جانا ہے۔'' لهاں جی، کل چلیں گے۔'' فرمانے لگیں: ''ابھی چلنا ہے۔ گل حسن کی طرف سے میرا دل بہت پریشان ہو رہا ہے۔'' برادر محترم گل حسن صاحب اس وقت مونک کی نہری کوٹھی میں بطور سگدیار تعینات تھے، چنانچہ میں فوراً تیار ہو گیا۔ اماں جی کو لے کر اسٹیشن پہنچا۔ اگلے روز علی الصبح ہم کرنال پہنچے۔ کرنال سے مونک تک تقریباً 20 میل کا فاصلہ تانگے پر نہر کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ طے کیا جا سکتا تھا، چنانچہ نہر کی پٹڑی پر سفر کرنے کی اجازت لینے کے لئے ہم کرنال میں واقع نہر کی کوٹھی پر پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی سگدیار فوراً بولا: ''تمہیں گل حسن کی بیماری کا کیسے پتہ چلا؟ وہ تو شاید ایک ہفتے سے بیمار ہیں۔ تار کی لائن پر مونک سے کوئی پیغام آ رہا ہے نہ کوئی وصول کر رہا ہے۔''

ہم کرایے پر تانگہ لے کر نہر کی پٹڑی پر سفر کرتے ہوئے مونک کی نہری کوٹھی کے تار گھر پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ برادرم گل حسن صاحب چارپائی پر اس حالت میں پڑے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہیں۔ اماں جی نے انہیں آواز دی۔ ماں کی آواز سنی تو آنکھیں کھولیں۔ ان کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ ماں کی زیارت صحت کا مژدہ لے کر آئی۔ تھوڑی دیر میں پسینہ آیا اور بخار اتر گیا۔ ہوش و حواس بحال ہونے پر انہوں نے بتایا کہ آٹھ دن سے بخار کے ہاتھوں اسی طرح بے بس پڑا ہوں۔

یہ اماں جی کی روحانی قوت کا کرشمہ تھا کہ کسی مادی ذریعے کے بغیر ان کے دل کو اپنے دور افتادہ بیٹے کی بیماری کی صورت حال محسوس ہو گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1943ء کی گرمیوں میں ہماری بڑی ہمشیرہ انوری بیگم کا انتقال ہوا۔ میں ان دنوں امرتسر میں پڑھتا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسن بتاتے ہیں کہ ایک شام میں گھر لوٹا تو والدہ نے ہمشیرہ انوری بیگم کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا اور مجھے ہدایت کی کہ فوراً شام کی گاڑی سے بٹھنڈہ جا کر بہن کی خیریت معلوم کر کے آؤ اور اگر کوئی پیچیدہ صورت دیکھو تو انہیں ساتھ لے آنا، چنانچہ میں ریل گاڑی سے رات 9 بجے بٹھنڈہ پہنچا۔ ہمشیرہ کے ہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ زچگی کی تکلیف میں ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہیں جو میری سمجھ سے باہر تھی، تاہم میں نے والدہ کی ہدایت کے مطابق ان کو سرسہ لانے کا فیصلہ کیا اور بمشکل تمام صبح کی گاڑی سے نو بجے کے قریب ہم سرسہ پہنچے۔ والدہ نے ہمشیرہ کو دیکھتے ہی ان کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر دیا۔ ان کی زندگی بچانے کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا گیا، مگر مشیت ایزدی سے زچہ و بچہ دونوں جانبر نہ ہو سکے۔ والدہ نے اپنے ہاتھوں سے انوری بیگم کو غسل دیا اور کفنایا اور نہایت ہی صبر کے ساتھ جوان بیٹی کو آخری سفر پر رخصت کیا۔

4 جون 1947ء کو ہماری دوسری بہن بلند اقبال کا مشن ہسپتال بھوانی میں رسولی کا آپریشن ہوا۔ اس آپریشن سے وہ جانبر نہ ہو سکیں اور 10 جون کو 32 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ ہم سرسہ سے میں تھے اور بڑے بھائی گل حسن بسلسلہ ملازمت حصار میں تھے۔ بہن بلند اقبال کی میت اماں جی اور ڈاکٹر اعجاز حسن بذریعہ ٹرک لے کر آئے اور وہیں انہیں دفنایا گیا۔ فسادات کے باعث حصار میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ چیف جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ انوار الحق ان دنوں وہاں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان سے جنازے کے لئے پرمٹ لیا گیا۔ والدہ نے اپنے ہاتھوں سے اس جوان بیٹی کو نہلا کفنا کر بغیر آنسو بہائے، یہ کہہ کر تدفین کے لئے رخصت کیا کہ ''اللہ کی امانت، اللہ کے سپرد!''

دسمبر 1943ء کی ایک رات جبکہ سردی اپنے شباب پر تھی، اماں جی سانس کی تکلیف کی شدت سے اٹھ بیٹھیں۔ میں اور دوسرے بہن بھائی انہی کے کمرے میں سو رہے تھے۔ ان کی بے چینی اور بے قراری سے میری بھی آنکھ کھل گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات کے تقریباً چار بجے ان پر غنودگی کی حالت طاری ہو گئی۔ چند منٹ بعد وہ چونک کر اٹھیں اور فرمانے لگیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"افروغ! میں نے ابھی ابھی ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ حسار میں میرے مرشد حضرت خواجہ حافظ عبدالصمد صاحب تہجد کی نماز کے لئے اٹھے ہیں۔ اپنی مسجد کے حوض پر وضو کر رہے ہیں اور میری تکلیف کی بے قراری دیکھ رہے ہیں۔ وضو ختم کرنے کے بعد انہوں نے اپنے چلو میں تھوڑا سا پانی لے کر میری طرف پھینکا اور کہا: "اللہ فضل کرے گا۔" پانی کے وہ چھینٹے میرے چہرے پر پڑے جس سے میری آنکھ کھل گئی اور اب مجھے سانس کی تکلیف بالکل نہیں۔"

اس کے بعد اماں جی نماز فجر تک آرام سے سوتی رہیں۔ دمے کی وہ تکلیف جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دم کے ساتھ جاتی ہے، بفضل خدا ہمیشہ کے لئے جاتی رہی۔ پھر ساری عمر اس بیماری اور تکلیف کی شکایت نہیں ہوئی۔

ان کا معمول تھا کہ جب سالن پکاتیں اس میں سے پڑوس کے دو تین گھروں کو ضرور بھیجتیں۔ سرسہ میں ہمارے پڑوس میں ایسے مزدور پیشہ لوگ بھی تھے جو سارے دن محنت شاقہ برداشت کرنے کے باوجود بمشکل اتنا حاصل کر پاتے کہ روکھی سوکھی روٹی سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکیں۔ ان کے لئے سالن کا یہ معمولی تحفہ نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا۔

خلق خدا کی نفع رسانی کے لئے اماں جی نے اپنے پاس ایک صندوقچی رکھی ہوئی تھی جس میں کچھ دیسی اشیاء مثلاً سونف، اجوائن، کالا نمک، سونٹھ، پودینہ، جائفل، ملیٹھی اور گل بنفشہ وغیرہ ہر وقت موجود رہتیں۔ خواتین اپنے بچے لے کر آتیں اور ان کی تکلیف بیان کرتیں۔ اماں جی حسب حال، بلا کسی معاوضہ صندوقچی میں سے کوئی نہ کوئی دوا دے دیتیں۔ اللہ کریم ان معمولی دواؤں ہی کو ان کے لئے صحت یابی کا سبب بنا دیتا۔

سرسہ ایک گرم ریگستانی علاقے میں واقع تھا۔ گرمیوں کے موسم میں آشوب چشم کی تکلیف ایک وبا کی صورت اختیار کر لیتی اور چھوٹے بچے زیادہ متاثر ہوتے۔ تکلیف شروع ہوتے ہی آنکھیں سرخ ہو کر ابل پڑتیں۔ دو تین دن ہی میں ان میں ککرے پڑ جاتے جس سے مریض کو بے

محکم دلائل سے مزین متنوّع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حد اذیت اور تکلیف محسوس ہوتی۔ بچہ ساری رات سوتا نہ گھر والوں کو سونے دیتا۔ اماں جی ایسے بچوں کی آنکھوں میں رات کے وقت اپنے ہاتھ سے جست کا سفوف ڈالا کرتی تھیں۔

اللہ نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسی شفا رکھی تھی کہ دوبار دوا ڈالنے سے آنکھ بالکل صاف ہو جاتیں۔ عشاء کی نماز کے بعد اکثر کئی خواتین اپنے بچوں کی آنکھوں میں دوا ڈلوانے آتیں، مگر کیا مجال کہ اماں جی کی طبیعت میں کبھی جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہوئے ہوں۔ ہر آنے والی سے خیر و عافیت دریافت کرتیں۔ خندہ پیشانی سے انہیں عزت کے ساتھ بٹھاتیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاکیزہ ارشاد پر عمل کرتیں۔

''اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے پیش آنا بھی نیکی ہے۔''

سرسہ کے قیام کے دوران محلے کی عورتیں اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کے پیش نظر قرض حسنہ لینے آتیں۔ اماں جی ان کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کے لئے خاموشی سے قرض دے دیتیں۔ بعض دفعہ اس طرح انہیں اپنی ضروریات موخر کرنا پڑتیں۔ فرمایا کرتی تھیں: ''میرا ابھی کوئی کام رکا نہیں رہا۔ زندگی میں جو ضرورت بھی پیش آئی مولائے کریم نے اپنے خزانہ غیب سے اسے پورا کرنے کے اسباب مہیا فرما دیئے۔''

اماں جی کی بلند ہمتی، اعلیٰ حوصلگی اور وسیع النظری کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ مدت مقررہ گزر جانے کے باوجود مقروض سے قرض کی واپسی کا کبھی مطالبہ نہ کرتیں۔ اسے مہلت دیئے رکھتیں تاکہ ہاتھ کشادہ ہونے پر وہ خود ہی سہولت کے ساتھ ادا کر دے۔ ناداری قرض کی واپسی میں حائل ہو جاتی تو اس پر کسی قسم کا احسان جتائے بغیر اللہ کی رضا کی خاطر معاف فرما دیتیں۔

سرسہ میں ہمارے پڑوس میں کچھ گھر ایسے بھی تھے جن میں کوئی مرد نہ تھا۔ ان کے مرد ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے۔ ان گھروں کی خواتین کوئی ہماری منہ بولی خالہ تھی، کوئی پھوپھی اور کوئی بہن۔ وہ ہمارے لئے سراپا شفقت تھیں اور ہم ان کی خدمت کو اپنے لئے خوشی کا موجب سمجھتے۔ میں اور برادران عزیز اعجاز حسن اور الطاف حسن بازار سے ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھروں کا سودا لا کر دیتے۔ سروں پر دانے اٹھا کر چکی پر پسوا کر لاتے۔ ٹال سے لکڑیاں اٹھا کر ان کے گھر پہنچاتے۔ ان کی طرف سے ہمارے لئے نیک دعائیں ہوتیں جنہیں وصول کر کے ہماری خوشی اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اماں جی کے پاس بہت سی بوڑھی عورتیں آتیں۔ اماں جی انہیں نہلاتیں، ان کے سر گوندھتیں۔ انہی ضعیف خواتین میں ایک ''خالہ عمدہ'' تھیں۔ وہ ہر جمعے باقاعدگی سے اماں جی کے پاس آتیں۔ وہ اماں جی کو بہو کہہ کر پکارا کرتیں۔ اماں جی انہیں نہلا دھلا کر کپڑے بدلواتیں اور میلے کپڑے دھو کر دیتیں۔

بیماری کی خدمت اور ان کی ہر طرح سے خبر گیری اماں جی کا شعار تھا۔ پڑوس میں اگر کوئی بچہ یا خاتون بیمار پڑ جاتی تو ان کی عیادت کرنا، مریض کے لئے پسند کی چیز تیار کر کے لے جانا ان کا معمول تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھیں جنہیں ہم خالہ حکیمن کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے بھائی بھتیجے اور بہو بیٹے، سبھی رشتے دار موجود تھے۔ وہ جب زیادہ بیمار ہوئیں تو انہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ مجھے میری بہن کے پاس سرسہ پہنچا دو۔ وہی میری خدمت کرے گی، چنانچہ وہ اماں جی کے پاس آ گئیں۔ ان کی بیمار اور ناتوانی اتنی بڑھ گئی کہ پیشاب پاخانہ بھی وہ بستر پر کرنے لگیں۔

اماں جی اپنے ہاتھ سے تمام نجاست صاف کرتیں اور ان کے کپڑے اور بستر بدلتیں۔ تقریباً دو ماہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ایک دن ان کا بیٹا حصار سے آیا اور مدہوشی کے عالم ہی میں انہیں اپنے ساتھ لے گیا جہاں اگلے دن ان کا انتقال ہو گیا۔

اماں جی کو جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے فرمایا:

''خدا کا شکر ہے کہ میری بہن نے اپنے بیٹے کے گھر دم دیا۔ اگر میرے پاس ایسی ویسی بات ہوتی تو معاشرے میں اس کے بیٹے کی ناک کٹ جاتی۔'' اس سے اماں جی کی بے لوثی، بے غرضی اور دوسروں کی عزت قائم رکھنے کی زبردست خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ سرسہ میں 1913ء سے 1947ء تک اماں جی کے گھر میں ایک ہی خاکروب نے کام کیا۔ ہم سب بہن بھائی اسی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامنے بچپن سے جوانی کے عالم میں پہنچے۔ اس کا نام گھونکی تھا جسے ہم اماں گھونکی کہتے تھے۔ وہ اماں جی کو بہن کہہ کر پکارتی تھی اور اماں جی بھی اسے بہن ہی کہتیں۔ وہ ذات کی چوہڑی تھی، مگر بنیادی انسانی اخلاق کی خوبیوں سے آراستہ۔

اس بات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ اس دور میں گھروں سے غلاظت اٹھانے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے والی جمعدارنیوں کی اجرت چھوٹے کنبے والے گھر سے چار آنے ماہانہ اور ایک روٹی یومیہ، اور بڑے کنبے والے گھر سے آٹھ آنے ماہانہ اور روٹی ہوتی تھی۔ ان کے لئے سارے دن غلیظ ترین کام کرنے کے باوجود اپنا اور اپنے بال بچوں کا صرف پیٹ بھرنا بھی سخت مشکل ہوتا تھا۔ اماں گھونکی گھروں کے کام سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت اماں جی کے پاس آ جاتی۔ اماں جی اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیتیں اور گرم گرم روٹیاں پکا کر دیتی جاتیں یہاں تک کہ سیر ہو جاتی اور بے شمار دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر چلی جاتی۔

اماں جی نے گھر میں ایک حمام لگایا ہوا تھا۔ سردیوں کے موسم میں اس میں پانی گرم ہوتا۔ اماں گھونکی روزانہ ایک بڑا سا تانبہ کوڑے کا بھر کر کہیں باہر سے لاتی جس کے جلنے سے پانی گرم ہوتا۔ اماں جی اس کو اس محنت کی اضافی اجرت دینے کی ہر ممکن کوشش کرتیں، مگر وہ کہتی: ''بہن، شرمندہ نہ کر، میں اس محنت کی اجرت کبھی نہیں لوں گی۔ صبح کو میرے بچے نماز کے لئے وضو کریں گے تو مجھے بھی ثواب ہوگا۔ میرے ثواب میں خلل نہ ڈال۔'' فروری 1946ء میں اماں گھونکی سخت بیمار ہوگئی۔ اس کی بہو گھروں میں کام کرنے لگی۔ ان دنوں برادر عزیز اعجاز حسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ برادرم الطاف حسن سالانہ امتحان کی تیاری کی وجہ سے بے حد مصروف۔ اماں جی نے ایک شام مجھے فرمایا: ''میری بہن گھونکی بیمار ہے۔ بیماری کی وجہ سے اس کے منہ کا مزہ بھی خراب ہو گیا ہوگا۔ ویسے بھی میرے تیار کردہ سالن کے سوا وہ کسی اور کے ہاتھ کا سالن پسند نہیں کرتی۔ وہ تو اس طرح بھوکی مر جائے گی، اس لئے مغرب کے بعد تم اسے روز سالن پہنچایا کرو۔''

گھونکی کا گھر ہمارے گھر سے تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا۔ میں روزانہ ان کے لئے سالن لے کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا۔اماں گھوٹکی جونہی مجھے دیکھتی،خوشی کے مارے کھل جاتی۔نقاہت اور کمزوری کے باوجود اٹھ کر بیٹھ جاتی۔بڑے حوصلے سے باتیں کرتی۔محسوس ہوتا کہ ان کی بیماری کافور ہو چکی ہے اور مسرت و انبساط کی وجہ سے اس کی زائل شدہ توتیں بحال ہو رہی ہیں۔ان کے دل کی گہرائیوں سے جو بے شمار دعائیں نکلتیں،الفاظ کی تنگ دامنی ان کو احاطے میں لانے سے قاصر ہے۔یہ سلسلہ دو ہفتے تک جاری رہا۔آخر کار اماں گھوٹکی صحت یاب ہو کر اپنے کام پر آنے لگی......محبت و شفقت میں کتنی عظیم طاقت ہے۔

اماں جی نے بچوں کی نفسیات پر کتابیں تو نہیں پڑھی تھیں مگر عملی طور پر اس میدان میں ان کا تجربہ نہایت وسیع اور کامیاب تھا۔وہ اپنے ہر بچے کے طبعی رجحانات اور ذہنی میلانات کے مطابق برتاؤ کر کے اسے ہر قسم کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں سے بچا کر رکھتیں کہ ان کی نشوونما اور ارتقا میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔مثلاً برادرم اعجاز حسن جو خدا کے فضل و کرم سے اب ڈاکٹر اعجاز حسن ہیں اور نانا اور دادا کے قابل احترام رشتوں کے اعزازات سے مشرف ہو چکے ہیں،، انہیں ہم سب بہن بھائیوں میں بچپن ہی سے شرارتوں کا بھرپور شوق تھا۔ان کی شرارتیں گھر کی گہما گہمی اور رونق میں خاطر خواہ اضافہ کیے رکھتیں،مگر ان کی یہ حرکتیں اماں جی کو کبھی مشتعل اور مغلوب الغضب بنانے کا ذریعہ نہیں بنیں۔وہ فرمایا کرتی تھی:

"شرارتیں کرنا بچوں کا بنیادی اور فطری حق ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ بچے کا جسم صحت مند اور اس کا ذہن متحرک اور فعال اور زرخیز ہے۔اس عمل کو روکنا بچے کے ساتھ سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ بڑی حکمت و دانائی اور صبر و تحمل سے اس کی ان حرکت پذیر صلاحیتوں اور توانائیوں کو مثبت اور تعمیری کاموں میں لگایا جائے۔"

ہمارے برادر عزیز الطاف حسن بچپن ہی سے کم گو ہونے کے ساتھ ساتھ صبر و قناعت کا پیکر تھے۔کسی معاملے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار الفاظ کے ذریعے کرنا ان کی عادت میں شامل ہی نہیں تھا......وہ خاموش احتجاج کی روش اختیار کرتے۔اماں جی اپنے اس بچے کے تیور دیکھ کر فوراً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی ذہنی اور قلبی کیفیت بھانپ لیتیں اور معاملات و حالات اس کی پسند کے مطابق ڈھال دیتیں۔

ہمارے گھر کی آمدنی مناسب اور اخراجات وسیع تھے۔ اس کے باوجود وہ گھر کا نظام کچھ اس طرح کفایت شعاری، خوش اسلوبی اور منصوبہ بندی سے چلاتیں کہ کبھی تنگی کا احساس نہ ہوتا۔ وہ پیسے کی کمی سلیقہ مندی، ہنرمندی اور اپنے ہاتھ سے محنت مشقت کر کے پورا کرتیں۔ وہ سکول جانے والے بچوں کی فیس بروقت ادا کر دیتیں اور دوسری تعلیمی ضروریات کی فراہمی میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہ کرتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر بچے کو اس کے سکول کی فیس اور ضروریات کی اشیا وقت پر نہ ملیں تو اسے اپنے اساتذہ اور ہم مکتبوں کے سامنے خفت و ندامت اٹھانا پڑتی ہے جس سے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنی شخصیت مجروح کر بیٹھتا ہے اور بعض دفعہ تعلیم سے بددل ہو کر راہ فرار اختیار کر لیتا ہے۔

تربیت اولاد کے سلسلے میں اماں جی کا یہ طرز عمل بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب اولاد کے لئے تھا۔ انہوں نے کوئی چیز اپنی اولاد سے چھپا کر نہیں رکھی اور اولاد کی ضرورتوں اور ان کی جائز خواہشوں کو ہمیشہ اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات پر مقدم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اولاد ہر وقت ان کی وفادار اور اطاعت گزار رہی۔ اس کی نگاہیں ان کے سامنے ادب و احترام سے جھکی رہیں۔

اماں جی نے اپنی اولاد کی پرورش میں ایک اور بات کا خیال رکھا۔ وہ یہ کہ بچپن ہی سے بچوں کو سادہ اور سخت زندگی گزارنے کا عادی بنایا۔ کپڑوں میں سادگی، کھانے میں سادگی اور رہنے سہنے میں سادگی، اور سادگی کے ساتھ ساتھ جفاکشی۔ اس تربیت نے ان کی اولاد میں حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔

جرأت و بے باکی اور استقامت و بے خوفی ان کی سیرت کے اہم اجزا تھے۔ کسی غلط موقف کے سامنے جھکنا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتیں اس کے اظہار میں انہیں کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خطرے کا خوف تھا نہ کسی ملامت کا ڈر۔

ان کے نزدیک ایک مسلمان عورت کا حسین ترین زیور اس کی پاکیزہ شرم و حیا ہے۔ ان نورانی صفات سے محروم خاتون دنیا میں وقار و احترام حاصل کر سکتی ہے نہ دین میں کوئی مقام۔ اپنے اسی مسلک کی وجہ سے اماں جی اپنے خاندان کی ان رشتے دار خواتین اور بچیوں پر بڑی سختی سے گرفت کرتیں جن کے لباس اور رنگ ڈھنگ میں انہیں تھوڑی سی بھی عریانی اور بے حیائی کا پہلو نظر آتا۔

بعض اوقات ان کے بیٹوں میں سے کوئی عرض کرتا: ''اماں جی، یہ فیشن اور تہذیب نو کا دور ہے، آپ کی یہ کڑی تنقید اور روک ٹوک شاید اصلاح کی کوئی صورت تو پیدا نہ کر سکے، لیکن خاندانی تعلقات میں بدمزگی پیدا کرنے کا موجب ضرور بن سکتی ہے۔''

اماں جی فرماتیں: ''یہ میری بچیاں ہیں۔ میرا گوشت پوست ہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میں اپنی آنکھوں سے انہیں جہنم کا ایندھن بنتا دیکھوں۔''

ان کا یہ طرز عمل خلوص اور للّٰہیت پر مبنی ہوتا، اس لئے وقتی طور پر جن کے متعلق یہ محسوس ہوتا تھا کہ اماں جی کے رویے کی وجہ سے شاید ان کے دل میں گرہ پڑ گئی ہے وہ تھوڑے ہی عرصے بعد ان سے پہلے کی طرح شیر و شکر ہو کر ملتیں، گویا کوئی بات نہیں ہوئی۔

شادی کے بعد اماں جی کے ہاں پے در پے چار بچیاں پیدا ہوئیں۔ ایسے حالات میں اکثر خواتین اپنی شخصیت توڑ پھوڑ بیٹھتی ہیں۔ ان کی وقعت خود اپنی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے، مگر اماں جی نے ان بچیوں کو خدا کی دین اور اس کی رحمت سمجھتے ہوئے ماتا بھرے سینے سے لگایا۔ ان کی پرورش اور تربیت پوری لگن اور ذمے داری سے کی۔ ان کی شادیاں کیں۔ اس طرح بچیوں کی پرورش میں اپنا فرض ادا کر کے بہشت بریں کی بشارت کی مستحق ہوئیں۔

اماں جی کا ایک بچہ اور دو بچیاں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ماموں نذیر احمد کی روایت کے مطابق اماں جی نے صدمے کے ہر ایسے موقع پر صبر و ضبط سے کام لے کر اپنے مولا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ آنسو ضرور بہائے مگر بے صبری اور جزع وفزع کا کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔

ہماری دو بڑی بہنیں جو شادی شدہ تھیں، ان کا انتقال ہمارے سامنے ہوا۔ ایک کا سرسہ میں 1945ء میں، دوسری کا 1947ء میں مشن اسپتال بھوانی ضلع حصار میں۔ غم واندوہ اور رنج ومحن کے ان ہر دو موقعوں پر اماں جی نے اپنی اعلیٰ صفات، تسلیم ورضا کا جو مظاہرہ کیا وہ واقعی انہی کا حصہ تھا۔ کمر کا پٹکا کس کر اپنی بچیوں کو خود اپنے ہاتھ سے غسل دیا اور نہلا دھلا کر بڑے صبر وسکون سے انہیں اللہ کے حوالے کیا۔

اماں جی کی اولاد میں سے آج ہم چار بھائی اور دو بہنیں بقید حیات ہیں۔ ان کی دعاؤں کی برکت سے سب خوشحال اور فارغ البال ہیں۔ ان سب پر اللہ کی عنایات ونوازشات کی کوئی کمی نہیں۔ ہر وقت خدا کی رحمت ان پر سایہ فگن ہے۔ اماں جی کا عظیم اور مثالی کردار جو ہمارے لئے مشعل راہ تھا، ہم اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ اپنی کوتاہیوں، لغزشوں اور غفلتوں کا ہمیں شدت سے احساس بھی ہے اور اس کا برملا اعتراف بھی، لیکن اماں جی کی دعاؤں اور ان کی حسن تربیت کی وجہ سے بھلائیوں کی جو تھوڑی سی رمق باقی ہے، وہ ہے اللہ کے دین سے لگاؤ، باہمی محبت ومودت اور غلط بات کے سامنے نہ جھکنے کا آہنی عزم۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ماں

- اگر تیری ماں تجھ سے ناراض ہے تو یقیناً تو جنت کی چابی گم کر چکا ہے میں تیرے سارے گناہ بخشتا ہوں صرف اپنی ماں کو راضی کر لے۔ (فرمانِ الٰہی)
- جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (حدیث نبوی ﷺ)
- دنیا کی تمام خوشیاں پیار سے ماں کہتے ہی مل جاتی ہیں۔ (امام رازیؒ)
- ہر شخص انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ''ماں'' کے چہرے پر دیکھ سکتا ہے۔ (اکبر اعظم)
- ماں کے بغیر گھر قبرستان لگتا ہے۔ (اورنگ زیب عالمگیر)
- محبت کی ترجمانی کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف ماں ہے۔ (شیخ سعدیؒ)
- ماں کی محبت انسان کی عادات واطوار، گفتار و خیالات اور کردار کو تراشتی ہے۔ (علامہ اقبال)
- دنیا کی سب سے بڑی ہستی ماں اور صرف ماں ہے۔ (مولانا محمد علی جوہر)
- ماں ہی اللہ تعالیٰ کی سب سے اچھی مخلوق ہے۔ (لیاقت علی خان)
- اگر مجھے میری ماں سے جدا کر دیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ (حکیم لقمان)
- مجھے اپنی ماں کا چہرہ دکھا دو میں بتاؤں گا تو کون ہے؟ (خلیل جبران)
- ماں کی دعائیں ہی میری کامیابی کا راز ہیں۔ (ہٹلر)
- بچے کیلئے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے بے شک بچے کی عمر کتنی ہی ہو۔ (شکسپیر)
- اس بات سے ڈرو کہ ماں نفرت یا فریا...

297.648
م 147 م

حق پبلی کیشنز
A-2 سید پلازہ، فسٹ فلور چیٹر جی روڈ اردو بازار لاہور
Ph: 042-7220631